پروین شاکر کی شاعری

تحقیقی مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی

مقالہ نگار

طاہرہ سیّد

نگران

پروفیسر قدوس جاوید



Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل سرینگر

۲۰۱۲ء

ترتیب

صفحہ نمبر

ابتدائیہ

خوبصورتی چاہے کسی بھی شکل وصورت رنگ و آہنگ میں ہو باعثِ کشش ہے۔خوبصورتی دل کوخوشگوار کیفیت کے احساس سے بھر دیتی ہے۔رومانس اور خوبصورتی کا شاعر کیٹس اپنی نظم Ode to the gracian Urn میں ذکر کرتا ہے کہ ایک گلدان پر پینٹ کی گئی تصویر نے اُسے مبہوت کر دیا مٹی کے ایک یونانی طرز کے گلدان پر مصور نے رنگوں اور برش سے ایسی تصویر پینٹ کی تھی کہ جس نے شاعر کی حسِ جمالیات کو بے حد متاثر کیا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھا:

"A thing of beauty is joy for ever"

جس طرح مصور اپنے لہو میں احساس کا برش ڈبو کر خالی کینوس کو سجا تا ہے اس طرح شاعر بھی جذبوں اور رنگوں کی طلسماتی دنیا کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے وہ بیک وقت موسیقار بھی ہوتا ہے اور مصور بھی۔اس وسیع وعریض کائنات کے بے شمار رنگوں اور سروں کو لفظوں کی مالا میں پرو کر اپنے تخیل کی قوت کے سہارے صفحہ قرطاس پر نقوش ابھارتا ہے۔رنگوں،سروں اور جذبوں کی تصویریں بناتا ہے۔جہاں تک پروین شاکر کی شاعری کا تعلق ہے وہ رنگوں اور سروں کی دنیا کا عرفان رکھتی ہیں ان کی شاعری دھنک رنگوں اور کومل سروں سے آراستہ ہے۔وہ اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر کر جذبات واحساسات کی ایسی منظر کشی کرتی ہیں کہ دل کھنچا چلا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بہت پہلے سے ہی پروین شاکر کی

خوبصورت شاعری نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی اور میں اس کا مطالعہ کرتی رہی۔اس طرح ان کی شخصیت اور فکر وفن کے بہت سے پہلوؤں سے میری شناسائی ہوتی رہی۔ جب پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کے لیے موضوع کے انتخاب کا مرحلہ سامنے آیا تو میں نے اپنی پسندیدگی کی بناء پر ''پروین شاکر کی شاعری'' کے موضوع کو منتخب کیا۔شعبہ اردو کے اساتذہ کرام نے اس موضوع کو پسند کیا اور اس پر کام کرنے کی اجازت دے دی۔اور خدا کے فضل و کرم سے دیگر تکنیکی مسائل جو اس کام کی راہ میں حائل تھے دور ہو گئے اور اس موضوع پر کام شروع ہوا۔

میں سب سے پہلے اپنے سپروائزر پروفیسر جناب قدوس جاوید صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے باوجود اپنی بے پناہ مصروفیات کے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ میرا یہ مقالہ تکمیل کے مراحل تک پہنچا۔شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے سربراہ پروفیسر جناب مجید مضمر صاحب کی بھی سراپا ممنون ہوں انھوں نے اس مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے ہر معاملے میں اپنا بھرپور تعاون فراہم کیا۔ پروفیسر نذیر ملک صاحب کی بھی بے حد شکرگزار ہوں انھوں نے ہر موقع پر میری رہنمائی فرمائی۔شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ کرام ڈاکٹر عارفہ بشریٰ صاحبہ، ڈاکٹر منصور احمد منصور صاحب کی بھی شکرگزار ہوں جن کے قیمتی مشورے ہمیشہ میرے شامل حال رہے۔

ان کے علاوہ ایک ایسی ہستی ہیں جن کا ذکر نہ کرنا بڑی زیادتی ہوگی وہ ہستی راولپنڈی میں مقیم میرے ایک کرم فرما جناب جاوید صاحب ہیں جن کی وساطت سے میری ملاقات پروین شاکر کی عزیز ترین سہیلی اور کولیگ پروین قادر آغا سے ہوئی ان کے علاوہ افتخار عارف صاحب اور ڈاکٹر

سلطانہ بخش اور دیگر لوگوں سے ملاقات ممکن ہوئی اور ان کے ذریعے ضروری معلومات اور مطلوبہ کتب کی فراہمی بھی ممکن ہو سکی ان کا احسان میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔

شکریے کی اس فہرست میں میری نظر جس ہستی کی طرف جاتی ہے وہ میرے شوہر سید شبیر حسین صاحب ہیں سچ تو یہ ہے کہ اس کام کی تکمیل کے سلسلے میں شروع سے لے کر آخر تک انھوں نے جس محنت شوق اور لگن کا مظاہرہ کیا اور مجھے کبھی بھی ہمت وحوصلہ ہارنے نہیں دیا اُسے لفظوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ان کی معاونت کے بغیر اس کام کا پایۂ تکمیل تک پہنچانا ناممکن تھا۔

ممکن ہے میرے اس مکالے میں کہیں تکرار کا احساس ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا مقالہ پروین شاکر کی دونوں شعری اصناف یعنی غزل اور نظم پر مشتمل ہے۔ پروین شاکر کے یہاں دونوں اصناف میں موضوعات کے اعتبار سے تکرار پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے الگ الگ مجموعے میں شامل ان کی شعری اصناف کا جائزہ لیا ہے۔ان میں بھی اکثر موضوعات کے حوالے سے تکرار کا احساس ہوتا ہے جس طرح کے سیاسی ومزاحمتی رویے کا اظہار ہے حسن وعشق مذہب یا نسائی طرزِ فکر کے حوالے سے موضوعات ہیں۔امید ہے کہ میرے ممتحن صاحبان میری غلطیوں سے صرفِ نظر کریں گے۔ تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی میں نے دستیاب مواد کو سامنے رکھ کر مقدور بھر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اور امید کرتی ہوں کہ میری یہ کوشش بار آور ثابت ہو گی۔

مقالہ نگار

طاہرہ سیّد

باب اول

شخصیت

اس باب میں پروین شاکر کی شخصیت کے ان تمام گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ابھی تک لوگوں کے سامنے نہیں آ سکے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے خاندان بچپن، شادی سے پہلے کی زندگی، شادی شدہ زندگی اور ملازمت وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لے کر ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اردو کی تاریخ ساز شاعرہ اور اردو ادب کی سب سے زیادہ پسند کی جانے والی آواز پروین شاکر جنھوں نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کروایا اور بلا امتیاز جنس وعمر ہر کسی کو اپنی شاعری کے ذریعے متوجہ کیا بروز پیر ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ان کی زندگی کے بیالیس سالہ سفر کا اختتام ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو اسلام آباد میں ایک سڑک حادثے میں ہوا۔

پروین شاکر متوسط طبقے کے ایک سادات خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ان کے ابا و اجداد کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ ان کے والد سید شاکر حسین کی پیدائش ۱۹۲۵ء میں بہار صوبہ کے ایک قصبہ حسین آباد ضلع مونگیر میں ہوئی۔ ان کے خاندان میں ادبی ذوق کئی نسلوں سے چلا آ رہا تھا اور ان کے خاندان میں کئی نامور شخصیتیں بھی گزری ہیں۔ شاکر حسین خود بھی شاعر تھے اور ثاقب تخلص کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہتے تھے اور اس سلسلے میں انھیں انعامات بھی ملتے رہتے تھے۔ پروین کے دادا سید ابوالحسن کا شمار بھی اپنے علاقے کے چند تعلیم یافتہ افراد میں ہوتا تھا۔ سید ابو الحسن کے دس بچے تھے۔ آٹھ لڑکے اور دو لڑکیاں۔ ۱۹۳۰ء کے آس پاس اُس علاقے میں کوئی ایسی وباء پھیلی جس میں بہت سے لوگ لقمۂ اجل ہوئے۔ سید ابوالحسن کے پانچ بیٹے بھی اس وباء کی نذر ہو گئے۔ باقی تین میں سے دو بیٹے مذہبی تعلیم کی طرف راغب ہوئے اور عالم بن گئے کہا جاتا ہے کہ

وہ قم کے مجتہد تھے۔ سید شاکر حسین سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد صاحب نے انھیں بھی اس کارِ خیر کے لیے نامزد کیا تھا۔ لیکن وہ آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے پٹنہ میں تعلیم حاصل کی۔ سید شاکر حسین نے بیس سال کی عمر میں سید مجاہد حسین کے ساتھ قیامِ پاکستان سے پہلے کراچی ہجرت کی۔ بقول پروین شاکرؔ:

''میرے والد جون ۱۹۴۷ء میں بہار سے کراچی ہجرت کر کے آ گئے۔ قبل از وقت آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ آزادیِ صبح آزاد سرزمین پر دیکھیں''۔[1]

ہجرت کے بعد دونوں کراچی میں چاکی واڑہ علاقے میں رہائش پذیر ہو گئے اور انھیں ٹیلی کمیونی کیشن کے محکمے میں ملازمت بھی مل گئی۔ اسی دوران ان کے چچا سید حسن عسکری بھی ان کے پاس کراچی چلے آئے۔ ملک کے بٹوارے کے دوران مہاجرین کو انسانیت سوز واقعات و سانحات سے دوچار ہونا پڑا۔ شاکر حسین کو خود بھی ہجرت کے دوران کافی مصائب و آلام جھیلنے پڑے۔ جو اُن کی حساس طبیعت پر کچھ ایسے نقش ہوئے کہ اُن کا دل شعر و شاعری سے بالکل اچاٹ ہو گیا اور وہ زیادہ تر مذہب کی طرف مائل ہوئے۔

پروین شاکرؔ کی والدہ افضل النساء عرف منن بیگم کا تعلق بھی بہار ہی سے تھا۔ وہ شاکر حسین کی کزن کی بیٹی تھیں اور سید کاظم حسین صاحب محلّہ افضل پورہ پٹنہ کی صاحبزادی تھی۔ وہ کافی دیندار خاتون تھیں۔ شاکر حسین صاحب کا خاندان حسین آباد میں ختم ہو چکا ہے۔ کچھ رشتہ دار چندن پٹی لہریا سرائے دربھنگہ میں مقیم ہیں۔ شاکر صاحب صرف ایک بار ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر ناظم جعفری کی شادی میں شرکت کے لیے اپنی پوری فیملی کے ساتھ بنارس تشریف لائے اس وقت پروین صرف دس سال

---

[1] مضمون ''خوشبو کی سفیر مصنف او۔ بی۔ سہیل بشمولہ خوشبو پھول تحریر کرتی ہے مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، ص:۱۹۱

کی تھیں۔ ’’دوسری مرتبہ پروین ۱۹۷۸ء میں دہلی میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں شرکت کی غرض سے ہندوستان آئیں وہ اپنے رشتے کے ماموں جابر حسین سے ملنے بہار گئیں جوان دنوں بہار کے وزیر صحت تھے‘‘[1]۔شادی کے بعد شاکر حسین عرف (رجن) رضویہ کالونی کراچی منتقل ہو گئے۔ شاکر صاحب کی صرف دو صاحبزادیاں تھی۔ پہلی نسرین شاکر جو ۱۶مارچ ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئیں۔ وہ بھی شعری ذوق رکھتی ہیں اگر چہ پیشے کے اعتبار سے ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں۔ اکثر علیل رہتی ہیں۔ بلڈ کینسر کی مریضہ ہیں۔ ان کی شادی شاکر حسین صاحب کے دوست کے بیٹے سے ہوئی تھی وہ لڑکا ذہنی طور پر مفلوج تھا جس کی وجہ سے شادی ناکام ہوگئی اور نسرین اپنے والدین کے گھر ہمیشہ کے لیے آ گئیں۔ نسرین بتاتی ہیں کہ ان کے والد صاحب انتہائی شریف النفس اور معصوم فطرت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگوں پر حد سے زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ نسرین کے مطابق ان کی بیماری کا سبب بھی ان کے ساتھ ہونے والا یہ واقعہ ہے۔

افضل النساء کافی کمزور تھیں ان کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ اس لیے دوسرے بچے کے لیے انھوں کے بہت سی دعائیں کیں روزے رکھے بہت منتوں مرادوں کے بعد ان کے یہاں دوسری بیٹی ہوئی۔ جو بہت خوبصورت تھی اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور بھرے بھرے ہونٹ تھے۔ کشادہ پیشانی اس کے بلند بخت ہونے کی نشاندہی کر رہی تھی اور یہ بات آگے چل کر صحیح ثابت ہوئی۔ وہ ایک دانشور بن کر دنیا کے سامنے آئیں۔ بچی کا نام پروین رکھا گیا ’’پروین‘‘ فارسی میں ستاروں کے ایک خوبصورت جھرمٹ کا نام ہے اپنے نام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

’’میری پیشانی کو دیکھ کے میرے ماں نے میرا نام ایک تارے کے نام پر رکھا

---

[1] ’’مضمون پروین شاکر کی ناوقت موت پر‘‘ مصنف رضوان احمد، ص:۴۱۹،بشمولہ خوشبو کی ہمسفر مصنفہ ڈاکٹر سلطانہ بخش

جگمگ کرنے والا تارا‘‘۔[1]

پروین کو پیار سے پارا یا پارو کہا جاتا تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے وہ بچپن میں بہت شوخ شریر اور کھلنڈری طبیعت کی مالک تھیں۔ انھوں نے بہت سلجھے ہوئے علمی و ادبی ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی۔ اس گھرانے سے وابستہ لوگ علمی ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ مذہبی رجحان بھی رکھتے تھے۔ اور انھیں شعر و شاعری سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ خاص طور پر پروین کے رشتے کے نانا سید حسن عسکری صاحب جو کہ پیشے کے اعتبار سے ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ اور انھیں شاعری سے بھی گہرا شغف تھا۔ دونوں بچیوں کو اپنے نانا سے گہرا اُنس تھا۔ ان کی صحبت ہی کے طفیل بچیوں کو کتابوں سے محبت اور شاعری سے دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ پُوت کے پاؤں پالنے ہی میں پہچانے جاتے ہیں کہ مصداق دونوں بہنیں بچپن سے ہی بہت ذہین اور شوخ واقع ہوئی تھیں۔ وہ اکثر ہم قافیہ گفتگو کرتیں۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں انھیں کئی اشعار زبانی یاد تھے۔ دونوں مطالعے کی بہت رسیا تھیں۔ ان کے اس شوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاکر صاحب مذہبی موضوعات پر مشتمل کتابیں ان کے لیے لاتے رہتے تھے۔ وہ بچوں کے رسالے پڑھتیں۔ ان کی والدہ اور خالہ جو ناول منگواتی تھیں وہ بھی دونوں چھپ چھپ کر پڑھ لیتی تھیں۔ اس طرح گھر کا ماحول گھر کی خاموش تربیت ان کے فکر و نظر پر اثر انداز ہوتی رہی۔ پروین کے بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ان کی والدہ ان کے عادات و اطوار کے بارے میں کہتی ہیں کہ وہ بہت شوخ و شریر اور ضدی طبیعت کی مالک تھی۔ اپنی ہر بات منوا کر دم لیتی تھی۔ آئیس کریم کھانے کی بہت شوقین تھی۔ کھانا کم ہی کھاتی تھی۔ مگر اچھے کھانے اسے پسند تھے۔ سیخ کباب، مچھلی پکوڑے چٹنی اس کے پسندیدہ کھانے تھے۔ اس کی طبیعت میں ایک عجیب بات یہ تھی

---

[1] مضمون ’گہر اشک قطرہ باراں‘ مصنفہ پروین قادر آغا بشمولہ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، ص: ۳۲۰

کہ اسے ہر وقت جوتے پہنے رہنا پسند نہیں تھا۔ باہر جاتی تو اکثر جوتے گم کر کے آ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ کسی تقریب سے لوٹی تو اس نے لڑکوں کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ گاڑی چلاتے ہوئے بھی وہ اکثر جوتے اتار دیتی تھے۔ جوتے نہ پہنے والی عادت بڑے ہونے تک برقرار رہی۔ دونوں بہنیں اکٹھے کھیلتیں کودتیں اور پڑھتی لکھتیں۔ دونوں شرارتیں بھی خوب کرتیں درختوں پر چڑھتیں امرود توڑتیں رسی پھاندتیں بارش میں کھیلتیں۔ پروین کو گڑیوں سے کھیلنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا وہ اکثر ایسے کھیل کھیلتیں جن میں ذہن سے کام لینا پڑتا۔

پروین شروع سے ہی زیادہ حساس اور نازک مزاج تھی۔ کوئی بات مزاج کے خلاف ہو جاتی تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا۔ وہ چیزوں کو سلیقے سے رکھنے کی عادی نہیں تھی۔ اس کی چیزیں بکھری رہتی تھیں۔ کمرے کی صفائی پہ بھی دونوں بہنوں میں جھگڑا ہو جاتا تھا۔ پہننے اوڑھنے کے معاملے میں بھی پروین بہت نفاست پسند تھی۔ سبز اور گلابی اس کے پسندیدہ رنگ تھے۔ انہی رنگوں کے فراک اُسے پہنائے جاتے۔ بچپن میں اس کے بال بہت لمبے تھے جو ربن سے دو چوٹیوں کی شکل میں گندھے ہوتے تھے۔

تین سال کی عمر میں پروین کو اپنی بڑی بہن نسرین کے ساتھ نزدیکی سکول بھیجا گیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق بچپن سے ہی اس کی ہر ادا سے ذہانت و فطانت کا اظہار ہوتا تھا۔ جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ تیسری کلاس سے اُسے دہری ترقی ملی اور وہ اپنی بہن کے ساتھ پانچویں کلاس میں آ گئی جن درسگاہ ہو سے وہ فیض یاب ہوئیں خود اس کا تذکرہ اس انداز سے کرتی ہیں۔

''۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کے دن اس عالم رنگ و بو میں پہلی سانس لی۔ ابھی گڑیاں کھیلنے،

پہل دوج اور کوڑا جمال شاہی کے لطف سے دل بھی نہ بھرا تھا کہ کاغذی زنجیر پیروں میں ڈال دی گئی۔ پہلے اسلامیہ کیمبرج سکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر ''رائز نگ سن اسکول'' سے اکتساب نور کیا۔ اس کے بعد رضویہ گرلز سکول کا دامن پکڑا جو میٹرک کے بعد ہی چھوٹا۔ پھر سر سید کالج نے اپنے دامن میں پناہ دی۔ جامعہ کراچی سے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور بحیثیت لیکچرار سر سید گرلز کالج سے وابستہ ہوں''۔[1]

پروین کی والدہ پابند صوم وصلوٰۃ تھیں۔ مجالسِ عزا میں شرکت کرتی رہتی تھیں۔ پروین کو بھی مجالس میں شرکت کرنا بہت پسند تھا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ مجالس میں جاتی رہتی تھیں۔ اس دور کی مشہور ذاکرہ بطول ترابی تھیں۔ پروین مجالس میں ان کا بغور مشاہدہ کرتیں اور گھر جا کر چھوٹے بچوں کو جمع کر کے بطول کے انداز کی مشق کرتیں۔ شیعہ خاندان کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ آنکھ کھولتے ہی بچے کی شناسائی انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں کے ذریعے ردھم لے جذبے احساس سوز اور دکھ سے ہو جاتی ہے۔ اس طرح اوئیل عمری ہی سے انیسؔ و دبیرؔ کا کلام سن سن کر پروین نے لفظوں کی خوشبو کو سونگھا، لفظوں کے ذائقے کو محسوس کیا۔ اُن پر جملے کا جمال اور حرف کی حرمت کے در وا ہوتے چلے گے۔ انہی مجالس کے ماحول سے انھیں لفظوں کی طلسمی قوت کا اندازہ بھی ہوا اور انھوں نے لفظوں سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ مرثیے اور سوز خوانی کے ماحول نے ان کے تخلیقی ذہن کو نُمو دی۔ ان کی شخصیت کو ان کے خاندانی پس منظر کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چونکہ وہ اعلیٰ سید خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے ان میں فطری طور پر وہ تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں جو والدین کی آغوشِ تربیت میں وراثتاً انھیں ملی تھیں اور پھر ان کو جو سازگار ماحول فراہم ہوا وہ ان کی صلاحیتوں کو

---

[1] مضمون 'پروین شاکر' مصنفہ ڈاکٹر سلطانہ مہر بشمولہ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، ص:۱۶۱

جلا بخشنے میں مددگار ثابت ہوا۔حسن عسکری صاحب جیسی باذوق شخصیت کا سایہ ان کے شب وروز پر پڑتا رہا۔حسن عسکری صاحب کی تجربہ کار نگاہ نے پروین میں موجود شعری صلاحیت کو بھانپ لیا تھا اور اس سلسلے میں انھیں ابتدائی سبق دینا شروع کیا اور آگے بھی وہ اپنے نانا سے اصلاح لیتی رہیں۔ان کے گھر کا ماحول علم وادب کے رنگوں سے آراستہ تھا جو ان کی علمی استعداد میں اضافے کا باعث بنا ان کے خاندان میں بیت بازی کی محفلیں جمتی رہتی تھیں اس سے ان کا شعری ذوق پروان چڑھا اور زبان درست ہوئی۔ پروین کی والدہ دل کی مریضہ تھیں۔نسرین اپنے والدین کی بہت خدمت کرتی تھیں جبکہ پروین ذہانت وقابلیت کے بل بوتے پر اپنے اہل خانہ کے لیے باعثِ فخر تھیں۔انھیں اکثر انعامات اور ٹرافیاں ملتی رہتی تھیں۔

شکل وصورت اور عادات واطوار کے اعتبار سے پروین اپنے والد سے کافی مشابہہ تھیں۔ سادگی،معصومیت اور وضعداری وبے نیازی جیسی عادات وصفات ان کے والدصاحب کی دین تھیں۔

ابتدائی شاعری

معلوم ہوتا ہے کہ پروین بچپن ہی سے غیرمعمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں اور دوسرے بچوں سے بالکل الگ تھلگ دکھائی دیتی تھیں۔کلاس میں ہمیشہ اول آتی تھیں۔ ہمیشہ سے ان کا تعلیمی ریکارڈ کافی شاندار رہا ہے۔نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی وہ ہمیشہ آگے رہیں۔ابھی وہ آٹھویں جماعت میں ہی تھیں کہ ان کا ایک مضمون ان کی ٹیچر نے بہت پسند کیا۔ان کی حوصلہ افزائی کی اور ساتھ ہی یہ پیشین گوئی بھی کی کہ یہ مضمون لکھنے والی بچی ضرور مستقبل کی ادیبہ ہوگی۔

پروین کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں ان کے قابل اساتذہ کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ان میں مسز زاہدہ تقی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جو کہ رضویہ گرلز سیکنڈری سکول کی پرنسپل تھیں وہ ایک

باصلاحیت خاتون تھیں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتی تھیں۔ کالج میں پروین نے آرٹس کے مضامین منتخب کیے۔ کیونکہ ان کا رجحان سائنسی مضامین کی طرف نہیں تھا انھیں سائنسی مضامین کافی خشک معلوم ہوتے تھے۔اس لیے انھوں نے انگریزی ادب کا مضمون اختیار کیا۔لیکن وہ مضامین وغیرہ اردو میں لکھتی رہیں۔ان کی شاعری کی ابتداء نظم سے ہوئی جو سال اول میں انھوں نے کالج میگزین میں اشاعت کے لیے دی اس نظم کا عنوان ''مون سون کی برسات'' تھا۔اس کا پہلا مصرعہ یہ تھا۔

؎ دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے[1]

اس نظم کو بے حد پسند کیا گیا۔ نانا نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں عروض کی تعلیم دینا شروع کی اور آگے بھی مشقِ سخن جاری رکھنے کی تلقین کی۔ کالج کے دور میں مسز عرفانہ عزیز نے پروین کے تخلیقی جوہر کو پہچان لیا۔ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں وہ انھیں بالکل اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔عرفانہ اکنامکس پڑھاتی تھیں اور پروین کا یہ مضمون نہیں تھا۔لیکن عرفانہ صاحبہ اردو میں شاعری کرتی تھیں ان کا کلام ادبی رسالوں کی زینت بنتا رہتا تھا۔ پروین کو ایک شاعرہ کی حیثیت سے دریافت کرنے میں عرفانہ عزیز کا بہت ہاتھ ہے۔مسز عرفانہ عزیز نے پروین کو اپنے ذہن اپنی روح اور اپنی ذات کا ایکسٹینشن کہہ کر اپنی طالبہ کی صلاحیتوں کو سراہا اور خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔اس بارے میں پروین خود یوں رقمطراز ہیں۔

> ''زانوئے تلمذ میں نے مشہور شاعرہ عرفانہ عزیز کے سامنے تہہ کیا جن سے مجھے ہمیشہ عقیدت ہے اور رہے گی۔ جو کچھ میں آج ہوں وہ انہی کی خوصلہ افزائی اور

---

[1] مضمون گُہر اشِک قطرہ باراں، مصنفہ پروین قادر آغا بشمولہ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش،ص:۳۲۷

اصلاح کا نتیجہ ہے۔ وہ میری ذہنی اور روحانی استاد ہیں۔ محترمہ عرفانہ عزیز کے علاوہ جس شخصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ محترمہ زاہدہ تقی ہیں۔ جن کے سکول میں میں نے سات سال تک پڑھا۔ انہی کی حوصلہ افزائی سے میں نے میٹرک اور انٹر کے امتحانات میں کامیابی پر اسکالرشپ حاصل کیا۔ ان کی طبیعت کا ستھرا پن مذاق کی شائستگی اور مزاج کی سادگی نے میرے دل پر گہرے نقوش مرتسم کیے''۔[1]

اور بقول عرفانہ عزیز:

''پروین میری ذہین شاگرد تھی عقل و دانش کا پیکر ذہانت و فطانت میں یکتا، آداب و شائستگی کی تصویر وہ بے پناہ صلاحیتیں رکھتی تھی۔ اس کا مطالعہ ہمیشہ وسیع رہا''۔[2]

محترمہ عرفانہ عزیز نے پروین میں موجود شعری صلاحیت کو ابھارا (یاد رہے کہ اس وقت تک پروین نثر میں ہی لکھتی تھیں) اور چھ ستمبر یومِ دفاع پاکستان کے لیے ایک نظم لکھنے کے لیے اصرار کیا۔ پروین نے عرفانہ صاحبہ کی راہنمائی میں نظم لکھی۔ جس کا عنوان تھا ''صبحِ وطن''، نظم کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

؎ دفعتاً نور ہوا، آگے بڑھا اِک جبریل
دل میں روشن کیے آزادی کی نوریں انجیل
عزم کی آگ تھی، ایمان کی حرارت دل میں
ظلمتیں پگھلیں، تر شنے لگی اِک صبحِ جمیل[3] صبحِ وطن

پروین کی دوسری شعری کاوش بھی نظم ہی کی صورت میں تھی۔ اب انھیں خود بھی احساس ہوا کہ نثر کے

---

1. مضمون 'پروین شاکر' مصنفہ ڈاکٹر سلطانہ مہر بشمولہ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، ص: ۱۶۱ تا ۱۶۲
2. مضمون ''کہانی میری'' مصنفہ پروین شاکر بشمولہ خوشبو کی ہمسفر، ص: ۳۰۵

ساتھ ساتھ وہ شعری رجحان بھی رکھتی ہیں۔ اس کے بعد ان کا شعری قلم رواں ہوتا گیا۔ پہلے وہ ''بینا'' کے قلمی نام سے لکھتی رہیں۔ شروع میں ہلکے پھلکے موضوعات شاعری کے لیے چنے مثلاً پرندے، پھول اور تتلیاں وغیرہ بعدازآں ان کی شاعری میں گہرائی آتی گئی۔

ابتدائی ادبی سرگرمیاں

شاعری کے آغاز ہی میں گلِ رعنا کلب کراچی کے طلباء کے مشاعرے میں ان کی ایک نظم کو پہلے انعام سے نوازا گیا۔ اس تقریب کی مہمانِ خصوصی پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم کی بیوہ رعنا لیاقت علی خان تھیں۔

کالج کی ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ آگے رہیں۔ اپنے شوق ولگن کی وجہ سے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ کالج میں ''بزمِ ادب'' کی جوائنٹ سیکریٹری کے فرائض سرانجام دیے۔ اس کے علاوہ اخبار جامعہ کے ادارتی بورڈ سے بھی منسلک رہیں۔

مجلّہ ''سحر'' کی مدیرہ معاون کے فرائض بھی سرانجام دیے۔ کالج کی بہترین شاعرہ کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ روزنامہ ''جنگ'' میں طلباء کے تعلیمی صفحے لیے ''فریاد کچھ تو ہو'' کے عنوان ۱۹۶۸ء سے کالم لکھتی رہیں۔ اپنی قابلیت و ذہانت کی وجہ سے کالج میں دورانِ تعلیم کئی توصیفی اسناد اور سونے کے تمغے حاصل کئے۔ کالج میں اُن کا شمار ذہین ترین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی لکھائی کا ہر کام بآسانی نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتیں۔ ساتھ ہی وہ اپنے آس پاس کے نہ صرف حالات و واقعات سے باخبر رہتیں بلکہ ملکی وغیر ملکی خبروں سے بھی ان کی دلچسپی زمانہ طالب علمی سے پیدا ہو چکی تھی۔

پروین کی یہ خوش نصیبی تھی کہ بطور شاعرہ کے ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں جن ہستیوں نے

اہم کردار ادا کیا وہ قابل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بے لوث اور مخلص تھیں۔ انھوں نے اپنے خون جگر سے اُسے سینچا ان کی راہ نمائی میں وہ شعروادب کی شاہراہ پر رواں دواں ہوتی گئیں۔

محترمہ عرفانہ عزیؔز کے بعد دوسرا نام احمد ندیؔم قاسمی کا ہے۔ یہی وہ ہستی ہیں جن کے ذریعے وہ شعری دنیا میں متعارف ہوئیں۔ ان کی انگلی پکڑ کر پروین نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ احمد ندیم قاسمی (جو کہ فنون کے ایڈیٹر تھے) کو جب پروین کی غزلیں بھیجی گئیں تو انھوں نے اِن غزلوں کو بہت سراہا اور اپنے جریدے ''فنون'' میں پروین کا کلام شائع کیا۔ اور پھر مسلسل ان کا کلام ''فنون'' میں چھپتا رہا۔ احمد ندیم قاسی ان کی ابتدائی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں۔

> ''میں نے یہ غزلیں اور نظمیں پڑھیں تو اِکا دُکا مبتدیانہ خامیوں سے قطع نظر وہ عشقیہ شاعری کی کامیاب مثالیں تھیں۔ پروین کی ان غزلوں میں معصوم اور بھر پور محبت کے عجیب مسحور کن تیور تھے۔ یہ کلام ''فنون'' کے ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شامل ہوا۔ مجھے شعروادب میں جوہر قابل کی ہمیشہ جستجو رہی ہے کہ نئی نسلوں کا یہی جوہر ہمارا مستقبل ہے۔ میں نے واضح طور پر یہ لکھا کہ یہ محض ایک مبتدی کی حوصلہ افزائی نہیں ہے بلکہ یہ غزلیں ہیں ہی بہت پیاری اور معیاری''۔[۱]

اسی دوران دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا اور ان کے بیچ عمو اور بیٹی کا محبت وعقیدت بھرا رشتہ استوار ہو گیا جو آخر تک قائم رہا۔ پروینؔ انھیں اپنا پیرومرشد اور روحانی باپ کا درجہ دیتی تھیں۔ قاسمی صاحب بھی انھیں ناہید اور منعورہ کی طرح تیسری بیٹی مانتے تھے۔ اور انھیں مفید مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ پروین نے جو خطوط احمد ندیم قاسی کے نام لکھے ہیں انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے

۱؎ مضمون ''میری پروین'' مصنف احمد ندیم قاسی بشمولہ خوشبو کی ہمسفر، ص: ۱۷ مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش

کہ عمو اور بیٹی ہر بات بلا جھجک ایک دوسرے کو بتا دیتے تھے ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹتے تھے۔ پروینؔ قاسمی صاحب کو بحیثیت شاعر کے بھی پسند کرتی تھیں۔ اپنی پہلی کتاب ''خوشبو'' کا انتساب پروین نے احمد ندیمؔ قاسمی کے نام کیا ہے۔ ''خوشبو'' میں شامل ایک نظم بھی قاسمی صاحب کی نذر کی ہے۔

وہ بہت اعتماد کے ساتھ تعلیمی وفنی مدراج طے کرتی رہیں۔ بی۔اے تک پہنچتے ہوئے وہ ادبی دنیا میں اپنی شناخت بنا چکی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات وافکار میں پختگی آتی گئی۔ جو کہ ان کے مطالعے اور مشاہدے کی دین تھی۔ انھوں نے کالج سے باہر کی ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کیا۔ وہ عقل ودانش اور فہم وفراست کا مجسمہ تھیں۔ اس لیے شاعری کے علاوہ بھی وہ ہر ادبی میدان کی شہسوار تھی۔ انھیں ریڈیو کے پروگراموں سے کافی دلچسپی تھی۔ وہ اکثر ریڈیو کے نغموں کے ساتھ گنگناتی رہتی تھیں۔ ان کے والد صاحب کافی سخت گیر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید سوچ کے حامل تھے۔ انھوں نے ان کے شوق کی راہ میں کسی رکاوٹ کو حائل نہیں ہونے دیا۔ دونوں لڑکیوں کو ستار اور موسیقی کی تعلیم گھر پر ہی فراہم کی۔ صلاحیت کے ساتھ ساتھ جذبہ اور لگن ہو تو مراحلِ شوق طے ہو ہی جاتے ہیں۔ اس موقعہ پر بھی ان کے لیے فضا سازگار رہی۔ وہ اپنی شفیق استانی محترمہ عرفانہ عزیز کے ذریعے بچوں کے پروگرام کے پرڈیوسر یاور مہدی سے متعارف ہوئیں۔ اس سے پہلے وہ ''روزنامہ جنگ'' میں یاور صاحب کے پروگراموں پر تنقید وتبصرہ کیا کرتی تھیں۔ ریڈیو پر یاور مہدی کے ساتھ انھوں نے ڈھائی سو سے زیادہ پروگرام کیے۔ یہاں انھیں مزید اپنی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا موقعہ ملا۔ یاور صاحب کو بھی پروین کی قابلیت پر پورا بھروسہ تھا۔ کہ پروگرام چاہے کوئی بھی ہو پروین ضرور اسے Conduct کرلیں گی۔ پروین کو بھی ان پر ناز تھا۔ وہ ان سے کافی بے تکلف تھیں اور ہمیشہ یاور بھائی کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ یاور صاحب اکثر وبیشتر سرپرائز پروگرام پروین کو

سونپ دیتے تھے۔ اس طرح کے پروگرام کرنے میں پروین کو کافی لطف آتا تھا۔ کیونکہ اس طرح انھیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملتا تھا۔ ''مجنون صاحب بحیثیت ایک استاذ'' کے مضمون پڑھنا ہوتا تو پروین کا انتخاب کیا جاتا اور پروین کا کمال یہ کہ ایف۔اے کی طالبہ اور مجنوں صاحب کی شاگرد رہے بغیر ایسا شاندار مضمون تیار کر لیتی ہیں کہ جسے سن کر مجنوں صاحب خود بھی دم بخود رہ جاتے ہیں۔ کسی خاص اصطلاح پر نظم لکھی ہوتی تو نظرِ انتخاب پروین پر ہی ٹھہرتی۔ وہ ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو میں بیٹھ کر آدھے گھنٹے میں نظم تیار کر لیتیں جو لائیو نشر ہوتی۔ اس طرح کی ایک ہنگامی نظم کا ذکر بھی کافی دلچسپ ہے۔ یاور صاحب نے پروین کو پیغام بجھوایا کہ فوراً ہی تھرڈ ڈویژنرز کے داخلے کے لیے ایک نظم لکھ کر بھیج دو۔ جس کا قوالی کی طرز پر گانا مقصود ہے۔ پروین شاکر نے مزاحیہ قوالی مسدس حالی کی طرز میں لکھی۔ اس میں ٹیپ کا مصرعہ تھا

؎ امت پر تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

قوالی تو ریڈیو پر نشر ہو گئی مگر اس کے بعد کئی مولانا حضرات نے فون کر کے ریڈیو والوں کا ناطقہ بند کر دیا اور مطالبہ کیا کہ یہ قوالی ان کے حوالے کی جائے۔ لیکن یاور صاحب نے ایسا نہیں ہونے دیا وہ ہمیشہ پروین کے سامنے ڈھال کی طرح رہے۔

ریڈیو نے پروین کی قابلیت کے اعتراف میں انھیں کئی اعزازات سے نوازا۔ طلبہ کے ''جشنِ تمثیل'' میں ان کے لکھے ہوئے ڈرامے ''آئینہ ساز'' کو سال کا بہترین ڈرامہ قرار دیا گیا۔ ''جشنِ طلبہ'' کے مشاعرے میں پہلا انعام ملا۔ اس کے علاوہ لا تعداد فی البدیہہ، مشاعرے، مذاکرے، ادبی نشستیں، اناؤنسمنٹ کمپیرنگ وغیرہ میں بھی کئی انعامات حاصل کئے۔ ریڈیو کی وساطت سے انھیں ملک کی کئی ادبی شخصیتوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ جن میں مجنوں گورکھپوری، سلیم

احمد، منیر نیازی، شوکت صدیقی، جمیل الدین عالی، غلام عباس اور ابن انشاء شامل ہیں۔ ابن انشاء کے ساتھ ایک نشست میں پروین کو ان کی شاعری پر تبصرہ کرنے کا موقع ملا۔ ریڈیو پر نئی نسل کے لیے ایک پروگرام ''ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند'' کیا کرتی تھیں۔ یہ ملک کی نامور شخصیتوں کے انٹرویو پر مبنی ہوتا تھا۔ اس پروگرام میں مختلف طبقہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہوتے تھے۔ اس پروگرام کے دوران کافی دلچسپ واقعات پیش آئے ایک دفعہ وہ کسی کھلاڑی کا انٹرویو لے رہی تھیں تو معلوم ہوا کہ موصوف غالب کے شیدائی ہیں تو پروین نے ان سے غالب کا شعر سنانے کی فرمائش کی۔ تو انھوں نے یہ شعر سنایا جسے پروین ہمیشہ مسکراہٹ کے ساتھ یاد کیا کرتیں۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
حیراں ہوں دِل کو روؤں کے پیٹوں جگر کو میں [۱]

''سخن ور'' کے عنوان کے تحت اردو کی مشہور شخصیات کے انٹرویو بھی کیے۔ پروین کی دانشورانہ فکر کا سب کو قائل ہونا پڑا۔ اسی پروگرام میں آخری انٹرویو خود پروین سے تھا۔ اپنے انٹرویو کے لیے انھوں نے حمایت علی شاعر کو منتخب کیا۔ غرض یہ کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے پروگراموں سے ایک طرف تو ان کے شوق کی تکمیل بھی ہوئی اور دوسری طرف ان کی صلاحیتوں کو مزید نکھرنے اور پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ اس سلسلے میں اپنے ایک مضمون میں خود اس بات کا اعتراف کرتی ہیں۔

''میری نمو میں آواز کی دنیا کا بڑا ہاتھ ہے اپنی شادابیوں کے لیے میں اس فضا کی مشکور ہوں اس ہوا سے ربط نے ہی میری سوچ کو اجنبی پروازوں کا ذائقہ دیا۔ مجھے ترتیب دیا۔ اسی پس منظر میں میری ایک غزل یوں شروع ہوتی ہے۔

---

[۱] مضمون 'کہانی میری' مصنفہ پروین شاکر بشمولہ خوشبو کی ہمسفر، ص: ۳۰۸

سما کے ابر میں، برسات کی امنگ میں ہوں

ہوا میں جذب ہوں، خوشبو کے انگ انگ میں ہوں

فضا میں تیر رہی ہوں، صدا کے رنگ میں ہوں

لہو سے پوچھ رہی ہوں، یہ کس ترنگ میں ہوں[1]

وہ کئی برس تک ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے وابستہ رہیں عوامی حلقوں میں ان کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ وہ مقبول ترین شخصیت کی حیثیت سے پہچانی جانے لگیں۔

حسب نسب، شکل وصورت، ذہانت و قابلیت غرض ہر لحاظ سے وہ اپنی عمر کے دیگر ساتھیوں سے منفرد تھیں۔ ان کا اندازِ فکر و نظر بھی جداگانہ تھا۔ انھیں اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ خدا نے انھیں بھرپور صلاحتیں ودیعت کی ہوئی ہیں۔ اس لیے ہر معاملے میں خود اعتمادی کا جوہر ان کے ساتھ تھا۔ فطرتاً وہ خاموش طبع تھیں۔ کلاس میں بھی ہمیشہ خاموش بیٹھتیں، غیر ضروری سوالات کر کے نہ تو اپنے علم کی نمائش کرتیں نہ ہی کسی کو مرعوب کرتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی سحر انگیز شخصیت سے لوگ خود بخود متاثر ہو جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ عطر آنست کہ ببوید نہ کہ عطار گوید پر یقین رکھتی تھیں۔ بردباری، وقار ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

رضویہ گرلز سکول سے ۱۹۶۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سرسید گرلز کالج سے ۱۹۶۸ء میں ایف اے کیا اور ۱۹۶۹ء میں کراچی یونیورسٹی میں بی۔ اے آنرز انگریزی میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۱ء میں بی۔ اے آنرز کا امتحان پاس کیا۔ ایف، اے اور بی۔ اے کے دوران انھوں نے کراچی بورڈ اور کراچی یونیورسٹی میں قابلیت کا وظیفہ بھی حاصل کیا۔ ۱۹۷۲ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کیا اور جامعہ

---

[1] مضمون ''کہانی میری''، مصنفہ پروین شاکر بشمولہ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، ص: ۳۰۹

کراچی سے ۱۹۸۱ء میں ایم۔اے لسانیات کیا۔کراچی یونیورسٹی کا وہ دور زندگی کی ہنگامہ خیزیوں سے بھرپور بہت ہی پررونق دور تھا۔اس وقت وہاں بڑے ذہین اور ہونہار طلباء تحصیلِ علم کررہے تھے۔ جنھوں نے آگے چل کر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نام پیدا کیا۔ان میں کئی ایسے بھی ہیں جو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے شعبے میں کامیاب رہے اور بہترین آرٹسٹ ثابت ہوئے۔جن میں مہتاب چنا، خوش بخت عالیہ،تاجدار عادل،شہر یار اور شاہدہ حسن جیسی شخصیتیں شامل تھیں۔یونیورسٹی کے دور میں بھی پروین کی تمام تر توجہ مطالعے کی طرف مرکوز رہی۔وہ بہت تندہی اور انہماک کے ساتھ اپنا زیادہ تر وقت یونیورسٹی کی لائبریری میں مطالعے میں صرف کرتیں۔انھوں نے کتابوں کے ساتھ ایک الگ دنیا بسالی تھی۔نصابی کتب کے علاوہ دیگر کتابیں بھی ان کے پیشِ نظر رہتیں۔وہ مطالعے کی خوگر اور رسیا تھیں۔عام خواتین کی دلچسپی کی باتوں یا مشاغل سے بے نیاز تھیں۔وہ تعلیم کو عبادت سمجھتی تھی۔زندگی کی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر کتابوں کی دنیا میں بسے رہنا بھی بذات خود ایک عبادت ہے۔

ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھ کر پروین کی شخصیت کا یہ پہلو عیاں ہوتا ہے کہ وہ منفرد تھیں۔ان کا راستہ جداگانہ تھا۔ان کی منزل بہت بلند تھی۔جبھی تو وہ علم کے سمندر کی غواصی کر کے دامنِ دِل کو نور سے بھرنا چاہتی تھیں۔

پروین کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بے نیازی ان کی فطرت کا خاصہ تھی۔انھیں لوگوں سے زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں تھا۔ وہ لوگوں سے ہمیشہ ایک فاصلے پر رہتی تھیں۔تاہم سکول کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں ان کی دوست کئی لڑکیاں رہ چکی ہیں۔یونیورسٹی میں دُرشہوار ان کی دوست تھیں۔دونوں ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی تھیں۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاعروں میں بھی دونوں اکٹھے جاتیں۔دونوں طالب علمی کے دور کی شرارتوں سے لطف اندوز ہوتیں۔دُرشہوار میں بھی

آگے بڑھنے کی جستجو تھی۔انسان غیرمحسوس طریقے سے دوستوں کے اثرات قبول کرتا رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دُرشہوار نے بھی شادی کے بعدسی ایس ایس کا امتحان پاس کیا اور پاکستان ریلویز میں اچھے عہدے پرفائز ہوئیں۔

۱۹۷۲ء میں پروین کا خاندان اپنے گھر حیدری بلاک نارتھ ناظم آباد کراچی منتقل ہوگیا۔جبکہ ماجد حسین فیملی رضویہ میں ہی مقیم رہی اوراگلے سال پروین کے شفیق نانا حسن عسکری صاحب انتقال کرگئے۔۱۹۷۳ء میں پروین نے عبداللہ کالج برائے خواتین میں انگریزی کی لیکچرار کی حیثیت سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔وہ نوسال تک اسی پیشے سے وابستہ رہیں۔پڑھنا پڑھانا انھیں پسند تھا۔درس وتدریس کو پیغمبرانہ پیشے سے منسوب سمجھتی تھیں۔دورانِ ملازمت وہ اپنے ادبی ذوق سے غافل نہ تھیں بلکہ ان کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ان کی یہ خوص نصیبی تھی کہ انھیں بیس برس کی عمر ہی میں ادبی دنیامیں شہرت حاصل ہوگئی۔عزت وشہرت جسے حاصل کرنے کے لیےلوگوں کوزندگی بھر جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔پروین کی فطری صلاحیتوں کی بدولت خودان کی جھولی میں آن گری۔وہ ریڈیواور ٹیلی ویژن کے مشاعروں میں شرکت کرتیں۔یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر تخلیق میں قوت ہوتو وہ اپنے پرستارخود پیدا کرلیتی ہے اور یہ بات پروین شاکر پر صادق آتی ہے۔عوام وخواص میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتیں۔حسن وصورت وسیرت کے ساتھ خوش آواز اورخوش کلام بھی تھیں۔ان کا کلام سامعین کواپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا۔شاعری اخباروں کی زینت بنتی رہی۔ان کی شخصیت کاحسن ان کی نثری تحریروں سے بھی عیاں ہوتا ہے۔روزنامہ جنگ میں کالم بھی لکھتی رہیں۔ روزناموں میں ان کے مضامین ''شہر سے بارہ میل پرے'' کے عنوان سے چھپتے رہے۔لوگ ان کی تحریروں کے شائق تھے۔احمد ندیم قاسمی کے جریدے 'فنون' میں تو مستقل پروین کی شاعری چھپتی

رہی۔عزت وشہرت کی دیوی ان پر مہربان تھی۔ دوسری طرف ایسے لوگوں کے یعنی مشہور شخصیات کے دشمن بھی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو ان کے اعلیٰ مرتبے سے حسد و جلن محسوس کرتے ہیں۔ یہ معاملہ پروین کے ساتھ بھی تھا۔ جہاں لوگ ان کی شاعری کے دلدادہ تھے تو دوسری طرف کچھ لوگ جلن اور حسد کا بھی شکار تھے۔ان کے خلاف بے بنیاد الزامات اور اسکینڈل بنا کر انھیں ذہنی اذیت میں مبتلا کرتے رہے۔ جس وجہ سے وہ کافی دنوں تک ذہنی طور بے چین رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی من کے آنگن سے بھی کسی رانجھے کا گزر ہوا تھا جس نے اُسے بہت چاہا لیکن زمانہ تو ٹھہرا ہی دو چاہنے والوں کا دشمن۔ بہت سی رکاوٹیں حائل ہوئیں خاص طور پر اس کا خاندانی پس منظر اور پھر شاکر صاحب نے اس بات کو سخت ناپسند کیا۔ ظاہر ہے کہ پروین تو فرمانبرداری اور شرافت کا پیکر تھی۔ وہ خاندانی روایات کی پاسدار تھیں پھر وہ کیسے خاندانی رسم ورواج کو توڑ کر دل کی دنیا آباد کرلیتیں۔ پروین جیسی ہمہ صفت لڑکی کے لیے موزوں رشتے کی تلاش بھی ایک دقت طلب کام تھا۔ پروین کے رشتے کی خالہ نے اپنے بیٹے سید نصیر علی کے لیے بچپن سے ہی پروین کو مانگ لیا تھا۔اب نصیر نے والدین پر دباؤ ڈالا کہ یہ رشتہ جلد از جلد پکا کر دیا جائے۔نصیر نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی تھی۔اور وہ پاکستان آرمی کی میڈیکل کور سے وابستہ تھے۔سو نظرِ انتخاب ڈاکٹر نصیر علی پر ہی ٹھہری جو بظاہر تمام خوبیوں سے مزین تھے۔ چنانچہ دونوں کی رضامندی سے ۱۹۷۵ء میں یہ رشتہ طے ہوا۔اور ۱۹۷۶ء میں شادی انجام پائی۔ ملک کی سرکردہ ادبی شخصیات شادی میں شریک ہوئیں۔ جن میں فہمیدہؔ ریاض، اطہر نفیس، اختر حسین جعفری، فاطمہؔ حسن شامل تھیں۔ شادی کی تقریب سادگی سے سرانجام پائی کیونکہ حکومت کی طرف سے ان دنوں زیادہ نمود ونمائش اور کھانے کی دعوت پر پابندی عائد تھی۔

شادی کے بعد ہرلڑکی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ انجان ماحول اور مختلف مزاج رکھنے والے لوگوں کے بیچ ایک لڑکی کے لیے آزمائشوں سے پُر یہ کٹھن اور صبر آزما دور ہوتا ہے۔ خاص طور پر ہمارے برصغیر پاک و ہند کے معاشرے میں جہاں میاں بیوی اپنی زندگی خود جینے کا حق نہیں رکھتے بلکہ ان کی زندگی دوسرے لوگ جیتے ہیں۔ اور اکثر و بیشتر گھرانوں میں شادی ہوتے ہی بہو سے ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ اس کے نازک کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔ وہ سندر سپنے سجانے والی نازک سی کلی اپنے مجازی خدا اور اس سے وابستہ باقی اہل خانہ کی خوشنودی کے لیے اپنے آپ کو تج دیتی ہے۔ ایسے میں اُسے اپنے تن من کی کوئی سدھ نہیں رہتی۔ اس کی اپنی تمنائیں آرزوئیں اور ارمان کس طرح سسک کر دم توڑ رہے ہوتے ہیں اس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ سے لاتعلق ہو کر بکھر سی جاتی ہے۔ اگر کوئی اس لگے بندھے نظام کی پیروی نہ کرے تو اسے اس معاشرے میں معتوب ٹھہرایا جاتا ہے۔ جہاں تک پروین کے سسرال کا تعلق ہے وہ بھی قدامت پرست اور روائتی قسم کا تھا۔ یہ ایک بھرا پرا ہوا خاندان تھا جہاں ساس سسر کے علاوہ دو نندیں اور نصیر کے شادی شدہ بھائی بھی شامل تھے۔ پروین نے ایک مشرقی لڑکی کی طرح اپنے آپ کو اس نئے ماحول میں ڈھالنے کے بہت جتن کیے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ گھریلو کام کاج بھی کیے۔ حالانکہ گھریلوں کام انھوں نے پہلے بہت کم کیے تھے۔ انھیں کھانا پکانا بھی نہیں آتا تھا۔ کیونکہ ان کی دنیا تو کتابوں سے لگاؤ اور ادبی وشعری محفلوں تک تھی۔ تاہم وہ اپنی بہن نسرین کو فون کر کے کھانا پکانے کی تراکیب پوچھتی رہتی تھیں۔ ان کی دیگر علمی و ادبی مصروفیات بھی تھیں۔ مختلف مشاعروں میں انھیں مدعو کیا جاتا۔ اس سلسلے میں بحر حال شوہر کا تعاون انھیں حاصل رہا۔ ایک طرف ملازمت دوسری طرف ادبی مصروفیات اور گھریلو ذمہ داریاں

باوجود کوشش کہ ان کی گھریلو زندگی متاثر ہونے لگی۔ وہ روائتی بہوؤں کی طرح اپنے آپ کو صرف گھر گھر ہستی تک محدود نہیں رکھ سکتی تھیں جو کہ ان کے سسرال والوں کا تقاضا تھا۔ اس وجہ سے رنجشیں بڑھنے لگیں۔ پروین تو حتی المقدر کوشش کرتی رہیں کہ ان کی گھریلو زندگی میں تلخیاں نہ گھلیں لیکن سب کا دل جیتنا ان کے بس کا کام نہیں تھا۔

یہ بات تو طے ہے کہ پروین جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور منفرد خوبیوں کی حامل شخصیت کو سسرال والوں کی طرف سے کوئی خاص پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔ انھوں نے پروین کی بے مثال صلاحیتوں کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ جس کی وجہ سے کچھ افسردہ اور ملول سی رہنے لگیں۔ ان کے کئی اشعار ان کی ناآسودہ ازدواجی زندگی کے کرب کو پیش کرتے ہیں۔

؎ وہی تنہائی، وہی دھوپ، وہی بے سمتی
گھر میں رہنا بھی ہوا رہگذر میں رہنا

؎ جب بھی گئے، عذاب در و بام تھا وہی
آخر کو کتنی دیر سے گھر جانا چاہیے [1]

جب نصیر کا تبادلہ ایبٹ آباد ہوا تو پروین بھی ایک سال کی چھٹی لے کر ان کے ساتھ چلی گئیں۔ وہاں کسی حد تک وہ خوش اور مطمئن تھیں۔ کیونکہ نصیر کے ساتھ ان کے تعلق اچھے رہے۔ لیکن نصیر کے گھر والوں کے ساتھ ان کی ذہنی مطابقت نہیں تھی۔ سکون کا یہ دورانیہ بہت مختصر تھا۔ نصیر کے والدین نے اُسے واپس کراچی آنے کے لیے اصرار کیا۔ کیونکہ نصیر کے بڑے بھائی سید تنویر علی جو انجینئر تھے اور عین عالمِ شباب میں کوئلے کی کان میں دھماکہ ہونے سے انتقال کر گئے تھے۔ جس کی وجہ سے نصیر کی

---

[1] خودکلامی، ص:۱۸۱

والدہ افسردہ رہنے لگی تھیں اور اپنے دوسرے بیٹے کی جدائی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔

پروین کو پھر سے مشترکہ خاندان میں رہنا پڑا۔ پرانے مسائل پھر سے ابھرنے شروع ہوئے جس سے دونوں میاں بیوی میں فاصلے پیدا ہونے لگے۔ ایسا لگتا ہے کہ دونوں اپنی ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے لیکن دوسرے لوگوں کی بے جا مداخلت سے ان کی زندگی میں تلخیاں در آئیں۔ ان دونوں کے بیچ فاصلوں کو بڑھانے میں کچھ رشتہ دار خواتین نے اہم کردار ادا کیا۔ ایک دفعہ تو صورتِ حال اس حد تک بگڑ گئی کہ نصیر نے مفاہمت کی یہ صورت نکالی کہ جب تک الگ رہنے کا کوئی متبادل انتظام نہ ہو پروین اس پر تناؤ ماحول سے دور اپنے مائیکے ہی میں رہیں۔ چنانچہ مارچ ۱۹۷۹ء میں نظیر صدیقی کے نام ایک خط میں اس ساری صورتِ حال کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

''آپ کو غلط فہمی ہوگی کہ میں نے آپ کو کبھی اپنے گھر کا پتہ نہیں بتایا، اور نہ بلایا اور یہ کہ خط کہیں اور آتا ہے اور میں کہیں اور رہوتی ہوں۔ تو بہت مختصراً میں آپ کو بتا دوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس صرف اتنی بات تھی کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ آپ اس جملے سے بہت چونکے ہوں گے۔ مگر میں آپ کو صورتِ حال سے تھوڑا سا آگاہ کر دوں کہ میں گذشتہ ستمبر سے اپنی امی کے ہاں مقیم ہوں۔ میرے اور نصیر کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ مگر ان کے گھر والوں سے میں ایڈجسٹ نہیں کر سکی۔ اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ میں میز کرسی یا الماری نہیں تھی۔ سوچنے والا ذہن رکھتے ہوئے ایک لڑکی تھی۔ نصیر تقریباً روز ہی مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ ویک اینڈ پر رہ بھی جاتے ہیں۔ مگر آج تک ایک گھر لے کر رہ نہیں سکے۔ اس لیے کہ عین موقع پر کوئی

گڑبڑ ایسی ہو جاتی ہے کہ معاملہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ نصیر اس لیے کچھ زیادہ ہی باہر جانے کی کوشش میں ہیں۔ کہ کسی طرح یہاں سے نکلیں تب ہم اکٹھے رہ سکیں۔ یہ سب پرابلمز اتنے عرصے سے چل رہے تھے کہ میں آپ کو کیا بلاتی کہاں بلاتی؟ مگر چونکہ اب یہ طے ہو چکا ہے کہ جب تک نصیر پاکستان سے باہر نہیں جاتے اور جس کے لیے انھوں نے کئی جگہ انٹرویو دے رکھے ہیں۔ میں امی کے پاس رہوں گی۔ میرا سارا سامان وہیں پڑا ہے۔ میں اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کے لیے نصیر کے ساتھ نکلی تھی۔ آپریشن کے بعد جیسا کہ اکثر گھرانوں میں ہوتا ہے امی مجھے اپنے ساتھ لے آئیں۔ اور پھر یہ صورتحال اتنی زیادہ بگڑ گئی کہ خود نصیر نے یہ فیصلہ کیا کہ میرا یہیں رہنا بہتر ہے''۔[۱]

جس طرح سونا آگ میں تپ کر کندن بن جاتا ہے اسی طرح پروین کے خیالات و افکار محنت و ذہانت کے ساتھ ساتھ گھریلو تکلیف دہ حالات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن گئے۔ یعنی کٹھن حالات ہی ان کی شاعری کے لیے مہمیز ثابت ہوئے۔ ان کا فن مزید نکھرتا گیا۔ درد و غم کی آمیزش سے ان کے فن میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ڈبلیو بی ایٹس نے کہا تھا کہ ہم حقیقی معنوں میں اس وقت جینا شروع کرتے ہیں جب ہم میں زندگی کو ایک المیہ سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت سچائی ہے۔ زندگی میں انھیں جن مراحل سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ زندگی سے جو تجربات و مشاہدات حاصل ہوئے وہ بالکل اسی انداز میں بغیر کسی مبالغے کے سپرد قلم کرتی رہیں۔ اب تک ان کے پاس کافی شعری مواد جمع ہو چکا تھا۔ انھوں نے ایک کتاب مرتب کرنے کا فیصلہ کیا۔

---

۱ پروین شاکر کے خطوط، نظیر صدیقی کے نام مرتبہ جاوید وارثی، بساطِ ادب پاکستان، ص:۸۴

اس سلسلے میں قاسمی صاحب کا تعاون اور قیمتی مشورے شاملِ حال رہے۔اس کتاب کا سرِ ورق قاسمی صاحب نے پاکستان کے مشہور مصوّر صادقین سے بنوایا۔ یہ کتاب لاہور کے اشاعتی ادارے ''التحریر'' اور مکتبہ فنون کے تعاون سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کی افتتاحی تقریب کراچی میں منعقد ہوئی۔ زندگی اور اس کے حسن کی دلدادہ شاعرہ نے اپنی پہلی کتاب کا نام ''خوشبو'' رکھا۔ خوشبواور پھول پروین کو ہمیشہ سے پسند رہے تھےاس لیے'خوشبو'ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔خوشبوان کی ذات کا بامعنی استعارہ اور ان کی شاعری کا تلازمہ قرار پایا۔ لفظ'خوشبو' ان کی شاعری میں سینکڑوں مرتبہ آیا ہے۔لیکن ہر دفعہ الگ الگ معنی کے پیرائے میں استعمال ہوا ہے۔

ساڑھے تین سوصفحات کی اس کتاب نے پروین کوشہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔اس کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی۔ خوشبو میں تازگی اور شادابی ہے۔اس میں نوعمرلڑکیوں کے نرم و نازک جذبات اورلطیف احساسات کی ترجمانی بڑے خوبصورت اور فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے۔اس میں کچی عمر کی لڑکیوں کے پیار کی خوشبو ہے۔ان کے روپہلے خواب ہیں جسین تمنائیں ہیں اور پھران خوابوں کے ٹوٹنے بکھرنے کا المیہ ہے۔یہی جذبے یہی خواہشیں پروین کی ابتدائی شاعری کا موضوع اوران کی پہچان بن گے۔جسن وعشق کے ساتھ ساتھ جدیدزندگی کے تلخ حقائق بھی خوشبو کا موضوع ہے، میں خوشبو کی ہردلعزیزی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ یہ سب سے زیادہ بکنے والی کتاب قرار پائی اسے آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا۔کئی ایڈیشن چھاپے گئے ۔ ہرتخلیق کارخواہ کتنا ہی اپنی تخلیق میں اپنی ذاتی زندگی کوالگ رکھنے کی کوشش کرےلیکن کہیں نہ کہیں غیرشعوری طور پرفن کار کی شخصیت اس کی تخلیق میں عیاں ہوجاتی ہے۔تخلیق ایک ایسا دریچہ ہے جس کے ذریعے تخلیق کار کی ذات تک رسائی آسان ہوجاتی ہے۔

خوشبو کی شاعری میں وہ اپنی شخصیت کے سب پہلوؤں سمیٹ دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی کتاب 'خوشبو' واضح طور پر ان کی خوشیوں اور غموں کی عکاس ہے۔ خوشبو کے علاوہ انھوں نے چار اور شعری مجموعے تخلیق کیے لیکن وہ ہمیشہ خوشبو کے حوالے سے پہچانی گئیں۔ اس کے بعد پاکستان سے باہر بھی ان کی شہرت پھیلنے لگی۔ ہندوستان میں ۱۹۷۷ء تک ان کے نام سے کوئی واقف نہیں تھا۔ ہندوستان میں ان کی شاعری کی دھوم دہلی کلاتھ ملز کے مشہور شنکر شاد مشاعرے کے ذریعے ہوئی جو ۱۹۷۸ء میں دہلی میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس کے مہمان خصوصی اٹل بہاری باجپائی تھے۔ وہ اس وقت ہندوستان کے وزیر خارجہ تھے۔ انھوں نے اس مشاعرے میں مہمان شعراء کو اجازت دی تھی کہ وہ ملک میں جہاں بھی چاہیں جاسکتے ہیں۔ اس معاشرے میں پاکستان کی مشہور شاعرہ زہرہ نگار اور سمیا قزلباش بھی موجود تھیں۔ لیکن پروین کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ہمارے یہاں اکثر شعراء اپنے کلام کو پراثر اور دلنشین بنانے کے لیے خوب لہک لہک ترنم سے گاتے ہیں۔ لیکن پروین ان بناوٹی اداؤں سے بے نیاز تھیں وہ ترنم کی بیساکھی کے بدلے اپنی فنی صلاحیتوں پر یقین رکھتی تھیں۔ چنانچہ اس مشاعرے میں بھی انھوں نے اداکاری کے بغیر سامعین کے پرزور اصرار پر یکے بعد دیگرے تین غزلیں پڑھیں اور بے پناہ داد وصول کی۔ اس وقت وہ چھبیس یا ستائیس برس کی تھیں۔ سامعین بھی حیران تھے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس لڑکی کی شاعری میں پختگی اور سحر انگیزی کس کمال درجے کی ہے۔ اس غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جو اس مشاعرے میں انھوں نے پڑھیں۔ اس غزل سے ان کی فنی بصیرت اور تجربے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے

؎ موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہوگئے
بادل کو کیا خبر کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہوگئے
جگنو کو دِن کے وقت پر کھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے

اس غزل کا آخری شعر تو پاکستان اور ہندوستان میں زبان زد عام ہوا۔ دوسرے دن ہندوستان کے تمام اخبارات ورسائل کا موضوع پروین کی شاعری تھی۔ پروین کی شاعری کے تذکرے ہر جگہ تھے۔ بقول مجتبیٰ حسین:

''مشاعرے سے دو دن پہلے ان سے کانسٹی ٹیوشن کلب کی ایک مخصوص بیٹھک میں ملاقات ہوئی تھی وہ پالم ائر پورٹ سے سیدھے کانسٹی ٹیوشن کلب آئی تھی جب ہم سے تعارف کرایا گیا تو ہم نے جی ہی جی میں سوچا کہ ایسی دھان پان سی لڑکی کیا شعر کہہ سکے گی۔ جب اس مخصوص بیٹھک میں ان کے کلام سنانے کی باری آئی تو ہم نے فرمائش کی کہ وہ ترنم سے کلام سنائیں اس پر وہ بولیں معاف کیجیے میں ترنم سے محروم ہوں۔ ہمیں اس جملہ پر سخت حیرت ہوئی کیونکہ ہماری اکثر شاعرات ترنم سے کلام نہیں سناتیں بلکہ اپنے کلام سے ترنم سنائی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلی بار ہم نے ایک خاتون کو تحت اللّفظ میں شعر پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ مشاعرے کے دوسرے دن ہم گھر سے باہر نکلے تو پتہ چلا کہ دہلی میں جدھر جائیں پروین کے چرچے ہیں۔''[1]

ہندوستان میں 'خوشبو' اس قدر مقبول ہوئی کہ ہندی زبان میں بھی خوشبو کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا خوشبو [1]

۲۰ نومبر ۱۹۷۹ء کو قدرت نے انھیں ماں کے حسین روپ سے نوازا۔ ان کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ مراد جسے وہ پیار سے گیتو کہتی تھیں بہار کے خوشگوار جھونکے کی مانند ان کی زندگی میں ایسے آیا کہ اداس زندگی میں خوشیوں کے رنگ بکھر گئے۔ انھیں جینے کا جواز مل گیا۔ وہ اس کی پرورش میں مصروف ہوگئیں۔ گیتو ماں کی طرح سرخ وسفید خوبصورت بچہ تھا۔ نانا نانی کی محبتوں اور شفقتوں کا واحد مرکز تھا۔

تخلیق کے بعد ذات کی تکمیل کی خوشی ان کی کتاب ''خود کلامی'' کی کئی نظموں اور غزلوں میں عیاں ہیں۔ ایک نظم ''جواز'' میں اس طرح اظہار پا گئی ہے۔

آواز کے سیلِ بے پنہ میں
میں تھی، مرے گھر کی خامشی تھی
پر دیکھ تو آ کے لعل میرے
اس کلبۂ غم میں مجھ کو تیرے
آنے کی نوید کیا ملی ہے
جینے کا جواز مل گیا ہے! [2]

۱۹۸۰ء میں ان کی دوسری تخلیق ''صد برگ'' کی صورت میں منظر عام پر آئی۔ میسرز 'التحریر'

---

[1] مضمون: 'میں سمندر دیکھتی ہوں تم کنارہ دیکھنا' مصنف مجتبیٰ حسین بشمولہ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، ص: ۴۱۰

[2] 'انکار' مصنفہ پروین شاکر، ص: ۱۹

اس کتاب کے پبلشرز تھے۔ رسمِ رونمائی کراچی میں منعقد ہوئی۔ اس کتاب کا انتساب پروین نے اپنی والدہ کے نام کیا۔ ''خوشبو'' کے مدھر و مسحور کن جذبات و احساسات والی لڑکی 'صد برگ' تک پہنچتے پہنچتے زندگی کے تلخ حقائق و تجربات سے آشنا ہو چکی ہوتی ہے۔ 'صد برگ' ان کی شاعری کا دوسرا جنم ہے۔ اگر چہ یہاں بھی عشق و محبت کی خوشبو پھیلی ہوئی ملتی ہے اس لیے یہاں جذباتی رویے کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب زندگی کی کڑی دھوپ اور حالات کی سنگینی کا احساس عیاں ہو جاتا ہے تو 'خوشبو' والا نرم و کومل لہجہ کڑوا کسیلا ہو جاتا ہے۔ وقت نے ان کے ساتھ اب تک جو سلوک کیا ہے اس وجہ سے ان کے لہجے میں شکائیتی انداز در آیا ہے۔

ان کے دائرہ فکر میں وسعت بھی پیدا ہوئی ہے۔ جس سے ان کی شاعری میں مذید نکھار پیدا ہوا ہے۔ وہ ذات کے حصار سے نکل کر گرد و پیش کا باریک بینی سے جائزہ لیتی ہیں۔ جو بات انھیں سب سے زیادہ مضطرب کرتی ہے وہ مارشل لاء کے نتیجے میں ملک کی ابتر صورتحال ہے۔ حساس ذہن ہوتے ہوئے وہ کس طرح ان حقائق سے چشم پوشی کر سکتی تھیں۔ ان کا قلم صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ اس میں طنز کی آمیزش بھی شامل ہو جاتی ہے۔ عصری مسائل کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی اس دور کی نظموں اور غزلوں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

ؔ اک بار جسے چاٹ گئی دھوپ کی خواہش
پھر شاخ پہ اس پھول کو کھلتے نہیں دیکھا

'صد برگ' کے دیباچے میں طنز کی کاٹ واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ جو دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ نمونے کے طور پر 'صد برگ' سے اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

''زندگی کے دشتِ بلا میں جب سچائی اپنے وقتِ عصر کو پہنچ جائے تو کون و مکان

میں صرف ایک پکار باقی رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔ہل من ناصر ینصر نا۔۔۔ہل من ناصر ینصر نا۔لیکن جس معاشرے میں قدروں کے نمبر منسوخ ہو چکے ہوں اور درہم خودداری دینار عزتِ نفس کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلیں وہاں نیکی کی نصرت کو کون آئے گا وہاں تو سماعتیں بہری اور بصارتیں اندھی ہو جاتی ہیں۔سنگینوں میں پروئے ہوئے بچے اور نیزوں پہ سجے ہوئے جواں سر میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے ہے اور میں قتل ہونے والوں کے نام تک نہیں پوچھ سکی۔ کیونکہ ایسا کرنے میں وفاداریاں مشکوک ہو جاتی ہیں۔مرگِ انبوہ تو یوں بھی جشن کا سماں رکھتی ہے۔سو تماشا دیکھنے والوں میں میری آنکھیں بھی شامل رہیں۔بستی میں برف باری ہوئی تو لوگوں نے اپنے ہاتھ تاپنے کے لیے گھر ہی جلا دیئے اور جب تمام بستی شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تو سارے ہاتھ بلند تھے۔مگر کسی کو سورۃ ابراہیم یاد نہ تھی۔

بہار کی دھوپ جب شہر کا رنگ جلانے لگے تو سورج سے حرارت کے بجائے پناہ مانگی جاتی ہے۔لیکن بارشیں ہوئیں تو کھلا کہ اپنے شہر کا رنگ ہی کچا تھا![1]

پروین سمجھتی تھیں کہ زندگی آرام طلبی اور عیش پرستی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک زندگی ایک طرح کی مہم جوئی ہے۔ان کا خیال تھا کہ کسی بھی مقام کو اپنی منزل سمجھ کر رکنا نہیں چاہیے بلکہ اقبال کی فکر کی طرح نئی نئی دنیاؤں کی تلاش نئی منزلوں کی جستجو انسان کا مطمع نظر ہونا چاہیے۔وہ ایسی زندگی کو ناپسند کرتی تھیں جو بالکل سپاٹ ہو جس میں کوئی تبدیلی کوئی ہلچل نہ ہو۔وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ساری زندگی ایک استاد کی حیثیت سے گزار دیں۔اس کے برعکس ان کے شوہر ایم۔بی۔بی۔ایس

---

[1] دیباچہ صد برگ، مصنفہ پروین شاکر، ص:۱۳، مراد پبلی کیشنز اسلام آباد

کی ڈگری پر ہی اکتفا کئے ہوئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خیالات ونظریات ایک دوسرے سے کافی مختلف تھے۔ پروین کی سیمابی فطرت انھیں خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رکھتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک نئی دنیا کی تلاش اور ہر دن نئے افق کی جستجو میں رہتی تھیں۔

؎ تتلیوں کی بے چینی آبسی ہے پاؤں میں
ایک پل کو چھاؤں میں، اور پھر ہواؤں میں [1]

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۸۰ء میں پھر سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور لسانیات میں ایم۔اے کی ڈگری درجہ اول میں حاصل کی۔

۱۹۸۱ء میں وہ سی ایس ایس کا امتحان دینا چاہتی تھیں۔ تاکہ نسبتاً بہتر کیریئر کا آغاز کرسکیں۔ اس امتحان کے لیے ان کی عمر زیادہ ہوچکی تھی۔ جس کے لیے صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا پڑا۔ ان کے بلند عزائم راستے کی کٹھنائیوں کو دور کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ان کی محنت وکوشش رنگ لائی سی ایس ایس کے امتحان میں ان کی دوسری پوزیشن تھی۔

پروینؔ شاکر کی ہر دلعزیزی اور شہرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ سی۔ایس۔ایس کے امتحان میں اردو کے ایک پرچے میں ان کی کتاب ''خوشبو'' سے متعلق ایک سوال پوچھا گیا۔ اپنی تخلیق پر خود تنقید یا تبصرہ کرنا مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن پروین نے اپنی کتاب پر ایک بھرپور تنقیدی مضمون تحریر کیا۔ اس امتحان میں شاندار کامیابی پر انھیں پاکستان فارن سروس میں ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ فارن سروس میں جانا ان کی دلی آرزو تھی۔ مگر ان کے والدین اس بات کے لیے رضامند نہیں تھے کہ ان کی بیٹی جبکہ وہ ایک بیٹے کی ماں بن چکی ہے ملکوں ملکوں گھومتی پھرے۔ انھیں خدشہ تھا کہ

---

[1] خوشبو، ص: ۳۱۸، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

پروین کی ازدواجی زندگی جو پہلے ہی اختلافات کا شکار ہے مزید کوئی اور رنگ اختیار نہ کرلے۔لیکن پروین تو جانے کے لیے بضد تھیں۔ان کے عمو احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی انھیں جانے سے منع کیا اور اپنے خدشات کا اظہار کیا۔لیکن یہ معاملہ خود بخود سلجھ گیا جب جنرل ضیاء الحق نے خواتین کا فارن سروس میں جانا سختی سے ممنوع قرار دیا تھا۔

۱۹۸۲ء میں پروین نے سروس اکیڈیمی لاہور میں شمولیت اختیار کی۔ یہ سی ایس ایس میں کامیاب ہونے والے آفیسرز کے لیے ایک تربیتی پروگرام ہوتا ہے۔اب مراد صرف نانا نانی کی ذمہ داری تھا۔لاہور ہمیشہ سے علم وادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی فضا پروین کے لیے باعثِ کشش تھی۔ اور کچھ عرصہ کے لیے ہی سہی پروین کو گھر کے پرتناؤ ماحول سے نجات بھی مل گئی۔اکیڈیمی کے کچھ اور لوگ بھی ادبی ذوق کے حامل تھے۔ چنانچہ یہاں کا ماحول ان کی طبیعت کے موافق تھا۔ یہاں انھوں نے ادبی ذوق رکھنے والوں کا ایک حلقہ بنالیا۔شعروشاعری کی محفلیں منعقد کی جاتیں۔مختلف ادبی ٹھکانوں پر شعروشاعری کے علاوہ پان اور کافی سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ پروین اپنے بیٹے مراد کو بھی اکیڈیمی لے آئیں کیونکہ ان کے شوہر اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ مراد اپنے ننہال رہے۔ یہاں بھی مراد سب کا لاڈلا اور سب کی چاہتوں کا مرکز تھا۔ اکیڈیمی میں ایک دفعہ محفلِ مشاعرہ منقعد کی گئی جس میں احمد ندیم قاسمی صاحب کو مہمان خصوصی کے طور مدعو کیا گیا۔لڑکوں نے پروین کی نظم ''اکادمی کے چاند'' پر پیروڈی لکھی۔اس میں سیشن میں شامل ہر لڑکی کے لیے ایک نظم تھی۔لڑکیوں نے اس شرارت کے جواب میں ''اکادمی کے سورج'' کے عنوان سے لڑکوں پر طنز و مزاح کے نشتر چلائے۔

نئی منزلوں کو چھونے کی امنگ اور اپنی قابلیت کے بل بوتے پر پروین نے ہر میدان میں

کامیابی حاصل کی۔ یہاں انھیں بہترین پروبیشنرز کا اعزاز ملا۔ اکیڈیمی کے ۱۵۴ رطلباء میں ان کی میرٹ پوزیشن تیسرے نمبر پرتھی۔ یہ شاندار کامیابی تھی۔ ان کی بہترین کارکردگی پر انھیں سونے کا تمغہ بھی دیا گیا۔

ان کی سروس کا گروپ فارن سروس تبدیل کر کے کسٹم کا محکمہ سونپ دیا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں انھیں کسٹم کے محکمے میں اسسٹنٹ کلکٹر کی حیثیت سے تعینات کر دیا گیا۔ کسٹم کا محکمہ خود بھی انھیں پسند تھا۔ حالانکہ اس محکمے میں ایک عورت کا نوکری کرنا آسان کام نہیں۔ کیونکہ کسٹم آفیسرز کو ڈاکوؤں اور اسمگلروں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ لیکن پروین نے یہ ثابت کر دیا کہ شاعرہ کا دل ودماغ رکھنے والی نازک سی عورت بھی اس خطرناک محکمے میں دیانتدار اور اصول پرست کامیاب آفیسر ہوسکتی ہے۔

ڈیفنس ہاوسنگ سوسائٹی کسٹم آفیسرز کالونی میں انھیں سرکاری رہائش گاہ الاٹ کی گئی۔ ایک گھر ہونا اور اس کی تزئین وآرائش ازل سے ہی عورت کی دلی آرزو رہتی ہے۔ وہ بڑے شوق سے اپنے گھر کو سجانے سنوارنے میں مصروف ہوگئیں۔ گھر کے لان میں پودے اور پھول اگائے انھیں ہمیشہ خوشبوؤں کے حصّار میں رہنا پسند تھا۔ سرکاری ذمہ داریاں، بچے کی نگہداشت مشاعروں کے لیے بیرون ممالک سفر اور اپنی تیسری کتاب کے لیے مواد کی تزئین وترتیب ان سب امور کی انجام دہی خوش اسلوبی سے کرنا کوئی اتنا آسان کام بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کی حامل تھیں۔ خدا نے انھیں زندگی کی جو مختصر سی مہلت دے رکھی تھی وہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں۔ ۱۹۸۵ء میں ان کی تیسری کتاب ''خود کلامی'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا انتساب اپنے بیٹے مراد علی کے نام کیا ہے۔ ''خود کلامی'' یعنی تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کرنا۔ اپنی ذات میں غوطہ زنی کا اشاریہ ہے، خارجی دنیا سے اپنی ذات کی طرف لوٹنا۔ اپنی

ذات کے نہاں خانوں میں جھانکنا۔ ازدواجی الجھنیں، نفسیاتی گتھیاں ہیں شریک سفر سے ذہنی ناہم آہنگی کی شکایت بھی خود کلامی میں شامل ہے۔ یہاں پر وہ ایک ماں کے روپ میں بھی جلوہ گر ہیں۔ کئی نظمیں اپنے بیٹے کے لیے بھی لکھی ہیں جو ممتا کے جذبات سے بھرپور ہیں۔

'خود کلامی' میں 'خوشبو' والی الھڑ دوشیزہ کے بجائے باہمت اور مضبوط اعصاب کی مالک عورت کے روپ میں دکھائی دیتی ہیں۔ 'خوشبو' والی رومانی سوچ تو برقرار ہے مگر یہاں ایک حساس اور بالغ النظر انسان کی طرح اپنے آس پاس پھیلی ہوئی ناانصافیاں اور ناہمواریاں انھیں شدید کرب میں مبتلا کرتی ہیں۔ حالات کی ستم ظریفیاں ان کے فکر و خیال کو نئی آب و تاب عطا کرتی ہیں۔ اس کتاب میں اداسی اور رومان کا ملا جلا رنگ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے وقت کا سیلِ رواں اپنے تند و تیز تھپیڑوں سے انھیں شکست دینے کی کوشش میں ہے۔ لیکن وہ اس سے بچ کر اپنی منزل کی طرف سفر جاری رکھنے کی سعی میں گامزن ہیں۔ 'صد برگ' میں معاشرتی ناہمواریوں پر طنز موجود ہے یہی طنز کی کاٹ خود کلامی تک پہنچتے ہوئے مزید شدت اختیار کر لیتی ہے۔

؎ کیا جاں کے خسارے کی تمنا ہو کہ اب عشق
بڑھتا ہی نہیں درہم و دینار کے آگے [1]

؎ بے فیض رفاقت میں ثمر کس لیے تھا
جب دھوپ تھی قسمت، تو شجر کس لیے تھا [2]

؎ دل تو چمک سکے گا کیا پھر بھی ترش کے دیکھ لیں
شیشہ گرِ اِن شہر کے ہاتھ کا یہ کمال بھی [3]

'خود کلامی' کا سرورق بھی صادقین نے ہی ڈیزائن کیا تھا۔ اس کتاب کی رسمِ اجرائی آواری ہوٹل

---

[1] و [2] و [3] خود کلامی، ص: ۱۱۸ و ۵۵ و ۹

لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں امجد الاسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی نے شرکت کی۔ پروین نے ایک چائنیز ہوٹل میں رات کے کھانے پر اس تقریب کے شرکاء کو مدعو کیا اور سب کو 'خود کلامی' کا ایک ایک نسخہ اور اس پر مبنی آڈیو کیسٹ بھی دیا گیا۔

شعر و ادب کے میدان میں اپنی کامیابیوں پر وہ بہت خوش اور نازاں تھی۔ کیونکہ ان کے خواب تعبیروں سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ اسی سال انھیں ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ برائے شاعری بھی ملا۔

۱۹۸۶ء ان کے لیے ایک اور خوش نصیبی لے کر آیا۔ پروین کو ادیبوں کے تبادلے کے ایک پروگرام کے تحت امریکہ جانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ اسی بہانے انھیں امریکہ دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ امریکہ کی سرکردہ ادبی شخصیات سے ملیں وہاں انھوں نے Lvy League یونیورسٹی اور امریکی ادبی و تمدنی مرکز کے دورے کیئے۔

زندگی کے ہر میدان میں کامیابیاں وکامرانیاں ان کے قدم چوم رہی تھیں۔ سرکاری عہدہ حسن عزت شہرت ملک و بیرون ملک سفر تعریف وتوصیف سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک کمی کا ایک خلا کا احساس بدستور موجود تھا۔ ایک گہری اداسی ان کی شخصیت کا حالہ کیئے رہتی۔ ان کے گھریلو زندگی انتشار کا شکار تھی۔ جس رشتے کو وہ اب تک سمجھوتے کے بندھن میں بندھے گزراتے چلے آرہے تھے اور دونوں اسے کامیاب بنانے پہ تلے ہوئے تھے۔ اب ہر گزرتے پل کے ساتھ کمزور پڑتا جارہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کی آپس میں دلی اور ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی۔ پروین جیسی دانشورانہ فہم و فراست رکھنے والی عورت کے ساتھ نصیر کا گزارا کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اُسے تو روائتی مشرقی مردوں کی طرح ایک گھریلو قسم کی عورت کی ضرروت تھی جس کی زندگی کا محور صرف شوہر بچے اور گھرداری تک ہی محدود ہو۔ پروین اپنی شہرت، عزت اور کامیابیوں سے منہ موڑ کر گمنامی کی زندگی

کا انتخاب نہیں کرسکتی تھیں۔ دونوں کی دنیائیں اورترجیحات مختلف تھیں۔ پروین بڑے عہدے پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور شاعرہ اور ستم بالائے ستم خوبصورت بھی تھیں۔ ہمارے معاشرے میں باہر کام کرنے والی عورت کا خوبصورت ہونا خود اس کے لیے کافی مسائل کا باعث بنتا ہے۔گلزار جاوید کو دیے گئے انٹرویو میں کہتی ہیں:

س: آپ نے نوشی گیلانی کی تقریب میں کہا تھا کہ کوئی شاعرہ اچھی ہو اور خوبصورت ہو تو اس کے مسائل میں اضافہ ہو جاتا ہے آپ کو بھی مسائل کا سامنا کرنا پڑا؟

ج: میں نے شعر لکھنے کی بہت قیمت چکائی ہے ہمارے معاشرے میں خوبصورتی ذہن کی ہو یا چہرے کی ہر شخص اس پر اپنا حق سمجھتا ہے کیونکہ آپ ہر شخص کو یہ حق تفویض نہیں کر سکتے۔اس لیے گویا دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرتے جاتے ہیں اس کے علاوہ گروہِ دشمنان میں بعض خواتین خصوصاً اہل قلم اپنا رول اس طرح ادا کرتی ہیں کہ مرد بھی شرما جائیں۔[1]

لوگ رشک وحسد کی نظروں سے دیکھتے تھے۔اخبار ورسائل تو مشہور لوگوں کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ان کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بغیر تحقیق کے چھاپ دیتے ہیں۔ پروین کے متعلق فضول باتیں جن کا کوئی وجود ہی نہ تھا اخبارات میں چھپتی رہیں۔اور میرے خیال سے میاں بیوں کے رشتے میں دراڑ کا ایک سبب یہ بے بنیاد اسکینڈلز بھی تھے۔حالانکہ پروین کی ذات ان سب باتوں سے بہت بلند تھی۔ بقول ان کی سہیلی پروین قادر آغا کے۔

> ''وہ ایک پاکیزہ روح تھی۔ میرے لیے وہ ایک گل بچہ،تازہ ہوا کا ایک جھونکا،ایک حساس فرد جو اپنے سوا کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی''۔[1]

---

[1] روزنامہ جنگ،گلزار جاوید

پروین کے اہل خانہ کے انٹرویوز سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے بیچ دوریاں پیدا کرنے میں کچھ رشتہ دار خواتین نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ پروین کے والدین ہمیشہ انھیں شاعری سے دور رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی داو پر لگی ہوئی ہے۔ کہیں سے بھی امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ان سب باتوں کا پروین نے یہی حل سوچا کہ کراچی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح وہ کئی طرح کی ناپسندیدہ باتوں سے بچ سکتی تھیں۔ اگرچہ دل کڑا کر کے انھوں نے یہ فیصلہ لیا تھا لیکن یہ اتنا آسان کام بھی نہیں تھا۔ کراچی جہاں وہ پلیں بڑھیں تھیں شعور وجدان کی منزلیں طے کی تھیں۔ زندگی کے تلخ و شیریں ذائقوں کو محسوس کرنا سیکھا تھا۔ کراچی سے وابستہ تمام یادوں کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر انھوں نے اپنا تبادلہ سنٹرل بورڈ آف ریونیو اسلام آباد کروالیا اور ۱۹۸۶ء میں سی۔ بی۔ آر میں سیکنڈ سیکرٹری کی حیثیت سے اپنی سرکاری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء ہی میں نصیر نے پروین سے ملاقات کی لیکن صلح کی شرائط پروین کے لیے قابلِ قبول نہیں تھیں۔ چنانچہ وہ مایوس واپس چلے گئے فروری ۱۹۸۷ء میں نصیر دوبارہ پروین سے ملے اور باہمی رضامندی سے ان کی گیارہ سالہ ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

ے پھر بھی نہ میرا قافلہ لٹنے سے بچ سکا
میں نے خبر تو رکھی تھی ایک ایک گھات کی

ے میرے گھر کو یہ کس کی نظر لگ گئی اے خدا
کیسی کیسی دعاؤں کے ہوتے ہوئے بددعا لگ گئی اے خدا

پروین جیسی حساس عورت جو دوسروں کے درد محسوس کر کے تڑپ اٹھتی تھی جنھیں چڑیوں کے گھونسے کا

ا مضمون گہر اشک قطرہ باراں مصنفہ پروین قادر آغا بشمولہ خوشبو کی ہمسفر، ص: ۳۵۰

ٹوٹنا تکلیف دیتا تھا۔ خود اپنے آشیانے کے بکھرنے پر شریک حیات کے بچھڑنے پر کس صدمے سے گرزی ہوں گی اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔

ے میرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے

ے جب ستارے ہی نہیں مل پائے
لے کے ہم شمس و قمر کیا کرئے

ے ممکنہ فیصلوں میں اِک فیصلہ ہجر کا بھی تھا
ہم نے تو اک بات کی اس نے کمال کردیا[1]

ے تمام عمر کی نا معتبر رفاقت سے
کہیں بھلا ہو کہ پل بھر ملیں، یقین سے ملیں

ے اس ترک رفاقت پہ پریشان تو ہوں لیکن
اب تک کہ تیرے ساتھ پہ حیرت بھی بہت ہے

طلاق کی شرائط کے مطابق پروین بیٹے کو اس صورت میں رکھ سکتی تھی جب تک کے وہ دوسری شادی نہ کریں جبکہ نصیر آزاد تھا۔ اس نے دوبارہ شادی کرلی۔ جس سے ان کے یہاں ایک بیٹی بھی ہے۔ وہ تارتھ ناظم آباد کے علاقے میں رہائش پذیر ہیں۔

ے شب وہی لیکن ستارہ اور ہے
اب سفر کا استعارہ اور ہے

اسلام آباد میں پروین کی زندگی کا نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔ پروین کی زندگی کے حالات ایرانی شاعرہ

---

[1] کفِ آئینہ مصنفہ پروین شاکر

فروغ فرخ زاد سے بہت ملتے جلتے ہیں ۔فروغ پہلوی دور کی بے باک اور سرکش شاعرہ تھیں ۔ فارسی کی جدید شاعری میں فروغ فرخ ذاد پہلی خاتون شاعرہ ہیں وہ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۹۶۷ء میں پروین ہی کی طرح کم عمری ہی میں کار کے حادثے میں انتقال کر گئیں ۔ انھوں نے اپنی گھریلو زندگی اپنے فن پر قربان کر دی اور تنہا رہنے کو ترجیح دی ۔ فروغ فرخ ذاد سے تو ان کا بیٹا بھی چھین لیا گیا تھا۔ لیکن یہاں پروین کے معاملے میں سلامتی یہ گزری کہ پروین کی کل کائنات مراد، کی نگہداشت و پرداخت کی ذمہ داری انھیں ہی سونپ دی گئی تھی ۔ اب وہ خود مختار زندگی گزار سکتی تھی ۔ بقول نسرین شاکر پروین کی فطرت میں کسی کا غلام بن کر رہنا نہیں تھا۔ زندگی کے اس تنہا سفر پر وہ بہت پر اعتماد نظر آتی تھیں ۔ مگر پھر بھی چاہے وہ کتنی ہی باحوصلہ نڈر اور بے باک ہوتیں مگر اندر سے وہ ایک عورت کا دل رکھتی تھیں جو ایک مرد کے بغیر اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی ہے ۔ وہ سمجھتی تھی کہ تنہا عورت کو معاشرے میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اور مستقبل میں انھیں کیا کچھ درپیش ہوسکتا ہے ۔ بحر حال آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی خواہش اور مٹھی بھر آسمان اپنا ہونے کا خوش کن احساس سب واہموں اور خدشات پر حاوی ہوتا گیا ۔ بقول پروین

ے وہ بچھڑ کے مجھے سے لوٹا گیا ہے میرا وجود
یہ سانحہ تو میرے حق میں نیک فال ہی تھا

ے آسمانِ سبز گوں پر ایک تارہ ایک چاند
دسترس میں کچھ نہ ہو یہ خوشنما منظر تو ہے

وہ اتنی قناعت پسند تھیں کہ اتنے تھوڑے سے خوش نما منظر پر ہی اکتفا کر بیٹھیں ۔ اپنی کراچی والی زندگی کو جس میں کچھ تلخ یادوں کی آمیزش تھی خیر باد کہہ کر اسلام آباد میں ایک نئے ڈھنگ سے جینے

کا انداز اپنایا۔ اور اپنے ظاہری حلیے میں بھی کافی تبدیلی پیدا کی۔ کالج کے زمانے میں وہ اگر چہ برقعہ پہن کر باہر جایا کرتی تھیں لیکن اب انھوں نے جدید تراش خراش کے کپڑے پہننے شروع کیے۔ اپنے لمبے بال بھی کٹوا دیے۔ میک اپ کرنا شروع کیا اور گیتو کو پاکستان کے مشہور تعلیمی ادارے بیکن ہاوس میں داخل کرا دیا۔

انہی دنوں سی۔ بی۔ آر کی انکم ٹیکس سروس میں تعینات ایک افسر پروین قادر آغا سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات گہری دوستی میں بدل گئی۔ پروین قادر آغا کی ذات پروین شاکر کے لیے ایک ایسے سائباں کی مانند تھی جس نے زندگی کے ہر موڑ پر انھیں ہمدردی بے پناہ اپنائیت اور تحفظ کا احساس فراہم کیا۔ نہ صرف ان کی حیات میں بلکہ ان کے بعد بھی ان کے بیٹے اور باقی اہلِ خانہ کے لیے تقویت کا باعث ثابت ہوئیں۔

پروین ملک کی مشہور و معروف شخصیت کے طور پر لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی تھیں۔ دوسری طرف اب ان کے دشمن اور حاسد انھیں چین سے جینے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ اس کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت ایماندار افسر تھی۔ ملک کی بڑی بڑی ہستیاں کرسٹل کی چیزیں اور کرنسی اسمگل کرتیں تھیں اور ہمیشہ محصول دینے سے انکار کرتیں۔ لیکن پروین کا رویہ ان کے لیے بہت سخت گیر ہوتا تھا۔ اس لیے لوگ ان کی فرض شناسی سے نالاں تھے۔ اور انھیں تکلیف پہچانے کی کوشش میں لگے رہتے۔ ان کے متعلق بے بنیاد خبریں چھپتی رہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے بہت فکرمند تھیں کہ ان سے کوئی ان کا بیٹا جدا نہ کر دے۔ ان کا بیٹا ہی تو ان کے جینے کا سہارا تھا۔ ان تکلیف دہ حالات میں پروین قادر آغا اور ان کے شوہر آغا افضل حسین اور دیگر خیر خواہوں نے پروین کا ساتھ دیا اور بلیک میل کرنے والوں کے حربوں کو ناکام بنایا۔

ے اب سمیٹے سے سمٹتا ہی نہیں میرا وجود
اس طرح سے تو کوئی شخص نہ بکھرا ہوگا

اس طرح کے حالات سے ان کا قافیہ حیات تنگ ہوتا رہا تو انھوں نے دلبراشتہ ہوکر کسی گمنام جگہ منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔اس لیے دسمبر ۱۹۸۷ء میں واشنگٹن روانہ ہوئیں یہاں ان کا دوست ایک ایسا جوڑا تھا جو ٹیلی ویژن کے مقامی پروگرام تشکیل دیا کرتے تھے۔ ۲۷ فروری ۱۹۸۸ء کو وہ واپس آ ئیں۔ اس دفعہ انھوں نے الگ سے گھر لے کر رہنے کا خیال ترک کردیا اور اپنی سہیلی پروین قادر آغا کے ہاں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا وہ گھر کے ایک فرد کی طرح وہاں گھل مل گئیں۔اور گھر کے تمام معاملات میں خوشی خوشی شریک ہوتی تھیں۔اور پروین قادر آغا بھی ان پر اپنی محبتیں و شفقتیں نچھاور کرتی رہیں۔ بقول پروین قادر آغا:

''یکجائی کہ یہ پرمسرت دن تھے۔وہ بغیر کوشش کے دلوں میں گھر کر لیتی تھی۔اس کی خوشبو اس کی خوشگوار شخصیت سے گھر بھرا بھرا رہتا۔لوگ ہماری دوستی پر حیران ہوتے تھے وہ ہم دونوں میں مشترکہ خصوصیات نہ پاتے۔ پروین مجھ سے ایک نسل چھوٹی تھی یعنی گیاہ برس چھوٹی تھی۔وہ خواب دیکھنے والی میں بہت عملی خاتون تھی۔ مجھے اردو ادب کا بہت کم علم تھا۔ پروین سید تھی۔میں سادات سے نہیں تھی۔وہ شیعہ تھی اور میں سنی تھی۔ہم دونوں کے سیاسی نظریات میں بھی نمایاں فرق تھا۔اس کی ازدواجی زندگی تلخ تھی اور میرے ازدواجی زندگی خوشگوار وہ کسٹم سروس میں تھی اور میں انکم ٹیکس سروس میں تھی۔مشترکہ نام اور صنف کے علاوہ ہم دونوں میں یکسانیت بہت کم تھی۔ پھر بھی ہم دوست تھیں۔ ہور ہمارا کبھی ٹکراؤ نہیں ہوا۔ کیونکہ ہم سنجیدہ

موضوعات مذہب وسیاست پر سنجیدگی سے بحث نہ کرتیں'' ۔[1]

پروین کے پرستار انھیں ستائیشی خطوط بھیجتے اور بعض نے تو اپنے خون سے دستخط کئے ہوتے۔ کئی لوگ تو تعریفی اشعار سے انھیں نوازتے اور ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتے۔ لیکن پروین اس بات کو پسند نہیں کرتیں تھی ان کا کہنا تھا کہ پڑھنے والوں کو اسے نہیں بلکہ ان کی شاعری کو پسند کرنا چاہیے۔

وہ بڑے ناز ونعم کے ساتھ اپنے بیٹے (گیتو) مراد کی پرورش ونگہداشت کررہی تھیں تاکہ اُسے کسی قسم کی کمی کا احساس نہ ہونے پائے۔ البتہ پڑھائی کے معاملے میں ان کا رویہ کافی سخت تھا۔ وہ بھی ماں کی طرح پڑھائی میں بہت ہونہار تھا۔ اور بچپن سے ہی کافی سنجیدہ مزاج تھا۔ پروین نے ایک دفعہ اسے مری کے بورڈنگ سکول میں داخل کرادیا تھا۔ وہ ہر ہفتے اس سے ملنے کے لیے مری جایا کرتیں۔ مگر پھر اس کے بغیر اداس رہنے لگیں جلد ہی اسے واپس لے آئیں کیونکہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

انھیں سال کے آخر میں ایک مکان پروین قادر آغا کے گھر کے قریب ہی مل گیا۔ اور وہ وہیں منتقل ہوگئیں شوہر سے علیحدگی کے بعد وہ اپنے شہر کراچی سے دور ہوتی گئیں البتہ والدہ اور بہن کے ساتھ فون پر رابطہ رکھے ہوئے تھیں جبکہ والد صاحب نے اس واقعے کے بعد تو بالکل قطع تعلق کرلیا تھا کیونکہ شاکر صاحب خاندان میں شرمندگی محسوس کرتے تھے اور انھیں خاندان والوں کے طنز وتشنیع کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے معاشرے میں طلاق عورت کے لیے باعثِ شرمندگی تو ہے ہی بلکہ اس کی پیشانی کا ایسا داغ ہے جسے کوئی مقدس پانی بھی نہیں دھوسکتا۔ ایسے حالات میں شاکر صاحب تو بالکل ہی گوشہ نشین ہوکر رہ گئے تھے۔ پروین سے متعلق ان کے تمام خدشات حقیقت کا روپ دھار کر

---

[1] مضمون ''گہر اشک قطرہ باراں'' مصنفہ پروین قادر آغا بشمولہ خوشبو کی ہمسفر، ص: ۳۵۰۔۳۵۱

سامنے آ گئے تھے۔ ایسے میں صرف والدہ کا ساتھ ہی پروین کی ڈھارس بندھانے کے لیے کافی تھا۔ پروین کے بہت اصرار پر ان کی والدہ کچھ دنوں کے لیے پروین کے پاس آئیں۔ ۱۹۸۵ء میں شاکر صاحب ریٹائر ہو گئے۔

۱۹۸۹ء میں پروین کو فیض احمد فیضؔ ایوارڈ ملا۔ اس ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کے لیے وہ نئی دہلی تشریف لے گئیں۔ اس موقعہ پر وزیر اعظم ہند نے انھیں کشمیری شال تحفے میں دی۔ ان کے بیرون ممالک سفر جاری تھے۔ ایک وفد کے ہمراہ وہ چین بھی گئیں۔ دوسری بار جنرل ارشاد کے زمانے میں (وہ خود بھی شاعر تھے) پروین کو ڈھاکہ مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔

۱۹۹۰ء کے اوائل میں ان کی چوتھی شاعری کی کتاب 'انکار' چھپ کر سامنے آئی۔ اس کتاب کا انتساب ان کی مہربان دوست پروین قادر آغا کے نام تھا۔ کتاب کی رسم رونمائی کے مہمانِ خصوصی وفاقی وزیر داخلہ چوہدری اعتزاز احسن تھے۔ اس تقریب کی میزبان پروین کی خاص دوست مہتاب راشدی تھی۔ ممتاز مفتی اور دیگر سرکردہ ادیبوں اور شاعروں نے اس تقریب میں شرکت کی۔ ۱۹۹۱ء میں انھیں صدارتی تمغہ حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔ جب ان سے اس کتاب کے منفرد نام 'انکار' کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے اس کا مطلب یہ بتایا کہ ہار ماننے سے انکار کیا جائے۔ حالات کی غلامی نہ کی جائے اور دوسرے کے جا بجا خیالات کو بے چون و چرا تسلیم نہ کیا جائے۔ 'انکار' تک پہنچ کر وہ عمر کی اس منزل تک آ گئیں تھیں کہ جب انسان کے فکر و خیال جذبات و احساسات میں ٹھہراؤ اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی احساس 'انکار' کی غزلوں اور نظموں میں نمایاں ہے۔ اس میں سچائی او رحقیقت کے رنگ جذبے کی آمیزش کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ 'انکار' میں پروین فنی پختگی کی انتہا پر ہیں۔ ان کی شاعری میں اداسی، تنہائی اور حزن و ملال کی جو کیفیات دکھائی دیتی ہیں وہ 'انکار'

میں شدت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی وسماجی حالات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ وہ آمرانہ دور کے جبر وتشدد کو ایک تازیانے کے طور پر محسوس کرتی ہیں۔ اور اپنے دل کی بھڑاس قلم کی تلوار کے ذریعے نکالتی رہتی ہیں۔ 'انکار' میں وہ ایک ایسی شخصیت کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ جس نے دنیا کو خوب دیکھ اور پرکھ لیا ہے۔ کہ یہ دل لگانے کی جگہ نہیں۔ ایک طرح کی اکتاہٹ کا احساس جاگزین ہے۔ اس کتاب میں ترکِ دنیا کے جذبات کثرت سے ملتے ہیں۔ اس کتاب کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ اس میں ایسی تمام نظمیں شامل ہیں جو مختلف موقعوں پر مختلف اہم شخصیات کے لیے لکھی گئی ہیں اور مختلف معاشرتی رویوں اور موضوعات پر ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

ے ایک سہانی صبح کو شہر جلا ہوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں ظلِ الٰہ کے لیے

ے چھاؤں بیچ آئے ہیں یوں نفس سے مجبور ہوئے
وہ جو تقسیم ثمر پہ یہاں مامور ہوئے

ے زرد ہوتا جارہا ہے صحنِ دل کا ہر شجر
جیسے اندر ہی اندر دکھ کوئی کھانے لگے[1]

ے ماتم کی فضا ہے شہرِ دل میں
مجھ میں کوئی شخص مرگیا ہے

وہ اپنے اندر اس قدر بے چینیاں اور بے قراریاں سموئے ہوئے تھیں جو انھیں کہیں بھی اطمینان سے

1۔ انکار

رہنے نہیں دیتی تھیں بلکہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے پر اکساتی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ سمجھتی تھیں کہ ان کی تعلیم ڈاکٹریٹ کے بغیر ادھوری ہے۔ اگر چہ وہ شہرت کے نصف النہار پر تھیں لیکن پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا ان کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں سکالرشپ کے لیے انھیں منتخب کرلیا گیا۔ اسی دوران امریکہ میں فل برائیٹ اسکیم کے تحت پڑھانے کے ایک منصوبے کے لیے بھی ان کا انتخاب ہوا۔ انھیں دو میں سے کسی ایک کو چننا تھا انھیں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اندازہ تھا۔ اس لیے انھوں نے دونوں کے لیے رضا مندی دے دی۔ ہارورڈ سکالرشپ ایک سال کے لیے مؤخر کردیا گیا۔

فل برائیٹ وظیفہ سے ہارٹ فورڈ میں یونیورسٹی آف کونکٹکٹ کو منتخب کرلیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۹۰ء میں اپنے بیٹے مراد اور ملازمہ بی بی کے ہمراہ امریکہ روانہ ہوئیں۔ اس سے پہلے بھی وہ اکثر و بیشتر امریکہ جایا کرتی تھی۔ وہ عارضی طور پر اپنی دوست پروین قادر آغا کی بہن نیلوفر کے یہاں قیام پذیر ہوئیں۔ وہ ہمیشہ خود پر انحصار کرنے والی خاتون تھیں۔ چنانچہ وہاں آمدروفت کی دشواری دور کرنے کے لیے امریکی کارڈرائیو کرنا سیکھ لی۔ لیکچر کے مواد کی تیاری کے لیے کمپیوٹر اور ٹائپ کرنا بھی سیکھا۔

ٹرنٹی کالج ہارٹفورڈ میں وہ جنوبی ایشیا کا ادب پڑھاتی رہیں۔ جبکہ ہارٹفورڈ یونیورسٹی میں سویت یونین چین جاپان اور ارجنٹائین یونان برازیل اور پاکستان میں ادب فلم اور معاشرے کے متعلق دیگر اساتذہ کے ساتھ مشترکہ طور پڑھاتی تھیں۔ عالمی شعور جنوبی ایشیا میں پاکستان بنگلہ دیش کی تمدنی تاریخ پر مضامین بھی دیگر اساتذہ کے ساتھ مشترکہ طور پڑھاتی رہیں۔ امریکہ میں ان کی زندگی کسی حد تک سیٹ ہو چکی تھی وہ اپنے کام سے خوش اور مطمئن تھیں۔ اپنے بارے میں اپنے عمو احمد ندیم قاسمی صاحب کو اپنی ذرا ذرا سی تفصیل لکھا کرتیں جس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو ۲۲ دسمبر

۱۹۹۰میں لکھا گیا ہے۔

''میری کلاسیں شروع ہوگئی ہیں۔ ہفتے میں چار دن ہوتی ہیں ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی میں نے خرید لی ہے لہٰذا آنے جانے کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔گیتو کا سکول بھی شروع ہوگیا ہے اور وہ بے حد خوش ہیں''۔[۱]

مارچ ۱۹۹۱ء میں وہ اپنے بیٹے کے ہمراہ اسلام آباد آئیں تا کہ قصرِ صدارت سے اپنا حسن کارکردگی کا ایوارڈ وصول کر سکیں۔

مئی ۱۹۹۱ء میں دوبارہ پاکستان لوٹیں اس دوران ان کا قیام ڈیڑھ مہینے رہا۔ اس دورے کا مقصد پی۔ایچ۔ڈی تھیسز کے لیے مواد جمع کرنا تھا۔اب وہ امریکی طرزِ معاشرت سے کافی حد تک واقف ہو چکی تھیں۔دریائے چارلس کے قریب ایک عمارت میں انھوں نے ایک اپارٹمنٹ بھی حاصل کرلیا تھا۔''نوبل اسکوائر سکول'' میں مراد کی تعلیم بھی جاری تھی۔ بوسٹن اور کیمبرج کے علاقے میں رہائش پذیر پاکستانی خواتین سے ان کی کافی دوستی تھی۔چند دِن سکون واطمینان سے گزرے تھے کہ وہ کان کی تکلیف میں مبتلا ہوئیں۔کان کا آپریشن ہوا تو گلے کی بیماری کنٹھ لے آ گھیرا۔ یکے بعد دیگرے وہ پردیس میں بیماریوں کا شکار ہوتی رہیں۔لیکن اپنی تکالیف کے بارے میں پاکستان میں کسی سے کچھ نہ کہا۔ وہ ہمیشہ اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھتی تھیں۔اپنا درد چھپانے کا انھیں سلیقہ حاصل تھا۔وہ اپنے لیے کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتی تھیں۔۱۹۹۲ء میں ان پر ایک نئی افتاد ٹوٹی کہ ان کے والد محترم کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ ہزاروں کلو میٹر کی دوری پر باپ کی جدائی کی خبر نے انھیں چور چور کر دیا۔وہ تن تنہا اس جانکاہ صدمے سے گزریں اپنے والد کا آخری دیدار بھی نہ کر سکیں

۱۔ مکتوب نگاری مرتبہ عالیہ جلیل شاہ بشمولہ خوشبو پھول تحریر کرتی ہے،ص:۲۳۵

جس کا انھیں ہمیشہ دکھ رہا۔

''شاید آپ کے علم میں ہو کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ میرے لیے یہ بہت دشوار وقت تھا۔ بے بسی کا احساس تھا جو مارے ڈالتا تھا۔ چونکہ ہمارا بھائی کوئی نہیں لہٰذا اب گھر میری ذمہ داری ہے۔ .I am the man of the house میں انشاء اللہ جون میں واپس آ ؤں گی۔لیکن Ph. D ادھوری چھوڑنی پڑے گی''۔[1]

۱۹۹۲ء میں پروین نے ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم۔ پی۔ اے یعنی پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرڈ ڈگری حاصل کی۔تمام نامساعد حالات کے باوجود اس میں بھی شاندار کامیابی حاصل کی۔تمام اساتذہ پروین کی ذہانت و قابلیت اور وسیع مطالعہ کے قائل تھے۔ایم۔ پی۔اے کے نصاب میں انھوں نے ایک مقالہ بھی لکھا جس کا موضوع پاک بھارت جنگ میں میڈیا کا کردار تھا۔ یہ مقالہ اتنا شاندار تھا کہ اس کے اساتذہ نے اسے دیکھ کر مشورہ دیا کہ وہ اسی موضوع کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے منتخب کرے۔

۱۹۹۲ء کے وسط میں وہ پاکستان آئیں اور کراچی میں میں چند دن اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ گزارنے کے بعد اسلام آباد آ گئیں۔اور ڈائریکٹوریٹ آف انٹیلیجنس اینڈ انوسٹگیشن کسٹمز اینڈ ایکسائز کے دفتر میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنی دفتری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

دفتری مصروفیات کے ساتھ دیگر نوع کی سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔انھوں نے منشیات پر ایک مقالہ لکھا جو چین میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں پڑھا گیا۔ لاہور یونیورسٹی میں منیجمنٹ انفامشین سینٹر میں ایک کورس مکمل کیا۔

---

[1] مکتوب نگاری، مرتبہ عالیہ جلیل بشمولہ خوشبو پھول تحریر کرتی ہے، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش

انہی دنوں پروین کو تھائیورائیڈ کی کوئی تکلیف ہوئی۔ انھیں ہسپتال داخل ہونا پڑا۔ پروین کی سہیلی رفاقت انھیں کامرہ لے گئیں۔ رفاقت کے شوہر قاضی جاوید کامرہ میں بیس کمانڈر کے طور پر تعینات تھے۔ رفاقت نے بہت خلوص ومحبت سے پروین کی تیمارداری کی اور وہ صحت یاب ہوگئیں۔ نومبر۱۹۹۲ء میں ان کا تبادلہ ڈائریکٹوریٹ آف انسپکشن اینڈ آڈٹ میں ہوگیا۔ امریکہ سے واپسی پر اسلام آباد میں مرگلہ روڈ پر ایک انیکی انھیں مل گئی تھی۔ انھوں نے دوبارہ سے اپنا گھر سیٹ کیا۔ اس گھر میں ماں بیٹے کے علاوہ ایک چوکیدار اور جز وقتی ملازمہ بھی تھی۔

اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے حصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے مواد جمع کرنا شروع کیا اور اس سلسلے میں قائداعظم یونیورسٹی سے ایک کورس بھی کیا۔ اور بیس سال بعد دوبارہ روز نامہ جنگ میں ''گوشہ چشم'' کے عنوان سے کالم لکھنے بھی شروع کیے۔ ڈاکٹریٹ کے لیے امریکہ کی یونیورسٹی سے اسکالرشپ نہ مل سکا تو انھوں نے مالی تعاون کے لیے برٹش کونسل سے رجوع کیا۔ چنانچہ برطانیہ میں کامن ویلتھ سکالرشپ کے ذریعے وظیفہ مل گیا۔ انھیں بریڈفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ ملا تھا۔ لیکن انھوں نے یہ تبدیل کر کے ہارورڈ یونیورسٹی میں کرایا۔ جون۱۹۹۴ء میں اس سلسلے میں برطانیہ کا دورہ بھی کیا۔ ستمبر۱۹۹۴ء تک کورس شروع ہونے کی تمام تیاریاں مکمل ہوچکی تھی۔ وہ ہر کام بہت جلدی مکمل کرنا چاہتی تھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھیں منزل پر پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ کوئی غیبی طاقت ان سے سارے ادھورے کام جلد از جلد کرانا چاہتی تھیں۔ کسی نجومی نے ان کا ہاتھ دیکھ کر پیشین گوئی کی تھی کہ اپنی زندگی میں صرف چار کتابیں چھپوا سکے گی۔ وہ یہ بات غلط ثابت کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے وہ اپنی پانچویں کتاب مکمل کلیات کی صورت میں چھپوانے کی خواہشمند تھیں۔ انھوں نے مجوزہ کلیات کا نام ''ماہ تمام'' رکھا۔ جب ان سے پروین قادر آغا نے 'ماہ تمام' کا مطلب پوچھا کہ کیا یہ کسی چیز کا اختتام

ہے؟ تو پروین نے وضاحت کی کہ اس کا مطلب پورا چاند ہے۔

عجیب بات ہے کہ جناب احمد فراز کی کلیات کے لیے پروین نے ماہ تمام نام تجویز کیا تھا۔ لیکن جب اپنی کلیات چھپوانے کا فیصلہ کیا تو بہت التجا کر کے اپنی کلیات کے لیے یہی نام مانگ لیا فراز صاحب نے یہ نام سن کر کہا تھا میرا فنی سفر ابھی تمام نہیں ہوا لیکن جب یہی نام پروین نے اپنی کلیات کے لیے مانگا تو فراز صاحب اور بھی خفا ہوئے۔ احمد فراز کے مطابق:

> ''بھلا تمہاری عمر یا فنی سفر کی اس لفظ کے مفہوم سے کیا مناسبت ہے؟ تم تو ابھی شعری سفر کی پُر بہار مہکتی صبح کی مانند ہو۔ جس نے ابھی بہت سے انمول غنچے کھلانے ہیں۔ تم تو ابھی ادھ کھلی کلی کی مانند ہو۔ جس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھول بن کر کھلنا ہے۔ اور اردو ادب کے دامن کو تابدار کرنا ہے'' [1]

بہت سے حالات و واقعات غیر ارادی طور پر ہم سے سرزد ہوتے رہتے ہیں بعد میں پتہ چلتا ہے کہ موقع محل کی مناسبت سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوئے تقدیر کے فیصلے کتنے صحیح تھے۔ اس طرح 'ماہ تمام' سچ مچ چاند کے عروج کے بعد زوال کی علامت بن کر سامنے آئی کیونکہ یہ ان کی زندگی کی آخری کتاب ثابت ہوئی۔ ۱۹۹۴ء کے وسط میں یہ کتاب چھپ کر سامنے آئی۔ مظہر الاسلام نے اس کتاب کا سرورق تیار کرایا۔ پہلی ۵۰۰ کاپیاں وہ اپنے ساتھ دبئی لے گئیں وہاں انھوں نے ''جشنِ محشر'' میں شرکت کی۔ پروین کی شاعری کے دلدادہ قطاروں میں کھڑے ہو کر اس کتاب کو خریدنے کے مشتاق نظر آرہے تھے جبکہ ایک سو کاپیاں اپنے دوست احباب کو اپنے دستخطوں کے ساتھ دیں۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے دو سال تک انھیں برطانیہ میں ہی قیام کرنا تھا۔ باہر جانے کے

---

[1] مضمون ''گیتو کی گیتا'' مصنف انوار شریف بشمولہ 'خوشبو کی ہمسفر'، ص: ۴۰۸، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش

خیال سے وہ کافی فکر مند تھیں۔ کیونکہ اب والد کے انتقال کے بعد اب والدہ کا خیال رکھنا ان کی ذمہ داری تھی۔ وہ ان کی آنکھوں کا آپریشن کرانا چاہتی تھیں۔ اس لیے انگلینڈ جانا فی الحال ایک سال کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظر تھا۔ اس وقت وہ اسلام آباد میں کسٹم اینڈ ایکسائز کے محکمے میں بحثیت ڈائریکٹوریٹ آف انسپکشن اینڈ ٹریننگ کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ ان کا اور ان کی سہیلی پروین قادر آغا کے دفاتر ایک ہی عمارت میں تھے دونوں کی روز ہی ملاقات ہو جاتی تھی۔

۲۰ نومبر ۱۹۹۴ء کو پروین نے بڑے اہتمام سے گیتو کی سالگرہ منائی اس کے دوستوں مدعو کیا گیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ چونکہ اب وہ بڑا ہو گیا ہے اس لیے یہ اس کی آخری سالگرہ ہے۔ ۲۴ نومبر کو ان کی اپنی بیالیسویں سالگرہ تھی اور بی بی سی نے ان کی سالگرہ کا تذکرہ کیا تھا۔ طارق عزیز شو جو کہ پاکستان ٹیلی ویژن کا بہت ہی مقبول پروگرام ہے۔ یہ پروگرام متحدہ عرب امارات میں منعقد ہو رہا تھا پروین وہاں بھی شرکت کے لیے گئیں۔ ایک اور پروگرام ''مخزن'' کی کمپیرنگ کی۔

پروین قادر آغا کے بھتیجے کی شادی میں شرکت کے لیے ۱۸ دسمبر لاہور گئیں اور ۲۳ دسمبر کو نئے شادہ شدہ جوڑے کو اسلام آباد دکھانے پر مدعو کیا۔ جس میں ان کی دوسری قریبی سہیلی رفاقت بھی تھیں رات گئے تک وہ لوگ کلب میں خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ اس دن وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ ۲۵ دسمبر کو چھٹی تھی بہت خوشگوار دن تھا۔ تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ شام کو بارش ہوئی۔ پروین نے رفاقت سے زیورات لیے ہوئے تھے رات کے دس بجے رفاقت کو واپس کرنے کے لیے مراد کے ساتھ گئیں۔ رفاقت کی پیار بھری سرزنش کے جواب میں کہا کہ زندگی کا کیا بھروسہ۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کا دن ان کی زندگی کا آخری دن تھا دیر سے اٹھیں ناشتہ تیار کیا اور دفتر جانے کی تیاری کرنے لگیں اور اپنے ڈرائیور یوسف کے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اسلام آباد کو پھولوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہ شہر اپنی خوبصورتی اور شادابی کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ پروین دفتر جانے کے لیے مرگلہ روڈ کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھیں۔ پہاڑی سلسلوں کو دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم تھیں اس بات سے بے خبر کہ تقدیر ان کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے جارہی ہے۔ مرگلہ روڈ اور فیصل ایونیو کے بیچ میں ایک تیز رفتار بس نے ان کی گاڑی کو زور سے ٹکر ماری اور اسے گھسیٹتی ہوئی دور تک لے گئی۔ ہسپتال میں پروین نے زندگی کی آخری سانسیں لی۔ شہر سخن کی شہزادی گلستانِ ادب کو سونا کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راہی ملک عدم سدھاریں۔ آخری رسومات پروین قادر آغا کے گھر انجام دی گئیں۔ زندہ تھی تو تب بھی ان کی محبتوں کے حصار میں تھی مرنے کے بعد بھی ان کی پناہوں میں رہیں وہ اسلام آباد کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔

؎ رونقِ محفل و بازار کم نہیں آج بھی
سانحہ مگر کوئی اس شہر میں ہونے کو ہے

؎ اپنے انجام تک آ گئی زندگی
یہ کہانی مگر اختلافی رہی

؎ میں خاک کو خاک پہ چھوڑ آئی ہوں
رضائے الٰہی کی تکمیل کردی

''کفِ آئینہ'' پروین شاکر کے انتقال کے بعد چھپنے والی ان کی آخری شعری کتاب ہے جسے پروین کی باقیات بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کا نام ان کا خود تجویز کردہ ہے وہ اپنی حادثاتی موت سے پہلے اس مجموعے کو ترتیب دے رہی تھیں لیکن انھیں کاتب تقدیر نے مہلت نہ دی۔ اس کتاب کا مواد ان کی مختلف ڈائریوں اور بیاضوں کے ذریعے پروین قادر آغا تک پہنچا اور انھوں نے اسے پروین

شاکر ٹرسٹ کے زیر اہتمام شائع کرایا۔ اور اس طرح پروین کے تئیں اپنی محبت اور خلوص کا حق ادا کر دیا۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مظہر الاسلام، امجد الاسلام اور ڈاکٹر توصیف تبسم نے بھی تعاون فراہم کیا۔ 'کفِ آئینہ' کی شاعری تک پہنچتے ہوئے پروین کی زندگی کا سفر اپنے اختتام تک جا پہنچتا ہے۔ اس لیے اس کتاب کی شاعری ملے جلے احساسات سے عبارت ہے۔ کہیں تو اجتماعی دکھ درد کا کرب سموئے ہوئے ہیں اور کہیں اپنی ذات کی طرف متوجہ نظر آتی ہیں۔ عمر رواں کے گریز پا لمحات غم کی سوغات ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ اس لیے کچھ کھونے کا احساس پایا جاتا ہے۔ یاسیت، تھکن اور درد و غم کی لہریں اس دور کی غزلوں اور نظموں میں موجزن ہیں۔ ایک طرح کی اداسی اور خلا کا احساس جاگزیں ہے۔ زندگی سے شکوے شکایتیں بھی ہیں۔ اور کہیں کہیں محبت سے بھرپور پرانا شہد آگیں لہجہ دوبارہ سنائی دیتا ہے۔ اور کہیں اجتماعی کرب کا احساس بھی ہے زندگی کے تلخ حقائق، جمہوری قدروں کی پامالی زر پرست معاشرے میں پائی جانے والی منافقت 'کفِ آئینہ' کا موضوع ہے۔ کئی غزلیں اور نظمیں ایسی ہیں جو گذشتہ مجموعوں میں چھپ چکی ہیں۔ اس کتاب میں دوبارہ شامل ہوئی ہیں۔ زندگی و تقدیر سے شکوے شکایت کے باوجود وہ اچھے دنوں کی آس بھی ہے۔ شاعرہ کو یقین ہے کہ یہ تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور ایک درخشاں صبح نمودار ہوگی۔ جس سے رجائیت کا احساس بھی ملتا ہے اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'کفِ آئینہ' میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کا سنگم پایا جاتا ہے۔

ے رات کو مان لیا دل نے مقدر لیکن
رات کے ہاتھ پہ اب کوئی دیا چاہتا ہے

کفِ آئینہ، ص:۳۹

؎ آستینوں میں چھپائے ہوئے ہر اِک خنجر
اور گفتار کی بابت میں سب قندو نبات

؎ جینے کا حوصلہ نہیں رُکنا محال کردیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھے نڈھال کردیا

؎ روز اِک دوست کے مرنے کی خبر آتی ہے
روز اِک قتل پہ جس طرح کہ مامور ہے رات

؎ مجھے تیری محبت نے عجب اِک روشنی بخشی
میں اس دنیا کو پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں[1]

شعروشاعری کے علاوہ پروین شاکر نے کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔کینیڈا میں رہائش پذیر ایک پاکستانی بیدار بخت صاحب نے پروین کی کتاب ''خودکلامی'' کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو پروین نے بھی اس سلسلے میں ان کی مدد کی اس طرح ''خودکلامی'' کا ترجمہ Taking of oneself کے نام سے ایک کتاب تیار ہوگئی۔لیکن یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکی۔

بمبئی میں رہنے والی ایک سولہ سالہ لڑکی'' گیتا انجلی'' بہت چھوٹی عمر میں کینسر میں مبتلا رہنے کے بعد مرگئی۔اس بیماری کے دوران زندگی اور موت کی کشمکش میں گیتا انجلی نے انگریزی میں دوسو نظمیں لکھیں جن کا دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔اس بچی نے نظم ونثر کی صورت میں موت کے اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدم دیکھ کر اپنے محسوسات کا اظہار کیا ہے۔بسترِ مرگ پر لکھی ہوئی ان تحریروں میں اس قدر درد چھپا ہوا ہے کہ پروین کی حساس طبیعت کو یہ شاعری بہت پسند آئی وہ اس

---

[1] کفِ آئینہ،ص:۲۷و۵۵

سے بہت متاثر ہوئیں۔ان کا کہنا تھا کہ اتنی کم عمری میں زندگی کی اتنی تڑپ انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔موت سے لڑتے ہوئے گیتا انجلی کی شاعری قلب و ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔نظموں کا ترجمہ پروین شاکر نے کیا ہے جبکہ ڈائری کا ترجمہ احمد سلیم نے کیا ہے۔ جب یہ کتاب ''گیتا انجلی البم'' کے نام سے چھپ کر آئی تو اس وقت وہ خود موت سے ہم آغوش ہو چکی تھیں۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ پورے عالمی ادب میں سے پروین نے گیتا انجلی کی شاعری ہی کو ترجمے کے لیے منتخب کیا اور انھیں اس کی موت سے متعلق شاعری ہی پسند آئی۔اور خود بھی اپنی شاعری میں وہ اکثر و بیشتر جگہوں پر موت کا تذکرہ کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس سے وہ بے حد متاثر تھیں۔ان کی شاعری میں اس کا جابجا اظہار ملتا ہے۔اس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ بھرپور جوانی میں زندگی اور اس کے حسن کی عاشق شاعرہ کا رنگ و بو کی دنیا میں رہتے ہوئے موت کے ذائقے کو محسوس کرنے کی خواہش کرنا اسی کھوج میں رہنا کہ زندگی کی سرحدوں کے اختتام کے بعد کی دنیا کے اسرار و رموز کیا ہوں گے۔گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی عمر ڈھلنے کا احساس، دنیا کی بے ثباتی کو شدت سے محسوس کرنا، یہ سب باتیں موت کے حقائق و معنی کی وسعتوں سے آگہی کے متعلق غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔جس کے بعد وہ موت کی اصل حقیقت کا وجدان حاصل کر لیتی ہیں۔ جہاں موت موت نہیں رہتی بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز بن جاتی ہے وہاں زندگی ابدی مسرتوں سے بھرپور ہے وہاں دُکھ کے سائے نہیں وہاں حسن کو زوال نہیں۔اس موضوع سے متعلق یہ اشعار ان کی دلچسپی کے عکاس ہیں۔

ے موت کا ذائقہ چکھنے کے لیے
دو گھڑی کے لیے ذرا مر کر دیکھوں

ے کھول دیں زنجیر دراور حوض کو خالی کر دیں

زندگی کے باغ میں اب سہ پہر ہونے کو ہے

اپنی بیالیس سالہ مختصر سی زندگی میں پانچ شعری مجموعے تخلیق کر کے بین الاقوامی شہرت پانے والی شاعر کی پہچان اور وجہ مقبولیت شاعری ہی ٹھہری لیکن بہت کم جانتے ہیں کہ وہ نثر کے میدان کی بھی شہسوار تھیں۔انھوں نے کئی ڈرامے،افسانے اور مقالے تحریر کئے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی پانچوں کتابوں کے دیباچوں میں بے مثال نثری نمونے ملتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں اپنے اظہار کے راستے خود بخود تلاشتی رہتی تھیں۔طالب علمی کے زمانے ہی سے انھیں حالات حاظرہ کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی حالات و واقعات سے گہری دلچسپی تھی ایک حساس ذہن رکھتے ہوئے اپنے آس پاس رونما ہونے والے حالات و واقعات سے گہرا اثر لیتی تھیں۔ چونکہ وہ سیاسی بصیرت رکھتی تھیں اس لیے ان کی اپنی ایک رائے اور اپنا ایک نقطۂ نظر تھا اور وہ چاہتی تھی کہ اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کریں۔اس مقصد کے لیے ''گوشۂ چشم'' کے عنوان سے کالم نگاری کا آغاز کیا۔ یہ کالم ان کے انتقال تک چھپتے رہے۔ان کالموں کے ذریعے ان کی سیاسی بصیرت، بلند نگاہی اور اہل وطن کے لیے ان کی دردمندانہ جذبات کا اظہار ملتا ہے۔آخری کالم ان کی موت کے دوسرے دن شائع ہوا جو اتفاقاً اس جملے سے شروع ہوتا ہے۔

''موت برحق ہے لیکن مشاعرہ پڑھتے ہوئے جاں بحق ہونے کا ہمیں کوئی شوق نہیں۔ پھر اگر یہ پتہ ہو کہ گولی ہمارے ہی نام کی ہے تو ادب کے نام پر جامِ شہادت نوش بھی کرلیں۔پھر کیا پتہ مشاعرے کے بعد گھر بھی پہنچ پائیں یا نہیں۔ابھی پچھلے دنوں ایسے ہی ایک مشاعرے سے واپسی پر افتخار عارف اور اظہر عباس ہاشمی دھر لئے گئے۔

''اتنی رات گئے آپ دونوں کہاں جارہے ہیں؟''

''گھر جارہے ہیں۔''

''یہ گھر جانے کا کون سا وقت ہے؟''

''شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے'' افتخار عارف نے اپنے شعر کی مار دینی چاہی۔ اس ظالم نے نہ کسوٹی دیکھی تھی نہ ماہِ دو نیم پڑھی تھی۔ نہ حرفِ باریاب پر ایک سو ساٹھ تبصرے پڑھے تھے بالکل پروفیشنل تھا۔ اور جب اچھی طرح سے اطمینان ہو گیا کہ دونوں دہشت گرد نہیں بلکہ دہشت زدہ ہیں تو جان بخشی کی۔ اس قسم کی ضیافت نیم شب کے متحمل ہم تو نہیں ہو سکتے''![1]

پروین شاکر کے کالموں میں شگفتگی اور قدرتِ اظہار کا سلیقہ پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ معاشرتی شعور بھی ہے۔ ان کی نثر میں دردمندی اور مزاح کا عنصر بھی موجود ہے۔ جو غالب کی نثر سے ملتا جلتا ہے۔ ان کالموں کے عنوانات زیادہ تر فارسی کے برمحل اشعار و محاورات کی صورت میں منتخب کئے گئے ہیں جو کالم کے اندر موجود مواد سے پوری طرح میل کھاتے ہیں اور قاری کو معنی و مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں مثلاً تیمّم آمد، آب برخاست، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، تا ثریا می رود دیوارِ کج ''برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم''۔

ان کالموں سے ان کی طبیعت کی شوخی شگفتگی اور بذلہ سنجی عیاں ہوتی ہے۔ عام زندگی میں اس قدر سنجیدہ کم گو نظر آنے والی پروین اپنے کالموں میں کافی شوخ و چنچل نظر آتی ہیں۔ ان کالموں میں انھوں نے بہت دھیمے لیکن مزاحیہ انداز میں اربابِ اقتدار، اراکینِ پارلیمنٹ، ملکی و غیر ملکی پالیسیوں

---

[1] ''گوشہ چشم'' مصنفہ پروین شاکر، ص:۱۱۶۔۱۱۷، لفظ لوگ پبلی کیشنز اسلام آباد

پر طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ بیروکریٹ افسروں، امیروں، وزیروں کی غلطیوں مفاد پرستیوں کوتاہ نظریوں پر ایسے جم کر وار کرتی ہیں کہ ان کی جملہ بازی کی داد دینی پڑتی ہے۔اس سلسلے میں عطاءالحق قاسمی لکھتے ہیں۔

''میں نے اور امجد نے اُسے جملہ بازی کے ''وومین ونگ'' کا انچارج قرار دے رکھا تھا۔ میں نے اس کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا اور کہا کہ چونکہ تم ایک انتظامی عہدے پر بھی فائز ہو لہٰذا وزیروں، مشیروں اور بیوروکریسی کو چٹکیاں لینا تمھیں ویسے بھی مہنگا پڑے گا لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ کالم نگاری کے شوق سے تائب ہو جاؤ۔ میری اس تقریر کے جواب میں اس نے کہا 'عطا بھائی آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں کالم کیسا لکھ رہی ہوں'۔ میں نے جواب دیا 'زبردشت' اس پر پروین نے ہنستے ہوئے کہا 'اب تو اس شوق سے تائب ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا'۔ چونکہ کالم نگاری کے حوالے سے آپ کی تعریف میرے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے''۔[1]

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ کافی نڈر اور بے باک تھیں۔ اگرچہ اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھیں لیکن حق بات ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کی عادی تھیں۔ اس معاملے میں کسی سے مرعوب نہیں ہوتی تھیں۔

یہاں پروین شاکر کے ایک کالم کا کچھ حصّہ نمونے کے طور پر دیا جاتا ہے۔ جس کا عنوان ہے ''مقطع میں آ پڑی ہے، سخن گسترانہ بات''۔اس کالم میں پاکستان میں این جی اوز کی بہتات اور ان کی ناقص کارکردگی این جی اوز کے سربراہوں کی مفاد پرستی اقرباء پروری پر طنز ان الفاظ میں

---

[1] مضمون ''خوشبو کا سفر'' مصنف عطاءالحق قاسمی بشمولہ ''خوشبو کی ہمسفر'' ص:۴۳۹

کرتی ہیں۔

’’لگتا ہے ڈاکٹر شیر افگن نیازی کو اپنی وزارت سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ این جی اوز کو نکیل ڈالنا چاہتے ہیں۔ نیازی صاحب شیر افگنی ہی کرتے تو ٹھیک تھا۔ وہ تو شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے جا رہے ہیں۔ اور ایک ادھ شیر ہو تو شاید نمٹ بھی لیں۔ دس ہزار تو رجسٹرڈ ہیں۔ غیر رجسٹرڈ کی تعداد تو شاید آئی۔ ایس۔ آئی کو بھی نہیں معلوم ہو گی۔ اس لیے عوام کی محبت سے نڈھال، فائیو سٹار ہوٹلوں میں سیمینار منعقد کراتی ہوئی اسی بالکل نئی کلاس کی تنخواہ براہ راست فارن ایکسچینج میں غیر ملکی فنڈ سے آتی ہے! اس جیٹ سیٹ کراوڈ سے ڈاکٹر صاحب کے بنیادی طور پر تین مطالبات ہیں۔ خود کو رجسٹر کرائیں۔ اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کریں۔ اپنا حساب دکھائیں۔ ہم این جی اوز کے اس خیال سے بالکل متفق ہیں کہ مطالبات کی آخری شق سب سے زیادہ نامعقول ہے۔ جھگڑا بھی سارا اِسی کا ہے۔ اسلام آباد ہی کے ایف سیون میں ایک ہی گھر میں سماعت، بصارت، گویائی اور ذہنی کمزوری سے متعلق چار این جی اوز بیک وقت کام کر رہی ہیں۔ فہرست کے مطابق اس شہر خوبی میں انجمن پھل فروشاں اور انجمن کباڑیاں انجمن ڈیرہ غازی خاں بھی ہے۔ ہمیں سمجھ نہیں آتا یہ این جی اوز اور دارالحکومت میں کیا کر رہی ہیں۔ یہ عجیب ڈونرز ہیں کہ انھیں اپنے پیسے کے ضیاع کی مطلق فکر نہیں۔ شمالی علاقہ جات میں پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ کرنے اور ان کے جام بنانے کے ایک پروجیکٹ پر دو لاکھ ڈالر خرچ کیے گئے۔ تین برس میں جا کر جام کی بیس بوتلیں تیار ہوئیں اور پھر سارے گاؤں میں بطور تبرک بانٹ دی گئیں۔

ہماری ہونہار صحافی سمیرا اسلم کو اعتراض ہے کہ اتنا سا جام بنانے میں تین سال کیوں لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سمیرا بی کو امورِ خانہ داری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک سال تو سیب کا چھلکا اتارنے میں لگ گئے۔ دوسرے سال اُسے ابالا کیا تیسرے سال شیرہ ڈالا گیا۔ غالباً سال کے اختتام پر لیمن کا رس ڈالا گیا۔ ہمارے حساب سے تو یہ سال بھر پہلے بن گے۔ یہ پورا عرصہ لیمن کا رس نکالنے میں بھی تو صرف ہو سکتے ہیں۔ ساری دنیا میں ہاتھ کا کام اتنی ہی دیر سے ہوتا ہے''۔[1]

ان کا کالموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان شستہ ہے۔ اس میں پختگی ہے انداز بے باکانہ ہے۔ ان میں روانی ہے۔

'گوشہ چشم' پچیس کالموں پر مشتمل ہے۔ جو طنز وطرافت سے بھر پور ہیں۔ ایک قاری پر پروین کے عہد کے سیاسی سماجی اور ثقافتی پس منظر کو واضح کرتے ہیں۔ ان کی ایک مداح رفعت حیدر نے بہت عرق ریزی سے جمع کئے ہیں۔ یہ کالم زبان، اسلوب معیار اور مواد کے لحاظ سے اعلیٰ نثری نمونوں میں شمار ہوتے ہیں۔ خاص وعام میں مقبولیت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی موت کے بعد اس کتاب پر ایوارڈ بھی دیا جا چکا ہے۔

پروینؔ شاکر کی زندگی کے حالات و واقعات جاننے کے بعد ان کی شخصیت کے چند چیدہ چیدہ پہلو نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ کافی کم گو سنجیدہ اور لیے دیے رہنے والی شخصیت تھیں۔ لیکن بعض حالات و واقعات اور ان کی تحریروں کے تناظر میں ان کی شخصیت کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی طبیعت میں معصومیت و سادگی کے ساتھ ساتھ شوخی و شرارت بھی بہت زیادہ

---

[1] ''گوشہ چشم'' مصنفہ پروین شاکر، ص: ۹۷-۱۰۲، لفظ لوگ پبلی کیشنز، اسلام آباد

تھی جو تقدیر کی ستم ظریفیوں کی وجہ سے کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی۔ سنجیدگی و اداسی کے اس خول سے کبھی کبھار وہ باہر نکلتی تھیں تو پہلے جیسی شوخ اور معصوم پارہ بن جاتی تھیں۔ ان کے کزن ڈاکٹر ناظم جعفری ان کے اس پہلو سے متعلق لکھتے ہیں۔

''جب وہ بنارس آئی تھی تو اس نے مانس مندر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی مجبوراً مجھے لے کر جانا پڑا۔ ہندو میتھالوجی اور کلچر سے متعلق مختلف انداز کی جھانکیاں بڑی خوبصورت تھیں۔ وہ مندر بچوں کی دلچسپی کا خاص مرکز ہے۔ مگر پروین بھی کسی بچے سے کم نہیں نظر آ رہی تھی ایک ایک جھانکی کو دیکھ کر وہ خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کے ذہن میں کیا تھا''۔ [1]

ان کے متعلق عام طور پر یہ تاثر بھی ہے کہ وہ مغرور تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی کم گوئی کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہو۔ کیونکہ ان کی شخصیت میں متانت ٹھہراؤ اور خود اعتمادی تھی۔ جو لوگ ان کے قریب رہ چکے ہیں وہ ان کی محبت و خلوص اور ان کی عاجزی و انکساری کو بہت سراہتے رہتے ہیں۔ بہت بڑے عہدے پر فائز تھیں۔ دفتری معاملات میں سخت گیر سہی لیکن دوستوں کے درمیان خلوص و وفا کر پیکر اور نرم خو تھیں۔ اپنے سے بڑے اور اپنے معاصر شعراء کا بہت احترام کرتی تھیں۔ اس قدر مشہور شخصیت ہونے کے باوجود ان کی طبیعت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عطاء الحق قاسمی کے مطابق جب وہ لوگ ادیبوں کے قافلے کے ہمراہ عوامی جمہوریہ چین گئے تو بیجنگ میں پروین نے قاسمی صاحب کو اپنی قمیض استری کرتے دیکھا تو فوراً ہی قمیض جھپٹ لی اور کہا کہ عطاء بھائی بہن کی موجودگی میں بھائی یہ کام کرتے اچھے نہیں لگتے ہیں۔

---

[1] ادبی ماہنامہ آجکل، نئی دہلی ستمبر ۱۹۹۴ء، ص: ۵

پروین کے خطوط بھی ان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ کیونکہ خطوط فرد کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ کسی شخصیت کی ذاتی زندگی ذہنی کیفیات ورجحانات اور اس عہد کے سماجی حالات کو جاننے کا اہم وسیلہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے امجد اسلام امجد، نظیر صدیقی، اور سب سے زیادہ خطوط احمد ندیم قاسمی کو لکھے ہیں۔ قاسمی صاحب ان کے لیے باپ کی حیثیت رکھتے تھے ان کی ہر معاملے میں رہنمائی کرتے تھے۔ امجد اسلام امجد نے پروین کو اپنی بہن بنایا ہوا تھا۔ غالب کے خطوط کی طرح باوجود زندگی کی تلخیوں اور سخت کوشیوں کے بعض خطوط میں ظرافت و شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ خطوط بہت اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ امجد اسلام امجد کو لکھتی ہیں۔

''کوثر کو امانتیں میرے پاس رکھی ہیں۔ ان کی باران کی ادائیگی سخت ضروری ہے۔
آپ کے سر پر بال پہلے ہی بہت کم رہ گئے ہیں''۔[۱]

ایک اور خط جس میں پروین کی خوش مزاجی اور شگفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔

''اور کچھ نہیں چاہتی بجز اس کے کہ آپ لکھتے اور پڑھتے رہیں اور ہمیں مزے مزے کے ڈرامے دیکھنے اور سننے کو ملتے رہیں''۔[۲]

وہ بہت دردمند دل رکھتی تھی۔ دوسروں کے دکھ درد کو شدت سے محسوس کرتیں۔ اور بغیر کسی تصنع و بناوٹ کے دوسروں کی دلداری کرتیں۔ احمد ندیم قاسمی کی اہلیہ کی وفات پر اپنے عمو کے غم کا احساس کر کے اپنی دلی جذبات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں۔

''یہ جان کر انتہائی دکھ ہوا کہ آنٹی اب ہم میں نہیں رہیں۔ آپ کا اور ان کا طویل

۱اور۲ مکتوب نگاری مصنفہ عالیہ جلیل بشمولہ ''خوشبو پھول تحریر کرتی ہے'' مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، ص:۲۳۴۔۲۳۵

ساتھ تھا۔اب آپ بالکل تنہا ہوں گے خدا آپ کو صبر دے۔آپ کے ساتھ نعمان اور دلہن ہوں گے۔بچوں سے ذرا تقویت رہے گی۔بحر حال آپ کی تنہائی آپ کی تنہائی ہے۔کاش میں اس وقت پاکستان میں ہوتی تو آپ کی کچھ ڈھارس بندھا سکتی''۔[1]

آس پاس کسی عزیز یا واقف کار کی موت ہو جاتی تو وہ حد سے زیادہ اس کا اثر لیتی تھی وہ افسردہ ہو جاتی تھیں۔نظیر صدیقی کے نام ایک خط میں اپنی خالہ کی بیماری اور اپنے دوست ٹوٹو کی موت کا اس طرح اظہار کرتی ہیں۔

''میری پیاری خالہ جنھوں نے مجھے ماں کی طرح پالا تھا کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہی ہیں۔ٹوٹو میرا آٹھ برس کا دوست گلے کے زخم میں مبتلا ہو کر چل بسا۔اور شاید انہی سب باتوں کی یلغار نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ اچانک آپینڈکس کا درد تھا لیکن فوراً ہی آپریشن ہو گیا''۔[2]

خدا نے انھیں سب کچھ بہت فیاضی سے عطا کیا تھا۔لیکن اس کے باوجود ایک ادھورے پن کا احساس ایک کرب و اداسی اور بے سکونی کی کیفیت بھی ان کی شخصیت میں شامل تھی۔جو ان کی ازدواجی زنگی میں ناکامی کا پیش خیمہ تھی۔انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ اپنے ذہن کی بدولت سکون اور چین سے محروم رہی ہیں شاید جنئیس (Jenius) لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہو۔ان کے کزن ان سے ملنے ان کے گھر اسلام آباد گئے گھر اور ڈرائنگ روم کی تزئین و آرائش دیکھ کر پوچھا کہ پروین تم

---

[1] مکتوب نگاری مصنفہ عالیہ جلیل بشمولہ ''خوشبو پھول تحریر کرتی ہے'' مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش،ص:۲۳۷

[2] پروین شاکر کے خطوط' نظیر صدیقی کے نام' مرتبہ جاوید وارثی،ص:۱۸

خوش تو ہو؟ ان کا جواب تھا کہ ظاہری طور پر جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب سچ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اندرونی دکھ کو ظاہری زیب و زینت اور مسکراہٹ کے پردے میں چھپاتی رہیں۔ لیکن اپنی زندگی کے اس المیے کو کبھی بھی اپنی معاشرتی یا پیشہ ورانہ زندگی پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

پروین کی قریبی سہیلی رفاقت بھی شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتی تھیں مگر انھیں افسوس تھا کہ شادی کے بعد انھیں اپنے اس شوق سے دستبردار ہونا پڑا۔ لیکن پروین ہمیشہ رفاقت کو یہ سمجھاتی رہتی تھیں کہ تم گھریلو خاتون بن کر ایک مکمل زندگی گزار رہی ہو۔ اس لیے تم مجھ سے بہتر ہو۔ جبکہ وہ خود سب کچھ ہو کر بھی ایک ادھورے پن کے ساتھ تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

پروین اکثر و بیشتر کامرہ رفاقت کے پاس چھٹیاں گزارنے چلی جاتیں۔ کامرہ پاکستان میں ایک صحت افزاء مقام ہے۔ پروین اپنی عیدیں بھی وہیں گزارتیں اور رفاقت کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ ہمیشہ عید کا جوڑا ان کے لیے تیار رکھتیں۔ پروین رفاقت کو ڈانٹتیں کہ سہاگنیں عید کے کپڑے پہنے ہوئے اچھی لگتی ہیں جو وہ نہیں ہیں۔

یہ سب باتیں ان کے وجود میں موجود خلا، ویرانی کو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے اور ماضی میں اپنے کیے ہوئے فیصلے سے مطمئن نہیں تھیں۔ وہ اپنے بیٹے مراد کو بہت چاہتی تھیں۔ اس کے مستقبل کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند تھیں۔ وہ اُسے نیورو سرجن بنانا چاہتی تھی وہ ازراہ مذاق اپنے بیٹے سے کہتی تھیں کہ اس کا ایک مریض تو اس کے گھر میں موجود ہے۔ اپنے بیٹے کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتیں اس کے لیے خود کھانے بناتیں۔ جب مراد چودہ برس کا ہوا تو سید مراد علی کے نام کی تختی ان کے گھر پر جگمگانے لگی۔ وہ بہت زیادہ پر اعتماد دکھائی دیتی تھی۔ ان کے مطابق جب ایک لڑکا جوان ہوتا ہے تو اس کی ماں مضبوط تر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو ایک رات کے لیے بھی تنہا نہیں

چھوڑتی تھی۔افسوس کہ گیتو سے متعلق اپنے تمام خواب ادھورے چھوڑ کر جانا پڑا کہ انھیں عدم کے دیس سے بلاوا بہت جلدی آ گیا وہ تو چلی گئی لیکن ان کی شاعری ہمیں ہر پل ان کی موجودگی کا احساس دلاتی رہے گی۔ان کی خوشبو،خود کلامی،صد برگ،انکار اور کفِ آئینہ، ماہ تمام بن کر آسمانِ ادب پر جگمگاتی رہیں گی۔جس سے ہم انھیں اپنے پاس محسوس کرتے رہیں گے۔ان کا یہ شعر جوان کے قبر پر کنندہ ہے واضح کرتا ہے کہ وہ شعری دنیا میں ہمیشہ زندہ وجاوید رہیں گی وہ اپنے اعلیٰ فکر و شعری شعور سے دنیائے ادب کو منور اور معطر کرتی رہیں مرنے کے بعد جس جگہ آسودہ خاک ہوئیں اسے بھی اپنی قسمت پر ناز کرنے کا حق حاصل ہو گیا بقول پروین:

ہر ذرہ جیسے آئینہ بردوش ہوگیا
یہ کون تھا جو خاک میں روپوش ہوگیا

اِک شخص کیا گیا کہ بھرا شہر دفعتاً
بے حوصلہ و بد دل و کم کوش ہوگیا

باب دوم

پروین شاکر کی نظم نگاری

(الف)　　اردو میں نظم نگاری کا منظر نامہ

(ب)　　پروینؔ شاکر کی نظمیہ شاعری

اردو نظم نگاری کی روایت ایک مستقل اور تفصیل طلب موضوع ہے اِس موضوع پر پروفیسر حامدی کشمیری، وزیر آغا، سلیم احمد اور وہاب اشرفی سے لے کر کوثر مظہری تک نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن چونکہ میرے مقالے کا موضوع پروین شاکر کی شاعری ہے اور پروین شاکر نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھی ہیں اِس لئے پروین شاکر کی نظم نگاری کے امتیازات کا اُن کے عہد تک کی اُردو نظم نگاری کی خصوصیات سے رشتہ قائم کرنے کی غرض سے میں نے اپنے مقالے کے اِس باب میں اُردو نظم نگاری کی روایت کا اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ پروین شاکر کی نظم نگاری ماقبل کی نظم نگاری سے کس حد تک مشابہت کا رشتہ رکھتی ہے اور کہاں کہاں انھوں نے زبان، موضوع اور نظریات کے حوالے سے اجتہاد سے کام لیا ہے۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک کو نثر کہتے ہیں جبکہ دوسری کو نظم یا شاعری۔

جس تحریر میں ردیف، قافیہ، بحر اور اوروزن ہوتا ہے اُس تحریر کو نظم شاعری کہتے ہیں۔ لیکن جس کلام میں ردیف، قافیہ، بحر اور وزن نہیں ہوتا اُسے نثر کہتے ہیں۔ اِس لئے نظم اور نثر کا فرق واضح کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ ’’کلام موزوں شعر ہے اور کلام غیر موزوں نثر ہے‘‘۔ شاعری کو بھی

مطالعہ کی آسانی کے لئے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک کو نظم کہتے ہیں اور دوسری کو غزل۔ نظم اور غزل دونوں اُردو شاعری کے ستون مانے جاتے ہیں اور دونوں ہی ہمہ گیر مقبولیت کے حامل ہیں ''نظم'' یہ عربی اصطلاح اُردو میں فارسی کے توسط سے پہنچی ہے جس کے معنی ہیں پرونا، آراستہ کرنا، موتیوں کو تاگے میں پرونا، لڑی، انتظام، بندوبست یا کلامِ موزوں وغیرہ ویسے تو غزل کے سوا ہر موزوں کلام کو نظم کہہ سکتے ہیں لیکن اصلاً نظم سے مراد وہ شعری صنف ہے جس میں کسی موضوع پر ربط و تسلسل کے ساتھ خیالات کا اظہار کیا جائے یعنی جس میں کوئی قصہ، کوئی تجربہ یا کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ نظم میں ہر شعر معنوی اعتبار سے دوسرے شعر سے وابستہ ہوتا ہے۔ اِس لئے نظم میں موضوع کے اعتبار سے وحدت ہوتی ہے گویا نظم کی بنیادی صفت وحدت اور خیالات کا تسلسل ہے۔ نظم کی اِس بنیادی صفت کے بارے میں آل احمد سرور یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

> ''نظم کی مثال ایک دریا کی سی ہے جس میں طرح طرح کے نشیب و فراز ہیں کہیں وہ چٹانوں کا سینہ چیر کر نکلتا ہے تو کہیں میدانوں میں متانت اور وقار کے ساتھ بہتا ہے لیکن دریا میں ایک تسلسل اور وحدت ہوتی ہے''۔[1]

شاعری کی دیگر اصناف قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور رباعی وغیرہ بھی سوائے غزل کے نظم کے دائرے میں شمار ہوتی ہیں۔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور رباعی وغیرہ خاص موضوعات کے لئے مخصوص ہیں اور زمانہ قدیم میں یہ اصناف مقبول رہی ہیں موضوع کے علاوہ ہیئت یعنی مصرعوں اور بندوں کی ترتیب کے اعتبار سے بھی دورِ قدیم میں مسدس، مخمس، ترجیع بند جیسی اصناف و اسالیب رائج رہیں اِس اصناف کے مخصوص اصول و ضوابط تھے جن پر شاعروں کو سختی سے عمل کرنا پڑتا تھا وہ اِن اصناف کے

---

[1] جدید نظم کی ہیئت و تشکیل ایک مباحثہ جدید نظم نمبر سوغات ص:۱۹۱، بنگلور)

مخصوص اصول وضوابط کے پابند رہ کر ہی اِن پر طبع آزمائی کرتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں سیاسی، سماجی، تعلیمی اور تہذیبی سطح پر کافی تبدیلیاں عمل میں آئیں جدید خیالات کا ظہور ہوا تو نظم کی پرانی اصناف میں بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی اس طرح جدید نظم کا آغاز ہوا۔

جدید نظم ایک داخلی صنف ہے یعنی شاعرانہ تجربے کی داخلی پیش کش جدید نظم کی صورت ہے۔ یہ شاعر کے انفرادی ردِعمل کا اظہار ہے اِس میں شاعر کا تخیل، جزبہ، احساس، سوز وگداز اور اُس کی حسی کیفیات کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے جو انسان کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جدید نظم جدید ذہن سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے کیونکہ جدید دور کا انسان طرح طرح کی الجھنوں، پریشانیوں اور اضطراب وکشمکش کا شکار ہے۔ اِس طرح جب شاعر داخلی تجربات کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالتا ہے تو نظم سے بہتر کوئی اور صنف کار آمد نہیں ہوسکتی کیونکہ اِس میں وسعت بھی ہے اور لچک بھی۔ پروفیسر حامدی کشمیری جدید نظم سے متعلق یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

''موجودہ تصور کے اعتبار سے 'نظم' ایک مکمل تخیلی یا شاعرانہ تجربے کے فنکارانہ اظہار کا نام ہے۔ شعری تجربہ جب شاعر کی داخلی شخصیت کے آتش خانوں میں تپ کر نکھرتا ہے اور پھر ایک پُر اسرار تخلیقی عمل کے تحت موزوں، حسین اور مترنم الفاظ کے قالب میں اِس انداز سے ڈھل جاتا ہے کہ قاری کا دل ودماغ متاثر ہوئے بغیر نہ رہے تو نظم معرضِ وجود میں آتی ہے۔ نظم کے مختلف اجزاء اور حصے داخلی اور خارجی طور پر نظم کی تعمیر وتشکیل میں برابر کا حصہ ادا کرتے ہیں۔ اجزاء کل کے ساتھ ہم آہنگ ہوجاتے ہیں شاعر کا مشاہدہ، احساس جزبہ، ادراک تخیل، حسیات ایک

مرکب جمالیاتی صورت میں ڈھل جاتے ہیں اور پھر ہیئت کے اعتبار سے ایک تجلّی قاری کے دل ودماغ کے نہاں خانوں میں روشنی کرتی ہوئی گذر جاتی ہے"۔[1]

شاعر اپنے گردوپیش کی تمام اشیاء سے براہِ راست رابطہ قائم کرتا ہے اور پھر اپنے ذاتی خیالات، تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں خارجی اور داخلی دونوں دنیاؤں سے اُسے گہرا تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ اِن دونوں حالتوں کی باہمی آویزش ہی نظم کی صورت ہے بقول وزیر آغا۔

"غزل کل کی جانب سے باہر کو لپکتی ہے لیکن نظم اپنی مکمل انفرادیت کے باعث خارجی زندگی کی جانب سے اجتماعی لاشعور کی طرف آتی ہے۔ غزل کا رخ اندر سے باہر کی طرف ہے جبکہ نظم کا رخ باہر سے اندر کی طرف ہے"۔[2]

خارجی ماحول اور زندگی شاعر کے انفرادی جذبات واحساسات اُس کے مخصوص نظریات جب مربوط طریقہ سے کسی خاص موضوع میں ڈھل جائیں تو نظم کی تشکیل وجود پاتی ہے۔ جو اپنی مکمل ترین صورت میں انفرادیت کا اظہار ہے۔

چونکہ ہمیں یہاں یہ دیکھنے سے غرض ہے کہ نظم نگاری کی ابتداء کہاں سے ہوئی اور موجودہ صورت تک پہنچنے سے پہلے اُسے کن کن مرحلوں سے گذرنا پڑا کیونکہ نظم کا جو ترکیبی تصور ہے اور اُس کی ہیئت جو آج ہے وہ ابتداء میں ایسی نہیں تھی۔ اِس سلسلے میں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں لہٰذا نظم نگاری کی روایت کا ایک اجمالی خاکہ موضوع کے تسلسل کے لحاظ سے پیشِ خدمت ہے۔

---

[1] جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات۔ پروفیسر حامدی کشمیری ص:۱۲۸ اشاعت دوم ۲۰۱۰ء

[2] اُردو شاعری کا مزاج وزیر آغا ص:۳۰۵

پچھلے ایک سوسال کے عرصے میں جدید نظم کو کافی فروغ حاصل ہوا اِس دور میں بھی اگر چہ کچھ شاعروں نے نظم کی قدیم اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن جدید نظم کو قبولِ عام حاصل ہوا۔
غزل اجمال ہے اور نظم تفصیل غزل کا مزاج مشرقی ہے جبکہ نظم کی فطرت میں مغربیت زیادہ ہے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو نظم نگاری کی با قاعدہ ابتداء حاؔلی اور آزاؔد سے ہوتی ہے۔ حاؔلی اور محمد حسین آزاد نے صوبہ پنجاب کے گورنر کرنل ہالرائیڈ کی ایماء پر انجمنِ پنجاب قائم کی تھی حاؔلی اور آزاؔد غزل کے فنی کردار سے مطمئن نہ تھے بلکہ غزل میں سوقیانہ اور مبتذل مضامین باندھے جارہے تھے وہ انھیں قوم کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ چناچہ حاؔلی اور آزاؔد نے شعوری طور پر موضوعاتی نظمیں لکھنے کی شروعات کی اِس ضمن میں اُن کی نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔
تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی طرح نظم کی ابتداء بھی دکن سے ہوتی ہے۔

> ''وزیر آغا نے اُردو شاعری کا مزاج اور جمیل جالبی نے تاریخِ ادب اُردو میں یہی نتائج اخذ کئے ہیں''۔[1]

اور یہ واقعہ ہے کہ دکن میں شاعری کا آغاز صوفیائے کرام نے مذہبی ضرورتوں کے تحت کیا اور اِس کام کے لئے غزل سے زیادہ نظم ہی کارآمد صنف تھی اِن صوفی بزرگوں نے تبلیغ، مذہب اور رشد و ہدایت کے لیے مثنوی کی ہیئت میں مختصر منظومات پیش کیں۔ دکن میں چونکہ بادشاہت کا نظام رائج تھا اُن کی خوشامد کے لیے قصیدے لکھے جاتے تھے اور وہاں اُردو نثر نے بھی کوئی قابلِ ذکر ترقی نہیں

---

[1] تاریخِ ادب اُردو۔ طبع اول ۱۹۷۷، اُردو شاعری کا مزاج مصنف وزیر آغا ص: ۲۱۳

کی تھی چنانچہ داستانیں بیان کرنے کے لیے مثنوی جیسی صنف کو استعمال کیا جانے لگا اور مثنوی کو کافی فروغ حاصل ہوا۔

دکنی نظم بالعموم مرثیہ، قصیدہ، اور مثنوی کی شکل میں وجود میں آئی۔ بظاہر ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے یہ اصناف ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں مگر اپنی خاصیت کے اعتبار سے نظم ہی کے زمرے میں آجاتی ہیں مثنوی تفصیل کا فن ہے اِس لیے نظم ہی کا مزاج رکھتی ہے۔ جبکہ قصیدے میں تشبیب، گریز، مدح اور دُعا کے مختلف مراحل نظم کے ایک ''کل'' کو ہی پیش کرتے ہیں۔ مرثیہ میں ایک طرف تو رزمیہ عناصر کے بیان میں قصیدے کا لہجہ جھلکتا نظر آتا ہے تو دوسری طرف اِس کا مزاج نظم کا سا ہے۔ اِس لیے دکنی دور میں مثنوی، مرثیہ، قصیدہ کی ترویج وترقی دراصل نظم کی ہی ترویج وترقی کے مختلف مراحل ہیں۔

دکنی دور دو حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا دور جسے بہمنی دور کہا جاتا ہے جو کہ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی پر محیط ہے۔[1]

اِس دور میں آذریؔ، نظامی اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز دکن کے مشہور صوفی گزرے ہیں۔ بقولِ نصیرالدین ہاشمی گیسو دراز دکن کے پہلے شاعر قرار پاتے ہیں۔ انھوں نے چند رسالے تصوف کے موضوع پر اور چند نظمیں لکھی ہیں اُن کی نظم ''چکی نامہ'' بارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ تازہ تحقیق کی رو سے گیسو دراز کے والد سید یوسف حسین شاہ راجوؔ کی چند نظمیں بھی ملی ہیں اُن میں ''چکی نامہ'' اُردو کی پہلی نظم قرار دی جاسکتی ہے۔ اُن کی نظموں کا رجحان زیادہ تر اخلاقی وروحانی ہے اُس دور میں عشقیہ داستانیں بھی لکھی گئیں مگر زیادہ تر موضوعات مذہب اور تصوف ہی رہے۔

---

[1] اُردو شاعری کا مزاج وزیر آغا ص:۳۱۴، سیمانت پرکاش دریا گنج، نئی دہلی ۱۹۹۱

دوسرا دور قطب شاہی اور عادل شاہی دور پر مشتمل ہے جو کہ سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی پر محیط ہے۔[1]

بہمنی حکومت کے زوال کے بعد دکن کی سلطنت پانچ آزاد ریاستوں میں بٹ گئی ا۔گولکنڈہ ۲۔ بیجاپور۳۔احمد نگر۴۔ بیڈر۵۔ برار۔ان میں سے دو ریاستیں ادبی اعتبار سے بہت اہم تھیں گولکنڈہ جہاں قطب شاہی حکومت تھی۔ بیجاپور جہاں عادل شاہی حکومت تھی۔ اِن دونوں مرکزوں میں اُردو غزل اور نظم بلکہ پوری اُردو شاعری کا ارتقاء ہوا۔اُس دور میں کافی شعراء نے طبع آزمائی کی مگر نظم کے سلسلے میں محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم عادلؔ شاہ، میراںؔ ہاشمی، غواصیؔ، نصرتیؔ، مقیمیؔ، جنیدیؔ اور سیوک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔وجہیؔ نے عشقیہ داستان ''قطب مشتری''،لکھی غواصیؔ نے سیف الملوک اور بدیع الجمال جبکہ ابن نشاطیؔ نے ''پھول بن'' مثنوی لکھی۔اُس دور میں محمد قلی قطب شاہ پہلا اُردو کا صاحب دیوان شاعر ہے انھوں نے ہر موضوع پر نظمیں لکھی ہیں۔اُن کی شاعری کے دو پہلو خاص ہیں عقیدتی یا مذہبی اور ارضی عشق۔اُن کی شاعری سے اُن کی قوتِ تخیل، فطرت پرستی۔منظر نگاری میں مہارت اور عشقیہ جذبات واحساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔اُن سے پہلے کسی بھی شاعر نے منظر نگاری کی طرف باقاعدہ توجہ نہیں دی قطب شاہ کی شاعری کا ایک بند نمونے کے طور پر دیا جاتا ہے جو انھوں نے ''باغ محمد شاہی'' پر لکھی۔

چمن کے پھول کھلتے دیکھ سکھیاں کا مکھ یاد آیا
سہاتا تھا محمد پھل نمن اُن کا نین سارا

---

[1] اُردو شاعری کا مزاج مصنف وزیر آغا ص:۳۱۵

وسے ناسک کلی چنبا بھواں دوپات ہیں تس کے
بھنور تل دیکھ اُس جاگا ہوا حیران من سارا
سب خوشے واکھ لاکھاں کے ثریا سنبلا ہے جوں
سہے اِس واکھ منڈوا سو جیا انبر کہن سارا[1]

یہ نظمیں ارتقاء گہرائی اور تعمیر کی کمی کے باوجود نظم کی اولین کوشش کے سلسلے میں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ اُس دور کے رحجانات ومعاشرت کے نقشے واضح طور پر اِن نظموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ دکنی شاعری فارسی شاعری کی پیروی میں پروان چڑھی جس کی وجہ سے اِس میں تخلیقی صفات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ شاعری صرف خارجی اشیاء واقعات وتجربات تک محدود رہے۔ اِس میں وارداتِ قلب اور ذات کے اظہار سے گریز کیا گیا ہے۔ ان میں جگ بیتی کا سا انداز ہے۔ شاعر محض داستان گو اور تماشہ بین بن کر رہ گیا ہے۔ عشقیہ شاعری محبوب کی پرستش اور سراپا نگاری تک محدود ہے جبکہ شاعری میں خارجی اشیاء کے ساتھ ساتھ ذاتی محسوسات کا پایا جانا بہت ضروری ہے۔ دکنی شاعری کو تبلیغ اور دیگر مذہبی ضرورتوں کے لیے استعمال کیا گیا اِس لئے دکنی شاعری کو خارجی شاعری قرار دے سکتے ہیں۔ یہ نظمیں نظم کے معیار پر تو پورا اترتی ہیں لیکن اِن میں اعلیٰ شعری صفات مفقود ہیں۔ ۱۷۰۰ عیسوی میں ولی کے سفر دہلی کے ساتھ ہی اُردو شاعری کا نیا دور شمالی ہند میں شروع ہوتا ہے۔ نظم کی کئی اصناف کو وہاں فروغ حاصل ہوا۔ نظم کی ایک صورت مثنوی کا ارتقاء بھی شمالی ہند میں ہوا۔ اٹھاہویں صدی سے ۱۸۵۷ء کے غدر تک کہ درمیانی عرصے میں غزل کے مقابلے میں نظم کسی بھی طرح پست دکھائی نہیں دیتی اُس زمانے میں داخلی محسوسات کے اظہار کے لیے غزل جبکہ خارجی زندگی اور

---

[1] کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ مرتبہ ڈاکٹر زور، ص: ۶۵

خارجی اشیاء کے بیان کے لیے مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ جیسی اصناف میں طبع آزمائی ہونے لگی۔ جس سے نظم ایک خاص فضا میں پابند ہو کر رہ گئی ایک طرف تو نظم ایرانی تقلیدی عناصر سے دامن نہ بچا سکی دوسری طرف ہندوستان میں نظم کا مزاج گیت کے مزاج سے قریب تھا جس کے تحت نظم نے بت پرستی، سراپا نگاری اور پوجا کے رجحان کو اپنایا اور نظم کو خارجی موضوعات کے لیے وقف کر دیا اِس دوران بعض شعراء نے مزاج کے بجائے ہیئت کو اہمیت دی اور مثنوی میں دیگر موضوعات شامل کر کے مثنوی کا دامن کافی وسیع کر دیا۔ یہ دور مثنوی کا دور مانا جاتا ہے اِس سے پہلے اور دکنی دور کے بعد بھی لاتعداد مثنویاں لکھی گئیں ولی کی مثنوی جو شہر سورت کی تعریف میں لکھی گئی۔

''مثنوی در تعریف سورت'' موجودہ شکل میں ایک اچھی نظم کا نمونہ ہے۔ سراج اورنگ آبادی کی ''بوستانِ خیال'' اور آبرو کی موعظتِ آرائش معشوق سے لے کر داغ کی ''فریاد داغ'' وغیرہ دوسو برس کے طویل عرصے میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئیں لیکن اِن مثنویوں میں زیادہ تر تقلیدی عناصر کی بھرمار ہے ایسے میں مثنوی کے روائتی انداز میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں اور داخلی کیفیات و وارداتِ قلب بھی مثنویوں میں قلمبند ہونے لگے۔ ایسے میں مثنوی نظم کے اصل معیار کے قریب تر ہو گئی اُس دور کی مثنویوں میں میر حسن کی ''سحر البیان'' مؤمن کی ''قولِ غمگین'' مرزا شوق کی ''زہر عشق'' اور سید میر اثر کی معاملاتِ عشق اور خواب و خیال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مثنویاں جدید نظم کے قریب تر دکھائی دیتی ہیں۔

میر حسن کی ''سحر البیان'' منظر نگاری، جذبات نگاری سادگی اور جزئیات نگاری میں بے مثال ہے۔ اِس مثنوی کی تصنیف کو دوسو برس گزر چکے ہیں۔ اِس طویل مدت میں کوئی ایسی مثنوی سامنے نہیں آئی جس کو خصوصیات کے اعتبار سے ''سحر البیان'' کے مدِ مقابل پیش کیا جا سکے۔ اِس کے بعد ''

گلزارِنسیم'' بھی لکھی گئی مگر اُس میں وہ خوبیاں موجود نہیں جو ''سحرالبیان'' میں ہیں اُس دور کی زیادہ تر مثنویاں تخیلی فضا کے اردگرد گھومتی ہیں۔ تاہم مرزا شوقؔ کی ''مثنوی زہرِعشق'' بدلتے ہوئے رجحان کی عکاسی کرتی ہے کیونکہ اِس میں تخیلی دنیا سے حقیقت کی طرف آنے کی روش صاف طور پر نظر آتی ہے۔

اُردو نظم کے اِس دور میں قصیدہ، ہجو، مرثیہ، مثنوی اور واسوخت جیسی اصناف کو بہت فروغ حاصل ہورہا تھا۔ یہ معاشی و معاشرتی انتشار کا دور تھا۔ اعلیٰ قدریں رخصت ہورہی تھیں، بادشاہت کا تصور موجود تھا، بادشاہوں کی شان میں قصیدے لکھے جاتے تھے جو مصنوعی اسلوب اور مصنوعی فضا کی پیداوار تھے۔ بادشاہت کے خاتمے کے بعد اِن کا وجود بھی ختم ہوگیا۔ سوداؔ کی بعض ہجوؤں میں نظم کی کچھ خصوصیات ملتی ہیں۔ یہ وہ ہجو ہیں جو شخص حملوں سے پاک ہیں۔ اِن میں قصیدہ ''درہجواسپ'' اور ترپت سنگھ کا ہاتھی'' میں تمثیلی انداز میں اپنے دور کے فوجی نظام کی بدحالی وابتری اور سماجی خرابی و ناہمواریوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہجویات کے ساتھ شہرِ آشوب بھی لکھے گئے۔ یہ بھی نظم کے اصل معیار سے دور دکھائی دیتے ہیں۔

اردو نظم کے ارتقاء کے سلسلے میں مراثی کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مرثیے نظم کی آئندہ ترقی کے لیے خاصے ممدومعاون ثابت ہوئے۔ ضمیرؔ، خلیقؔ، انیسؔ ودبیر نے بہت عمدہ مرثیے لکھے اُردو شاعری میں منظر نگاری جذبات واحساسات کی عکاسی کا رجحان مرثیوں کا ہی مرہونِ منت ہے۔ لیکن اِن مرثیوں کو بھی نظم کی ترقی یافتہ شکل نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ داخلیت و انفرادیت کی وہ خصوصیات جن کا نظم تقاضا کرتی ہے نہ پیدا ہوسکیں۔

''خالص نظم'' کے باب میں نظیراکبرؔآبادی کا نام بہت اہم مانا جاتا ہے اُن کا شمار جدید شاعری کی تحریک کے پیش روؤں میں ہوتا ہے۔ ویسے تو انھوں نے دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی لیکن

خالص نظم کی ابتداءاُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔نظؔیر سے پہلے شاعری کا تعلق بادشاہ اور امراء سے ہوتا تھا نظیر نے شاعری کو سماج اور زندگی سے جوڑ دیا اِس لیے انھیں عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔دنیا کی بے ثباتی میلے ٹھیلے مذہبی دلچسپیاں اِن سب کی متحرک تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اُن کی شاعری میں وطن کی دھرتی سے والہانہ لگاؤ کا احساس ہوتا ہے۔اِس کے ساتھ ساتھ گہرے فلسفیانہ خیالات اور علم و حکمت سے پر نکات بھی زیرِ بحث ہوئے ہیں۔اِس سلسلے میں سید طلعت حسین لکھتے ہیں۔

''نظیر اکبر آبادی کی حیثیت محض شاعر کی نہیں بلکہ ایک مفکر اور مصلح کی بھی ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کے ہر شعبے کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا اور انسان کو کامیاب زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا۔اُن کی شاعری گل وبلبل کی شاعری نہیں۔ بلکہ انسانی زندگی کی مکمل تصویر ہے جس میں ہر انسان اپنے خدوخال آسانی سے دیکھ سکتا ہے''۔[1]

نمونے کے طور پر نظیر کی ''بنجارہ نامہ'' سے ایک بند پیش خدمت ہے۔

ٹک حرص وہوس کا چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہیں دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا ،بھینسا، بیل شتر کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چاول، موٹھ ،مٹر، کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوئے گا جب لاد چلے گا بنجارا[2]

---

[1] نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری مصنف سید طلعت حسین نقوی،ص:۲۷

[2] نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری،ص:۲۰۸،ایجوکیشنل پبلی کیشنز ہاوس،نئی دہلی ۱۹۹۱ء

نظیر کی نظموں میں تجربے کا عمل نمایاں ہے، اچھے شاعر کی خوبی ہے کہ جو بھی تجربہ حاصل کرے اُس کا ردِعمل اور جزبہ انفرادی ہونا چاہئے۔ اگر وہ انفرادی ردِعمل کا اظہار کرتے تو یقیناً جدید اردو نظم کے بانی قرار پاتے۔

اُردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ حالؔی اور آزادؔ جدید اُردو شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالؔی اور اُن کے رفقاء، یعنی محمد حسینؔ آزاد، شبلؔی اسمٰعیل میرٹھؔی اور اکبر آلہ آبادؔی کا زمانہ وہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمان ہر لحاظ سے پسماندہ ہو چکے تھے ایسے میں سرسیدؔ احمد خاں نے مسلمانوں کی احیائے نو کا بیڑا اُٹھایا جسے تہذیبی نشاۃ الثانیہ کا نام دیا گیا۔ اِس تحریک کے ذریعے سرسید نے مغربی طرزِ تعلیم اور مغربی علوم وفنون سے استفادہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

اِس تحریک کے زیرِ اثر نیچرل شاعری کی تحریک شروع کی جس کے تحت جدید نظم نگاری کی ابتداء ہوئی۔ مغربی نظموں کے ترجموں کے ذریعے نظم نگاری کا تصور پروان چڑھنے لگا حالؔی اور آزادؔ شاعری کو مقصدی اور اصلاحی بنانا چاہتے تھے چنانچہ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء میں آزاد نے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر کرنل ہالرائیڈ کی ایماء پر لاہور میں انجمن پنجاب کی داغ بیل ڈالی۔ اِس کا مقصد نظم کو فروغ دینا تھا۔ ہالرائیڈ نے درسی کتابوں کے لیے موضوعاتی نظمیں لکھوائیں حالؔی اور آزادؔ کی کوششوں سے اُردو شاعری ایک مخصوص دائرے سے نکلی، نئے موضوعات اور مسائل شاعری میں داخل ہوئے روائتی اور بے جان شاعری کے بدلے سچے مشاہدات و تجربات کے اظہار پر زور دیا گیا۔

موضوعاتی نظمیں لکھنے کی ابتداء کی گئی اِس ضمن میں آزادؔ کی شب قدر، قناعت، ابر کرم، زمستان، خواب امن، جبکہ حالؔی کی برکھا رت، نشاطِ امید، حبِ وطن مناظرہ رحم وانصاف۔ جیسی نظمیں

قابلِ ذکر ہیں جو انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئیں یہ نظمیں چونکہ خاص مقصد کے لیے لکھیں گئیں۔ اس لیے ان میں سماج کی اعلیٰ قدریں زیرِ بحث ہیں۔ اِن میں واعظانہ اور اصلاحی رنگ غالب ہے۔ حالؔی، اکبؔر، آزاؔد اور اُن کے دیگر ہم عصر شعراء نے نظم کے موضوعات کو وسیع کر دیا جس سے جدید اُردو نظم کے لیے راہ ہموار ہو گئی۔

حالؔی نے اُردو شاعری میں سادگی، روانی، اور نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی اور سرسید کی فرمائش پر 'مسدس حالی' لکھی جو ایک شاہکار نظم ہے اِس میں قوم کی زبوں حالی پر نوحہ کناں ہیں۔

ے پھر ایک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر
جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر
ے نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر
ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
ے یہ آواز پیہم وہاں آرہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے[1]

حالؔی کی شاعری کا مقصد چونکہ قومی اصلاحی اور معاشرتی برائیوں کا قلع قمع کرنا اور قوم کی اخلاقی تربیت کرنا تھا۔ اِس مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے ''چپ کی داد''، ''مناجاتِ بیوہ''، اور ''شکوہ ہند'' جیسی نظمیں لکھیں جن سے اُن کی دردمندانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے اور طبقہ نسواں کے تیئں ان کے جذبات واحساسات کا پتہ چلتا ہے۔

آزاد نے جدید نظم سے متعلق اپنے خیالات نثر و نظم دونوں میں بیان کئے ہیں۔ اِس ضمن میں

---

[1] نقشِ حالی حصہ دوئم ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ص: ۴۰۵

اُن کی نظمیں اُردو شاعری کو تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ یہ جدید نظم کی اولیں کوشش ہیں۔

نظم نگاری کے میدان میں آزادؔ اور حالیؔ کے بعد شبلیؔ بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں انھوں نے پہلے تو اصلاحی شاعری کی اِس کے بعد بیسویں صدی کے سیاسی حالات کے پیشِ نظر سیاسی نظمیں لکھنی شروع کیں اِن میں اُن کی نظم ''ہنگامہ'' ''طرابلس و بلقان'' نمونے کی طور پر دی جاسکتی ہیں۔نظم نگاری کے چوتھے اہم ستون اسمٰعیل میرٹھیؔ ہیں۔نظم نگاری اُن کا خاص میدان ہے۔جدید نظم نگاری کی روایت جو حالیؔ اور آزادؔ سے شروع ہوتی ہے اُسے آگے بڑھانے میں اسمٰعیل میرٹھیؔ نے اہم کردار ادا کیا۔انجمن پنجاب کے تحت ہونے والے مشاعروں سے پہلے ہی انھوں نے موضوعاتی نظمیں لکھنی شروع کردی تھیں۔بیانیہ اور فطری شاعری اُن کی نظموں کا خاص جوہر ہے ''گرمی کا موسم''، ''ہوا چلی''، ''رات''، ''برسات''، ''شفق''، ''دال کی فریاد''، ''چپاتی'' وغیرہ اسی طرز کی نظمیں ہیں۔حب الوطنی اور معاشرتی مسائل بھی اُن کی نظموں کا موضوع بنے ہیں۔بچوں کی شاعری میں بھی وہ کافی امتیاز رکھتے ہیں۔وہ بچوں کی نفسیات سے آگہی رکھتے تھے اِس لیے بچوں کے لئے انھوں نے کافی نظمیں لکھیں۔

'اسلم کی بلی، کوا، پن چکی، ہماری گاڑی، ایک جگنو اور بچہ، ایک بچہ اور ماں'، یہ نظمیں خاص طور سے بچوں کے لیے لکھیں گئیں ہیں۔مگر اِن سے اُن کے تجربے اور مشاہدے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔اِس کے علاوہ انھوں نے میں ہیئتی تجربے بھی کئے ہیں۔دو نظمیں قوافی کی پابندی کے بغیر بھی لکھی ہیں اِس طرح معریٰ نظم کی داغ بیل انہی کے ہاتھوں پڑی، اسمٰعیل میرٹھی کے بعد اکبرالٰہ آبادی کا نام بھی خصوصیت کا حامل ہے انھوں نے شاعری کی شروعات، رومانی غزلیات سے کی اور

پھر وقت و حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنے دور کی برائیوں اور خامیوں کو بیان کرنے کے لیے طنز یہ انداز اپنایا۔ یہ وہ دور تھا جب اُردو کی نظمیہ شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے اِس میں زیادہ تر شعراء رومانی تحریک سے جڑے ہوئے تھے اور بعض نے آزادؔ اور حالیؔ کی حب الوطنی کی تحریک کو آگے بڑھایا سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھیں اُس دور کے شعراء میں وحید الدین سلیمؔ، منشی درگا سہائے، سرور جہاں آبادی، تلوک چند محرومؔ، سورج نرائن مہرؔ، چکبستؔ، نادر کاکوریؔ، ہمایوںؔ، ظفر علی خانؔ، خوشی محمد ناظرؔ اور عظمت اللہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر صرف چند شعراء کا ذکر کیا جائے گا اکبرالہ آبادیؔ کے دور میں سرور جہاں آبادیؔ نے بھی نظمیہ شاعری کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے پیش ورشاعروں کے خطوط پر اپنی شاعری کو استوار کیا۔ جدید موضوعاتی نظموں کے نمونے تو اُن کے سامنے موجود ہی تھے۔ انگریزی ادب پر اُن کی کافی نظر تھی انھوں نے انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کیئے ہیں، انھوں نے اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھیں اور جدید نظم نگاری کے افق کو مزید وسیع کر دیا، سوزِ بیوہ، اجڑی ہوئی محفل، یادِ وطن، قومی نوحہ، جلوہ اُمید، کارزارِ ہستی، اُن کی مشہور نظمیں ہیں حالیؔ، اکبرؔ اور اُن کے دیگر ہم عصر شعراء نے نظم کے موضوعات کو وسعت بخشی جس سے جدید اُردو نظم کے لیے راہ ہموار ہوگئی لیکن حقیقتاً جدید اُردو نظم کا آغاز اقبالؔ سے ہوتا ہے جدید نظم کے تاریخی اور فنی ارتقاء میں اُن کا کردار بہت اہم ہے۔ بلا شبہ اقبالؔ بیسویں صدی کے وہ عظیم شاعر ہیں جنھوں نے موضوعات کی رنگا رنگی سے اُردو نظم کے دامن کو کافی وسیع کر دیا انھوں نے داخلی و خارجی زندگی کے بیان کے لئے نظم کو استعمال کیا البتہ ہیئت کے لحاظ سے مثنوی، مسدس، اور ترکیب بند کی روایت کو اپنایا۔ اقبالؔ، آزادؔ اور حالیؔ کی نظم نگاری کی تحریک سے متاثر تھے انھوں نے پرانے شعراء کی روایت سے بھی استفادہ کیا موضوع اور فن میں جدت کے اعتبار سے اُن کی نظمیں

کافی آ گے نکل گئیں۔ ہندوستان میں حبُ الوطنی کی تحریک سے متاثر ہوکر ''ہمالہ''، ''ابرِ کہسار''، نیا شوالہ'' اور ''تصویر درد'' جیسی شاہکار نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں اُن کے فکر و تخیل کی بلندی کے ساتھ ساتھ وطن سے محبت، اتحاد و اتفاق اور انسانیت کے درد کا احساس ملتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری کا دامن بہت وسیع ہے۔ اقبالؔ نے صحیح معنوں میں اُردو نظم کو ایک بالکل ہی نئے انقلاب سے روشناس کیا ان کی شاعری کا منبع وماٰخذ قرآنِ حکیم ہے۔ اُن کے ہاں فلسفہ بھی ہے، عشق و تصوف کے مضامین بھی، تاریخ و تہذیب کے نکات بھی ہیں اور قوم کی پستی کا احساس بھی انھوں نے اپنی نظموں میں اُن دشوار سوالات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق تاریخ، عمرانیات، سیاسیات اور روحانیت وغیرہ سے ہے انھوں نے عمل اور خودی کا انوکھا تصور پیش کیا۔ اقبالؔ کے نزدیک خودی میں ہی انسان کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ اُن کی نظمیں شمع و شاعر، خضرِ راہ، شکوہ جواب، طلوع اسلام، شعاعِ امید، مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ، جبریل و ابلیس، والدہ مرحومہ کی یاد میں فکر و فن کی بلندیوں پر ہیں۔ اُن کے کلام میں جوش اور جذبہ کی فراوانی ہے۔ غرض یہ ہے کہ جدید اُردو نظم پر اُن کے اثرات بہت دور رس اور گہرے ہیں۔ نمونے کے طور پر اقبالؔ کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کے چند اشعار پیشِ خدمت ہے۔

؎ سلسلۂ، روز وشب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ، روز وشب، اصل حیات و ممات

؎ سلسلۂ، روز وشب، تار حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز وشب، سازِ اول کی فغان
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم کائنات[1]

اس نظم میں اقبالؔ نے جذبے اور فکر کی گہرائی سے بہت ترتیب کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اِس نظم کا نچوڑ یہ ہے کہ عشق وایمان کی قوت کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے جس کے سامنے زوال اور فنا نہیں ٹھہر سکتے یہ لازوال طاقت مٹی کو سونا اور فانی چیزوں کو غیر فانی بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے ''مسجد قرطبہ'' تو فنا تو ہو سکتی ہے لیکن اُس کے معماروں کا جذبہ عشق جس کے تحت انھوں نے اِس کی تعمیر میں حصہ لیا وہ ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔

اُردو نظم گوئی کی روایت کے اِس تذکرے میں پنڈت برج نرائن چکبستؔ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے ملی شاعری کی اُس روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا جس کی شروعات آزادؔ اور حالیؔ سے ہوتی ہے۔ چکبستؔ نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نظمیں لکھیں اور عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی بقول کالی داس گپتا رضا

''اگر چکبستؔ نہ ہوتے تو اُردو شاعری بیسویں صدی کے آغاز کی سیاسی بیداری کے تذکرے سے محروم رہ جاتی ہندوستان کے ایک خاص دور کی تاریخ اور چکبستؔ کی شاعری کندھے سے کندھا ملا کر چلتی ہے''۔[2]

اُن کا مجموعہ ''صبحِ وطن'' حبُ الوطنی کے جذبات سے معمور ہے ہندوستانی تہذیب وثقافت کی جھلکیاں اُن کی شاعری میں دکھائی دیتی ہیں۔ اخلاق وکردار، مناظر قدرت بھی اُن کی شاعری کا

---

[1] کلیاتِ اقبال ص: ۹۳

[2] کلیاتِ چکبست کالی داس گپتا رضا صفحہ ۱۸

موضوع بنے ہیں۔کوئی بڑا اگنجلک فلسفہ یا کوئی نظریہ حیات انھوں نے پیش نہیں کیا بلکہ اپنے وطن کی مٹی یہاں کے موسم اور یہاں کے لوگ اُن کی شاعری کا موضوع ہیں۔

اقبال کے زمانے میں ترقی پسند تحریک کی شروعات ہوئی اُس دور میں جوش ملیح آبادی کا ذکر بھی ضروری ہے جنھیں شاعرِ انقلاب کہا جاتا ہے۔اُس دور کے اہم رجحانات کا اثر اُن کی شاعری میں نمایاں ہے۔جوش نے جب نظم نگاری شروع کی تو اُردو شاعری میں اقبال کے فلسفیانہ افکار، چکبست کی قومی شاعری، اور رومانیت کے عناصر اُردو نظم میں داخل ہو چکے تھے، اِس لیے جوش کی شاعری میں انقلابی رنگ کے ساتھ ساتھ انسان دوستی، مناظرِ فطرت کی دلکشی اور حسن و عشق کے مرقعے بھی ہیں۔ اُن کے پاس لفظوں کا بے بہا خزانہ ہے جسے وہ بے دریغ لٹاتے ہیں۔اُن کے تصورِ انقلاب میں اگرچہ اتنی گہرائی اور وسعت نہیں۔وہ انقلاب کو وسیع معنی نہ دے سکے لیکن اُن کے ہاں انقلاب ایک شعری موضوع اور ایک نعرہ بن کر رہ گیا ہے۔لیکن خیالات کی رعنائی اور جذبات کی شدت میں کوئی اُن کا مقابل نہیں۔ملاحظہ ہو:

کیا ہند کا زنداں، کانپ رہا ہے اور گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں چھلکتی شمشیریں[1]

جوش کی طرح حفیظ نے شاعری کی شروعات رومانیت سے کی لیکن بعد میں اُن پر اقبال کا اصلاحی رنگ غالب آ گیا ''شاہنامہ اسلام'' حفیظ کا بہترین کارنامہ ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں

---

[1] اُردو اصناف کی تدریس، مرتبہ اومکار کول، مسعود سراج صفحہ:۱۱۹، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی

کی عظمت رفتہ کے نقوش واضح کیے ہیں۔ پاکستان کا قومی ترانہ انھوں نے ہی ترتیب دیا ایک لاکھ قومی ترانوں میں سے حفیظ کے ترانے کو ہی سندِ قبولیت حاصل ہوئی۔ حفیظ کی شاعری میں منظر کشی، جزبات واحساسات کی عکاسی اور ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی زندگی کے مرقعے ملتے ہیں۔ اِس سلسلے میں ''سحر'' چاند کی سیر' برسات، تاروں بھری رات وغیرہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔

علی گڑھ تحریک کے بعد بڑی اور شعوری تحریک جس نے ہمارے ادب کو انقلابی تبدیلیوں سے دو چار کیا ترقی پسند تحریک تھی۔ ترقی پسند تحریک کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں عمل میں آئی اِس کے مفکرین و مصنّفین مارکس کے فلسفے سے متاثر تھے۔ اِس کا مقصد شعروادب کو جدید خطوط پر استوار کر کے اسے عوامی خواہشات کا ترجمان بنانا اور معاشرتی وانفرادی سطح پر ایک انقلاب آمیز تبدیلی لانا تھا۔

ترقی پسندوں نے طبقاتی نظام اور سرمایہ داری کی مخالفت کی کیونکہ تہذیبی وتمدنی سطح پر انحطاط وپستی کی کیفیت اسی نظام کی دین تھی۔ اُن کے نزدیک اشترا کی نظام ہی انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن تھا۔ ترقی پسندوں کے پیشِ نظر یہ مقصد بھی تھا کہ انگریزی سامراج کی یک آواز ہو کر مخالفت کی جائے اور معاشی ومعاشرتی، اقتصادی ناہمواریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے اور ادب کو سماج کے ساتھ جوڑ دیا جائے جن شعراء نے اپنی نظموں کے ذریعے اِس مقصد کو فروغ دیا اُن میں فیض احمد فیضؔ، مجازؔ، ساحرؔ لدھیانوی، کیفی اعظمیؔ، سردار جعفریؔ، مخدومؔ، سلام مچھلی شہری، جاںؔ نثار اخترؔ، اختر انصاریؔ، نیازؔ حیدر، علی جوادؔ زیدی، پرویز شاہدیؔ، جزبیؔ وغیرہ اہم ہیں۔ اِن میں سے فیضؔ، ساحرؔ اور مجازؔ کے یہاں رومانیت وحقیقت پسندی کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ وہ بات تو رومانیت سے شروع کرتے تھے لیکن تان حقیقت پسندی پر ٹوٹتی تھی۔ مثال کے طور پر فیض احمد فیضؔ کا یہ شعر

؎ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اقبالؔ کے بعد فیضؔ عہد جدید کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ترقی پسند شعراء میں اُن کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔اُن کی شاعری کی ابتداء اگرچہ رومانیت سے ہوئی لیکن جلد ہی ترقی پسندی کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔''نقشِ فریادی'' جو ۱۹۴۱ میں شائع ہوا تھا اِس میں رومان سے حقیقت کی طرف آنے کی روش واضح ہے۔[۱]

''دستِ صبا'' دوسرا مجموعہ جو زندان کی تنہائیوں میں لکھا گیا ''دستِ صبا'' کی اشاعت تقسیمِ ہند کے وقت عمل میں آئی اُس وقت ترقی پسندوں کا موضوع چونکہ ملکی آزادی تھا فیضؔ نے بھی اِس مجموعے میں اپنے وطن سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے اور اِس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ آزادی کے خوابوں کی تعبیر بہت بھیانک صورت میں سامنے آئی ہے۔اُن کی نظم ''صبح آزادی'' زبان زد عام ہوئی ،تنہائی، صبح آزادی، مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ، بول کہ لب آزاد ہیں تیرے، نثار میں تیری گلیوں پہ، ہم جو مارے گئے تاریک راہوں میں، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، شاہکار نظمیں ہیں جو ترقی پسندانہ جذبات واحساسات کی نمائندگی کرتی ہیں۔

؎ یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
؎ کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ راہ کو کچھ خبر نہیں

۱؎ فیض کا شعری مرتبہ ڈاکٹر عتیق اللہ ص:۲۸۳

؎ نجاتِ دیدہ ودل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل نہیں آئی [1]

ترقی پسندوں نے غزل کے بجائے نظم کو ہی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ظاہر ہے کہ نظم کا دامن زندگی کی حقیقتوں کو سمیٹنے کی غزل کے مقابلے میں زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی لئے ترقی پسند شعراء کی بدولت نظم کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ آزادی کے بعد ملک کئی دوسرے بڑے مسائل سے دوچار ہوا تو ترقی پسندوں نے اُن مسائل یعنی طبقاتی تفاوت، معاشی ومعاشرتی اور سیاسی مسائل کو بھی نظموں کا موضوع بنایا۔

آزادی کے بعد ترقی پسندی سے بعض شعراء نے انحراف بھی کیا لیکن اس انحراف سے نظم متاثر نہیں ہوئی بلکہ اِس میں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے تجربے ہوتے رہے۔

ترقی پسندوں کے شانہ بشانہ اُردو ادب میں ایک اور تحریک فروغ پاتی رہی جسے حلقہ اربابِ ذوق کہا جاتا ہے۔ جنھوں نے ترقی پسندوں کی مخالفت کی انھوں نے خیال کی نسبت فن کی طرف زیادہ توجہ دی اور ہیتی اعتبار سے بھی نظم میں نئے تجربات کئے نظم معریٰ اور آزاد نظم کو فروغ دیا۔ جن شعراء نے آغاز میں نظم معریٰ اور آزاد نظم کو اپنے احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا اُن میں ن،م، راشدؔ، میراجیؔ اور تصدیق حسینؔ خالد کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ بعد میں بہت سے شعراء نے آزاد اور پابند نظمیں لکھیں جن میں فیض احمد فیضؔ، سردار جعفریؔ، مختار صدیقیؔ، یوسف ظفرؔ، قیوم نظرؔ، اختر الایمانؔ، مجید امجدؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

میراجیؔ آزاد نظم کے سب سے بڑے معمار ہیں انھوں نے جدید اُردو نظم کو موضوع اور ہیئت

---

[1] انتخاب فیض مرتبہ پروفیسر شمیم حنفی صفحہ:۱۶

دونوں اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا اور اُردو نظم کو ذہنی ونفسیاتی تجربات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ انیسویں صدی کی علامت نگاری اور فرائیڈ کے نظریات کے زیر اثر جنسی علامتیں اُن کے ہاں زیادہ استعمال ہوئی ہیں۔ اِسی لئے فرائیڈ کے نظریات کی اشاعت وفروغ کے حوالے سے ہی اُن کی شہرت ومقبولیت ہوئی۔ ''لبِ جوئبار'' ''ایک شام کی کہانی'' ''دوسری عورت'' ''نامحرم'' ''دھوکا'' ''کٹھور'' ''مجھے گھر یاد آتا ہے'' ''سرسراہٹ'' ''نارسائی'' ''اندھا طوفان'' میں علامتوں کے ذریعے جنس کو ہی موضوع بنایا گیا ہے کئی علامتی نظموں میں ابہام پایا جاتا ہے اور وہ مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں مثلاً ''اندھا طوفان'' اور بعد کی اڑان'' کئی نظمیں علامتی ہونے کے باوجود اپنا مفہوم واضح کرتی ہیں۔ مثلاً ''اونچا مکان'' اور ''کلرک کا نغمہ محبت'' جیسی نظمیں قابلِ ذکر ہیں بلا شبہ وہ نئے دور کے نفسیاتی رجحان کے عکاس تھے۔ میراؔجی کا مطالعہ کافی وسیع تھا انھوں نے کئی یورپی شاعروں کی نمائندہ نظموں کے ترجمے بھی کیئے۔

''دھوبی کا گھاٹ'' اور ''اجنتا کے غار'' میں شعور کی رو تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ ''شعور کی رو تکنیک'' بھی انھوں نے اپنی نظموں میں استعمال کی ہے جن میں شاعر کے ذہن میں مختلف النوع خیالات ایک تواتر کے ساتھ ذہن کے پردے پر چلتے رہتے ہیں اور انفرادیت کے لحاظ سے اتنے اثر انگیز ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غرض کہ میراؔجی نے موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے جدید اردو نظم کا دامن وسیع کر دیا اور اپنے بعد آنے والے نظم نگاروں پر گہرے اثرات مرتب کیئے۔ جدید اُردو نظم کی ترقی کے لئے نئی راہیں استوار کرنے میں میراؔجی، فیضؔ اور ن م راشدؔ ایک خاص مقام رکھتے ہیں فیضؔ ترقی پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے جبکہ میراؔجی اور راشدؔ حلقہ سے وابستہ تھے میراؔجی اور راشدؔ میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں نے اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے آزاد نظم کو ہی منتخب کیا۔

راشدؔ نے اُردو نظم اور غیر معروضی نظم کے میدان میں کافی تجربے کئے۔ یہ حقیقت ہے کہ غزل کے مقابلے میں راشدؔ کا رجحان نظم کی طرف زیادہ ہے۔ راشدؔ کی شاعری دوسری جنگِ عظیم اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے دوران پروان چڑھی۔ اس لئے اُس دور کا سیاسی رجحان اور وہ رویے جو جنگِ عظیم کے بعد انسانوں کا مقدر بنے اُن کی شاعری پرحاوی نظر آتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں قدرے اقبالؔ کا رنگ بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ وہ بھی آزادی کو قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے اُن کی شاعری کے موضوعات عشق، سیاست اور مذہب رہے ہیں۔ انگریز حکمرانوں سے نفرت، انسان کی بے بسی ولاچاری، معاشی ومعاشرتی بدحالی کا شدید احساس اُن کی نظموں میں جلوہ گر ہے، ''ماوریٰ'' اور ''ایران میں اجنبی'' انھی خیالات کی صدائے بازگشت ہیں اُن کے نزدیک پورے ایشیاء کی متحدہ جدوجہد ہی آزادی کی نقیب بن سکتی ہے۔ من وسلویٰ، میرے بھی ہیں کچھ خواب'' میں اِس قسم کے خیالات کا اظہار ملتا ہے۔

نفسیاتی الجھنیں اور ذہنی مایوسی کا ذکر ''رقص''، ''دریچے کے قریب''، ''خودکشی''، ''اجنبی عورت''، ''نارسائی''، ''صبا ویران''، میں ملتا ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک طرف تو اساطیری دیو مالائی تہذیب کے نقوش ہیں تو دوسری طرف مشرقی تہذیبی عناصر بھی ہیں۔ 'صحرا'، اور 'ریت' کے تلازے بھی اُن کی نظموں میں عام استعمال ہوئے ہیں۔

''حسنِ کوزہ گر''، ''ابولہب کی شادی''، ''اسرافیل کی موت''، ''خودکشی''، ''اجنبی عورت''، ''صحرانورد پیردل''، خودکشی، راشدؔ کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ اور اُردو نظم کے باب میں اہم اضافہ ہیں۔ راشد کی ایک نظم، ''من سُلویٰ'' نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہے اِس سے راشد کی نظم کا موضوع اسلوب اور رجحان سمجھنے میں مدد ملے گی۔

بس ایک زنجیر
ایک ہی آہنی کمند عظیم
پھیلی ہوئی ہے
مشرق کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک
میرے وطن سے تیرے وطن تک
بس ایک ہی عنکبوت کا جال کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہوکر تڑپ رہے ہیں[1]

جدید اُردو نظم کو فن و معنی کے لحاظ سے وسعت عطا کرنے میں ایک اور اہم نام اخترؔ الایمان کا ہے انھوں نے جس دور میں ایک الگ شاعر کی حیثیت سے اپنی پہچان کرائی اُس وقت کے جدید شعراء دو الگ الگ ادبی گروہوں سے وابستہ تھے لیکن اخترؔ الایمان نے اِن دونوں سے الگ رہ بھی ہر دور سے تعلق رکھا اور اپنا ایک انفرادی رنگ برقرار رکھا، اُن کے ہاں نظموں کا بہت گہرا اور واضح شعور موجود ہے۔ اُن کی نظمیں فکر وخیال، ندرت وجدت کے باعث جدید آہنگ لئے ہوئے ہیں۔ اُن کے یہاں ہمیں معریٰ نظمیں زیادہ دکھائی دیتی ہیں اُن کی نظموں کے بنیادی موضوع معاصر انسان سے مایوسی، فریب، دل شکستگی، وقت کا تصور، بین الاقوامی سطح پر مختلف ممالک کا آپسی انتشار اور اُس سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔ اُن کے ہاں اعلیٰ انسانی قدروں کے زوال کا گہرا احساس پایا جاتا ہے۔ انھوں نے زندگی کو اقدار کے حوالے سے دیکھنے سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی اپنی زندگی کے تلخ تجربات و حادثات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ''نیند سے پہلے، محرومی، وداع،

---

[1] جدید اُردو نظم نظریہ و عمل ص:۲۰۲، عقیل احمد صدیقی ایجوکیشنل، پبلشنگ ہاؤس ۱۹۹۷ء علی گڑھ

فیصلہ، تھکن، جیسی نظموں میں مایوسی اور افسردگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ اکثر وبیشتر نظمیں علامتی شاعری کی واضح مثال ہیں۔ مسجد، پرانی فصیل، جواری، اور پگڈنڈی، علامتی اسلوب لئے ہوئے ہیں۔ لیکن اِن تمام کے باوصف وہ زندگی سے خفا نہیں بلکہ اِن تلخ حادثات کو زندگی کے روشن حقائق کی طرح تسلیم کرتے ہیں۔ نمونے کے طور پر اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' سے ایک بند۔

مجھے ایک لڑکا جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے یوں لگتا ہے جسے اِک بلائے جان
مراہم زاد ہے ہر گام پر ہر موڑ پر جولاں
اُسے ہم راہ پاتا ہوں یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو[1]

اِس لڑکے کی اندرونی کشمکش اِس نظم کا بنیادی موضوع ہے۔ یہ علامتی نظم ہے اِس میں نئی اور پرانی علامتوں کا امتزاج ملتا ہے ملک کی تقسیم کے کچھ عرصہ تک اُردو شعروادب پر ترقی پسندی کے رجحانات چھائے رہے لیکن ۱۹۵۸ تک پہنچتے ہوئے اِن کی جگہ نئے رجحانات نے لے لی جنھیں جدیدیت کا نام دیا گیا جدیدیت کا یہ دور پچیس سال کے عرصے پر محیط رہا۔ یہ دور نئی نظم کا دور مانا جاتا ہے جو فرد کی تنہائی اور بیچارگی پر منتج ہے جس میں شعراء نے ذات سے کائنات تک کا سفر کیا۔ اِس دور کی نظموں میں ذاتی تجربات اور نئی علامتوں کا استعمال کیا گیا ہے جن کی وجہ سے شاعری میں ابہام اور ترسیل جیسے مسائل پیدا ہوئے۔ نظموں کی تفہیم کے لیے تحلیل نفسی، معروضی تلازمات کو

---

[1] تحریروتقریر سبھاش ایما، ص:۲۶/۲۷

برروئے کارلانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ جدیدیت کے علمبرداروں میں چند ایک نام اِس طرح سے ہیں۔ وزیر آغا، بلراج کومل، کمار پاشی، عمیق حنفی، ساقیؔ فاروقی، مخمور سعیدیؔ، جیلانیؔ کامران، عادل منصوریؔ، افتخار جالبؔ، محمد علویؔ، شہر یارؔ، زاہدؔ فاروق اور فاروقؔ حسن شامل ہیں۔ ساتویں دہائی تک جدیدیت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ایسے میں جدیدیت روبہ زوال تو نہیں ہوئی لیکن اس میں مزید توسیع پیدا ہوئی جو اِس دہائی میں جدیدیت کے ساتھ مساوی سفر کرتی ہے۔ جو صلاح الدین پرویز اور بعض دوسرے شعراء کی نظموں میں نظر آتی ہے۔

ساتویں دہائی کے بعد آٹھویں دہائی کی نظم میں مابعد جدیدیت کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اِس دور کی نظم محض ہیتی تجربوں کا نام نہیں بلکہ اُن احساسات سے عبارت ہے جن میں آج کے دور کا انسان الجھا ہوا ہے۔ دنیا جہاں ترقی کے بامِ عروج پر ہے۔ وہاں انسان کے مسائل اور زندگی کی پیچیدگیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اِن حالات ومسائل نے شعراء کے اُن افکار کو جنم دیا جنھیں مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا۔ اب شاعری صرف ذات سے کائنات کا سفر نہیں بلکہ آٹھویں دہائی کی نظم کا موضوع تنہائی، رشتوں، قدروں اور احساسات کی شکست وریخت کا نام ہے۔ جبکہ اِس دور کی نظم میں داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کا امتزاج بھی ہے۔ زندگی کے مثبت رویے بھی ہیں، اور ابہام کے ساتھ ساتھ صراحت بھی ہے جن شعراء نے اِس اصطلاح کے تحت نظمیں لکھیں اُن میں فاروقؔ نازکی، شاہدؔ ماہلی، مظفرؔ ایرج، شین کافؔ نظام، پرتپال سنگھ بیتاب، خلیل مامونؔ عبدالاحدؔ ساز، ڈاکٹر صادقؔ شامل ہیں۔

شائستہ یوسف کی نظم، ''سمندر اور میں'' خالد جاوید کی نظم ''وعدہ'' حمیرا رحمٰن کی ''دھنک''، نصیرؔ احمد ناصر کی ''کھڑکیاں''، معراجؔ راعنا کی ''نیند''، سلیم شہزادؔ کی گرتے پتوں پہ لکھی نظم میرے شبدؔ''،

خالد سعیدؔ کی ''پیاسِ آشفتہ سر'' اسی رجحان کی عکاسی کرتی ہیں۔ بقولِ حامدی کشمیری:

''نئی نظمیں مختلف النوع تجربات مثلاً محرومی، آرزو، جنسیت، انسانی روابط، بدنی لذت، فطرت اور ثقافت سے تجدید رشتگی، خودنگری اور تلاش و جستجو کے رنگوں سے روشن ہیں۔''[1]

اِس دور کا شاعر فطری طور پر آزاد ہے اور کھلی آنکھوں سے باہر کی دنیا کا نظارہ کر رہا ہے۔ اپنی بات کو ہر انداز میں کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج کا شاعر اپنے تجربات و احساسات کا اظہار پابند نظم، ''نظم معریٰ، اور آزاد نظم کے ساتھ ساتھ نثری نظم میں کر رہا ہے۔

۱۹۸۰ کے بعد شعراء نے دنیا کو درپیش مسائل سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں جن میں بے روزگاری دنگے فسادات انتہا پسندی، ایودھیا کا سانحہ، بے وطنی و ہجرت کا کرب جیسے موضوع عام ہیں۔ پچھلی تین چار دہائیوں سے اُردو شاعری کے میدان میں خواتین شاعرات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے جنھوں نے تانیثی شاعری کے حوالے سے اپنی الگ شناخت بنائی اور اُردو نظم کے باب میں موضوعات کے اعتبار سے کچھ اضافے کیے ہیں جو ہمیں عام طور پر مرد شعراء کے یہاں نظر نہیں آتے ہیں۔ موضوعات کے ساتھ ساتھ لب و لہجے میں بھی اِن خواتین شاعرات کے یہاں تبدیلی کا احساس پایا جاتا ہے اِس ضمن میں اگر چہ بہت سے نام گنوائے جاسکتے ہیں لیکن یہاں اختصار کے پیشِ نظر صرف چند ایک کا ذکر کیا جائے گا۔

اِن میں شفیق فاطمہ شعریٰ، ادا جعفریؔ، فہمیدہ ریاضؔ، ساجدہؔ زیدی، زاہدؔہ زیدی، کشور ناہیدؔ، اور پروین شاکرؔ، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِن شاعرات نے اپنے منفرد طرزِ فکر، مخصوص لب و لہجے

---

[1] جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات مصنف پروفیسر حامدی کشمیری، ص: ۵۱۷

اور اسلوب کی بنا پر اُردو شاعری کو تانیثی شاعری سے مالا مال کیا۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ کامیاب نظموں کے تجربے اُن کے یہاں دکھائی دیتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اُن کا غالب رجحان نظموں ہی کی طرف ہے بلاشبہ یہ نظمیں نسوانی بیداری کی نئی حسیت سے عبارت ہیں جن میں عورت کی حسیت اُس کی ذہنی ونفسیاتی پیچیدگیوں آرزوؤں اور ارمانوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اِن شاعرات کے ہاں گھر آنگن کی زندگی کی گہما گہمی کے ساتھ ساتھ اِس موضوع کے اظہار کے لیے علامتیں اور استعارے بھی وضع کئے گئے ہیں یعنی نسوانی علامتوں کا التزام پایا جاتا ہے۔

اِس سلسلے میں شفیق فاطمہ شعریٰ ایک اہم کڑی کے طور پر جانی جاتی ہیں اُن کے یہاں موجودہ عہد کی شعری روایت کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے تجربات اور ایک عورت کے مسائل کا احساس بھی خاص طور سے نمایاں ہے وہ چونکہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اِس لئے اُن کی ذہنی نشوونما میں اسلامی تعلیمات کا کافی گہرا اثر ہے۔ جو اُن کی شاعری سے مترشح ہوتا ہے۔ اکثر تلمیحات اُن کے یہاں اسلامیات سے اخذ کی ہوئی ہیں۔ اُن کی نظموں میں بھی احتجاج کی فراوانی ہے لیکن یہ کیفیات اُس احتجاج سے مختلف ہیں جو ''نسائی تحریک'' کی دین ہے۔ مثلاً ایک نظم ''گلۂ صفورہ'' کا موضوع قرآنی قصے سے ماخوذ ہے۔ جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج بھی عورت کو اُس کا جائز مقام ومرتبہ نہیں مل سکا اِسی قسم کی ایک اور نظم ''سیتا اور صفورہ ہے'' اِس میں دو پُرانے کردار آج کی عورت کے استعارے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اِسی طرح کی کئی نظموں میں احتجاجی لے اور نسائی احساس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ''زوال عہدِ تمنا'' ''بازگشت'' ''تتلی کی پرواز'' ''چراغ تہہ داماں'' ''یادنگر صد بصحرا'' جیسی نظمیں کلاسیکی مزاج رکھتے ہوئے فکر وفن کے لحاظ سے نیا تجربہ ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ جدید اُردو شاعری کے حوالے سے اُردو شاعرات میں محترمہ ادا جعفری

صاحبہ کو خاتون اول کی حیثیت حاصل ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلی دفعہ صیغہ تانیث استعمال کرتے ہوئے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا اِس طرح انھوں نے تانیثی شاعری کو جدید تجربات ورحجانات سے ہم آہنگ کرکے ایک نئی شان اور وقار عطا کیا جب کہ اُس دور میں اِس طرح کہ یہ پہلی آواز تھی جس نے خواتین کے حوالے سے شاعری کے لیے نئی سوچ کے دریچے وا کردئے اِس کے علاوہ فکر واسلوب کی جدت بھی اُن کی شاعری کا بنیادی وصف ہے اُن کی شاعری صرف اظہارِ ذات ہی نہیں بلکہ اظہارِ کائنات بھی ہے اور خواتین کے اندرونی احساسات کی عکاسی بھی ہے یہی وجہ ہے ادا جعفریؔ کی شاعری نے بعد میں آنے والی شاعرات پر گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں۔ اُن کے بنائے ہوئے راستے پر باقیوں کے لیے چلنا چونکہ پہلے دشوار تھا آسان ہوگیا۔ انھوں نے اپنے محسوسات کے اظہار کے لیے غزل سے زیادہ نظم کو پسند کیا پہلا شعری تجربہ جس سے ان کی پہچان ہوئی ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' کی شکل میں منظرِ عام پر آیا اِس کے بعد ''شہرِ درد'' تیسرا ''غزالاں تم تو واقف ہو'' چوتھا 'ساز سخن ایک بہانہ ہے' کی صورت میں یکے بعد دیگرے آتے گئے، اُن کی شاعری میں لطافت کے ساتھ سوز وگداز بھی ہے باقیوں کی نسبت پروین شاکرؔ کی شاعری پر ادا کے اثرات نمایاں ہیں۔

پاکستانی شاعرات شاعری کے میدان میں مرد شعراء سے معیار ومقدار کے اعتبار سے بہت آگے ہیں جدید تر شاعری میں پاکستانی شاعرات کی طویل فہرست میں فہمیدہؔ ریاض ایک معتبر حیثیت کی مالک ہیں اُن کی شعری کائنات غزلوں سے زیادہ نظموں پر مشتمل ہے سب سے پہلے انھوں نے عورت کی نفسیات کو شاعری کا موضوع بنایا عورت کے خیالات واحساسات کو شعری پیکر عطا کرکے خواتین شاعرات میں نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں نہیں

ہے بلکہ بہت واضح اور دوٹوک انداز میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کے جذبات واحساسات کے اظہار میں بے باکی و بے حجابی کے لحاظ سے وہ پہلے نمبر پر ہیں اُن کی شاعری ایک ایسی باغی عورت کی نمائندگی کرتی ہے جس نے معاشرے کی استحصالی اقدار کو ماننے سے انکار کردیا ہے جسے وہ چپ چاپ صدیوں سے سہتی چلی آ رہی تھی۔ فہمیدہ ریاض ہمیشہ عورت کے مساویانہ حقوق کے لیے کوشاں ہیں۔ اِس کے علاوہ انھوں نے مرد عورت کی تقسیم کو توڑ کر ایک انسانی شخصیت کے حوالے سے بھی اپنی شاعری میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ پہلا شعری مجموعہ ''پتھر کی زبان'' اور اس کے بعد 'بدن دریدہ' اور 'زرد دھوپ' 'منظرِ عام پر آئے اُن کی اکثر نظموں میں بلند و بانگ لہجے میں مردِ اساس معاشرے پر طنز کیا گیا ہے نمونے کے طور پر ایک نظم پیش کی جاتی ہے جس کا کردار ''حرم سرائی'' تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے جس کے چنگل میں عورت بے بس و مجبور پھڑ پھڑا رہی ہے۔

یہ لونڈیاں ہیں،

کہ یرغمالی، حلال شب بھر رہیں، دمِ صبح در بدر ہیں

یہ باندیاں ہیں

جناب کے نطفۂ مبارک کے نصف ورثے سے معتبر ہیں

یہ بیبیاں ہیں

کہ زوجگی کا خراج دینے، قطار اندر قطار باری کی منتظر ہیں

یہ بچیاں ہیں

کہ جن کے سر پر پھرا جو حضرت کا دستِ شفقت

تو کمسنی کے لہو سے ریشِ سپید رنگین ہوگئی ہے

حضور کے حجلہ معطر میں زندگی خون ہو گئی ہے۔[1]

فہمیدہ ریاض نے ایک شادی شدہ عورت کے نازک ترین احساسات کو پہلی بار صفحہ قرطاس کی زینت بنایا ہے وہ ایسی عورت کی نمائندگی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جو ہر لحاظ سے آسودہ، مطمئن اور مکمل زندگی گزار رہی ہے۔'لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا' میں انہی خیالات کی نمائندگی ملتی ہے۔

لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا
چھو کے میرا بدن
اپنے بچے کے دل کا دھڑکنا سنو
ناف کے اُس طرف
اِس کی جنبش کو محسوس کرتے ہو تم؟

فہمیدہ ریاض[2]

جدید اُردو شاعری کا دامن رنگا رنگ موضوعات نت نئے تجربات و مشاہدات سے مالا مال کرنے والی ہستی ساجدہ زیدی ہیں جنھوں نے اقدار کی شکست و ریخت کو شاعری کا موضوع بنایا ہے اُن کے ہاں بھی نظموں کی تعداد زیادہ ہے اُن کے ہاں فلسفہ وجودیت کا کافی اثر ہے ہستی و نیستی سے متعلق سوالات اُن کی نظموں میں ابھرتے ہیں ''شبِ چراغ''، ''ادراک کا یہ لمحہ مختصر''، ''سمندر کے سینے کے خاموش اسرار''، ''آتشِ سیال''، ''رقص در دِدیگر'' وغیرہ اُن کی نمائندہ نظمیں مانی جاتی ہیں جو داخلیت و خارجیت کا حسین امتزاج ہیں ساجدہ زیدی کی شاعری عورت کے تئیں سماج کا رویہ عورت

---

1. مضمون ''خواتین کی نظموں میں فکر کے اسالیب'' ترتیب وانعقاد ڈاکٹر عتیق اللہ، بشمولہ بیسویں صدی میں خواتین اُردو ادب، ص: ۱۷۳
2. بیسویں صدی میں خواتین، اُردو ادب، مصنف ڈاکٹر عتیق اللہ، ص: ۱۸۱، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

کے استحصال، سیاست و مادیت وغیرہ جیسے موضوعات سے عبارت ہے۔

اِسی سلسلے کی ایک اور اہم کڑی زاہدہ زیدیؔ ہیں جن کی شاعری جدیدیت کی تحریک کے آس پاس یعنی ۱۹۷۰ء کی دہائی کے دوران پروان چڑھی اُس دور میں چونکہ شاعری میں داخلیت کا رجحان بڑھتا جارہا تھا اِس لئے زاہدؔہ کی شاعری انہی خیالات وواقعات کا آئینہ ہے اِس میں احساسِ زیاں ہے، جو مٹتی ہوئی قدروں کا پیش خیمہ ہے۔ اظہارِ ذات بھی ہے۔ اُن کی شعری کائنات دونوں رنگوں سے عبارت ہے جس میں خوشیاں بھی ہیں اور غم بھی دیگر خواتین شاعرات کی طرح باغیانہ رویہ نہیں ہے۔ اُن کی نظموں میں ایہام بھی ہے اور جدیدیت کی گہری چھاپ بھی۔

مرد اساس معاشرے میں عورت کے وجود کی اہمیت منوانے ، سماجی دباؤ، استحصال اور مساویانہ حقوق کے لیے جدو جہد میں بہت سی خواتین شاعرات کا اہم حصہ ہے انھوں نے کم وبیش تقریباً ایک ہی جیسے رویے کا اظہار کیا ہے لیکن اظہار کے طریقے کی نوعیتیں اور پیمانے کچھ الگ طرز کے ہیں ہر کسی کے اظہار کا اپنا منفرد طریقہ ہے۔ اِس سلسلے میں ایک بلند آواز تانیثی تحریک کی زبردست علمبردار اور حامی کشورؔ ناہید کی ہے جنھیں کسی نے جھانسی کی رانی کہا تو کسی نے پھولن دیوی، اُردو شاعرات کی صف میں باغی شاعرہ بھی کہی جاتی ہیں کیونکہ وہ بلند و بانگ لہجے میں اپنے عورت ہونے کا اعلان تو کرتی ہیں لیکن اُن بندشوں یا پابندیوں کو ماننے سے انکار کرتی ہیں جو ایک مشرقی معاشرہ صنفِ نازک ہونے کے ناطے عورت پر عائد کرتا ہے وہ ایک ایسی عورت کی نمائندگی کرتی ہیں جو اپنا آپ منوانا جانتی ہے جو اپنے حقوق کے حصول کے لیے لڑنے مرنے کو تیار رہتی ہے۔ تانیثی تحریک کا اثر اُن کی شاعری سے منعکس ہوتا ہے۔ عورت کے جذبات واحساسات کے بیان کے ساتھ عورت کے مسائل بھی اُن کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔ اُن کے ہاں آج کی جدید عورت

کے مسائل ہیں جو باشعور ہوئے ہیں اپنی زندگی کے تلخ تجربات وحقائق سے دوبدو رہتی ہے۔

'جاروب کش' 'گھاس تو مجھ جیسی ہے' 'نیلام گھر' 'تم سے' 'ترائسیا شہر بھنبھور' 'آبِ خشک اور آگ' 'فادر کمپلیکس' 'کتنی چاہت والے لوگ تیرے دیوانے' 'اے کاتب تقدیر لکھ' 'میں کون ہوں' 'اینٹی کلاک وائز' جیسی نظمیں کشور ناہید کے فکر وفن کی نمائندگی کرتی ہیں۔مغرب کی جدید نظموں کے تجربے بھی انھوں نے کیے ہیں۔

'انٹی کلاک وائز' میں کشور ناہید نے مرداساس معاشرے میں عورت کو درپیش صورت حال کی بہت جامع عکاسی کی ہے جس میں عورت کو 'نصف بہتر' کا درجہ دینے۔اور ترحم آمیز رویہ رکھنے کی صورتِ حال کو بے نقاب کر کے شدید ردِعمل کا اظہار کیا گیا ہے

میرے ہونٹ تمہاری مجازیت کے گن
گا گا کر خشک ہو بھی جائیں تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ میں بول تو نہیں سکتی لیکن چل تو سکتی ہوں۔

میرے پیروں میں زوجیت اور شرم وحیا کی بیڑیاں ڈال کر مجھے مفلوج کر کے بھی/ تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا کہ میں چل تو نہیں سکتی/ مگر سوچ سکتی ہوں/ آزاد رہنے، زندہ رہنے، اور مرے سوچنے کا خوف/ تمہیں کن کن بلاؤں میں گرفتار رکھے گا۔ (کشور ناہید[1]

اُن کی نظموں کا بلند وبانگ لہجہ تانیثیت پسند شاعرہ کی حیثیت سے اُن کی نظریاتی وابستگی کی

---

[1] بیسویں صدی میں خواتین ،اُردو ادب ترتیب وانعقاد، ڈاکٹر عتیق اللہ،مضمون تانیثی ادب کی شناخت اور تعین قدر، مصنف ابوالکلام قاسمی)

شدت اور وحدت کو ظاہر کرتا ہے تانیثی فکر کے اظہار کے لیے انھوں نے دو قسم کے اسلوب منتخب کئے ہیں۔ ایک اسلوب نثری نظموں کا ہے۔ دوسرا آزاد نظموں پر مشتمل ہے جس میں الفاظ، علامتیں اور فنی لوازمات کا کچھ اِس طرح سے اہتمام کیا گیا ہے کہ جو انہیں نہ صرف تانیثیت پسند شاعرہ بلکہ ایک قابلِ توجہ شاعرہ کی حیثیت سے اُن کی اہمیت منوانے کے لیے ثبوت فراہم کرتا ہے۔ فہمیدہ ریاض کے مقابلے میں کشور ناہید نے نہ صرف تانیثیت پسند شاعرہ کی حیثیت سے فکری وفنی لحاظ سے اپنی شناخت بنالی بلکہ اپنی ہم عصری شاعرات سے آگے بڑھ گئیں۔ چاہے نثر ہو یا نظم تانیثی تحریک کو اُس کے لوازمات کے ساتھ برتنے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ کشور ناہید کی شاعری میں عورت کے ساتھ روا رکھے گئے رویئے کے نتیجے میں مراد جارہ داری والے معاشرے کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہار ملتا ہے جس میں فکری بغاوت کے ساتھ وہ شعریت کے حسن کو بھی ملحوظ رکھتی ہیں۔

بیشک تانیثی تحریک کی نمائندہ شاعرات میں کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض ایک معتبر حیثیت رکھتی ہیں۔ بعد کی شاعرات کے لب و لہجے میں اِن کی گونج کسی نہ کسی حد تک سنائی دیتی ہے۔

۷۰۔۱۹۶۰ کے آس پاس نمایاں ہونے والی اُردو شاعرات کے موجودہ منظر نامے میں پروین شاکر خواتین کی نئی نسل کی نمائندہ بن کر ابھریں جنھوں نے موضوعات کی رنگا رنگی، اسلوب و تجربات کی ندرت اور نسائی جذبوں کو اپنے مخصوص لب و لہجے میں شاعرانہ پیکر عطا کر کے تانیثی شاعری میں ایک امتیاز حاصل کیا۔ بیان میں بے باکانہ انداز و لہجہ اُن کی ہم عصر شاعرات کے یہاں دکھائی تو دیتا ہے لیکن بہت کم۔ بعض کے یہاں تو مرد عورت کی تقسیم ہی ختم کر دی گئی ہے، جس طرح کہ فہمیدہ ریاض ہیں۔ پروین شاکر کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے عورت ہونے پر فخر کیا بلکہ عورت سے وابستہ محسوسات کا برملا اظہار کیا۔ اُردو کے مشہور نقاد اور محقق ڈاکٹر گوپی چند

نارنگ پروین شاکر کی شاعری سے متعلق اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

''پروین شاکر اُردو کی ایسی خوش اظہار، خوش کلام اور خوش ادا شاعرہ تھیں جن کے بغیر جدید شاعری کا منظر نامہ ادھورا ہے۔ پروین شاکر کو نظم اور غزل پر یکساں قدرت حاصل تھی جن نسائی آوازوں نے اُردو میں ایک الگ پہچان قائم کی تھی وہ اُن میں سے خاص تھیں۔ اُن کا کارنامہ یہ ہے کہ نسائیت کے گہرے اور پراوئیٹ جذبات کو نہایت خوش سلیقی سے شعری اظہار تک لے آتی ہیں۔ اُن کے لہجے میں ایک خاص طرح کا رچاؤ، غنائیت اور بانکپن ہے، ایک فطری بانکپن اور نکھار اور اجلی اجلی رنگت جو صبح کھلنے والے پھول میں ہوتی ہے۔ اپنے رنگ وروپ میں ڈوبا ہوا اور اپنے حسن پر نازاں''۔[1]

پروین شاکر کی شعری کائنات غزل اور نظم دونوں اصناف سے عبارت ہے اگر ایک طرف انھوں نے اپنے خیالات کو غزلوں کا پیراہن دیا ہے تو دوسری طرف اپنی فکر کو نظموں کے سانچے میں ڈھال کر شہرِ سخن کو جلا بخشی ہے۔ پروین شاکر کے پانچوں شعری مجموعے جواب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اُن میں غزلوں کی نسبت نظموں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ نظمیں لکھنے سے انہیں کافی دلچسپی رہی ہے اور اِس میں وہ کامیاب بھی رہی ہیں، نظموں میں انھوں نے اپنی سوچ اور فکر کو زیادہ واضح اور بہتر طریقے سے اجاگر کیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُن کی شہرت نظموں کی بہ نسبت غزلوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ لیکن جب اُن کے پانچوں شعری مجموعوں میں شامل نظموں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ غزلوں کی نسبت انہی نظموں میں زیادہ پُر وقار، سنجیدہ اور مقدس نظر آتی ہیں۔ اور

---

[1] ماہنامہ آجکل نئی دہلی مارچ ۱۹۹۵ء، ص: ۴۶

ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ غزل کے کمرے سے نکل کر نظم کے صحن میں داخل ہوتی ہیں جس طرح کے نظیر صدیقی اور دیگر لوگوں کا کہنا ہے۔ اگر چہ کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں وہ بے باک نظر آتی ہیں اور کچھ موضوعات جو غزلوں میں بیان ہوئے ہیں وہ نظموں میں بھی دہرائے گئے ہیں لیکن پھر بھی سنجیدہ نظموں کی تعداد زیادہ ہے اس طرح اُن کی نظموں کا لہجہ غزلوں سے کافی حد تک مختلف ہے جو آزاد خیالی اُن کی غزلوں میں ہے وہ نظموں میں نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں بھی غالب کی طرح غزل کی تنگ دامنی کی شکایت رہی ہے نظموں میں چونکہ غزل کی نسبت براہِ راست اظہار کا وصف پایا جاتا ہے۔ اور میرے خیال سے نسائی رویوں کے اظہار کے لیے نظم ہی بہترین صنف ہے جہاں تک نظموں کی ہیئت کا تعلق ہے انھوں نے پابند، آزاد اور معریٰ نظم میں اپنے خیالات کا اظہار و ابلاغ کیا ہے، نثری نظمیں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اُن کے یہاں سب سے زیادہ آزاد نظمیں ہیں، جن میں انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کا اظہار بیانیہ اور کہانی کے رنگ میں کیا ہے۔

چونکہ اِس باب کا دوسرا حصہ پروین کی نظمیہ شاعری کے حوالے سے ہے۔ اِس میں پانچوں مجموعوں میں شامل نظموں کا جائزہ لیا جائے گا اِن نظموں کی اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ اِس لیے اِن میں نمائندہ نظموں کا انتخاب بھی کافی مشکل کام ہے اور اِن تمام نظموں کا فرداً فرداً جائزہ لینا بھی کوئی آسان کام نہیں اِس لئے اِس باب میں میں نے بحیثیت مجموعی اِن کی نظموں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

پروین شاکر اگر چہ اردو شاعرہ کی حیثیت سے ملکی وغیرہ سطح پر جانی جاتی تھیں لیکن انہیں انگریزی پر بھی کافی دسترس حاصل تھی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے انگریزی ادب میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز بھی انگلش لیکچرر کی حیثیت سے کیا تھا، ایسا لگتا

ہے کہ وہ انگریزی شاعری سے متاثر رہی ہیں خاص طور پر انگریزی شاعر ڈن سے، اُن کے یہاں اکثر و بیشتر انگریزی طرز کی نظمیں موجود ہیں بعض نظموں کے عنوان بھی انگریزی میں ہیں جس طرح کہ ویسٹ لینڈ، ٹماٹو کیچ اپ، نک نیم، مسفٹ، کتھارسس، Good to see you، Hot line، وینٹی دی نیم از۔ انگریزی کے علاوہ فارسی، عربی اور کہیں کہیں ہندی کے الفاظ بھی اُن کی نظموں کی زینت بنے ہیں جو اُن کی تحریر کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں ایسی مثالیں ہماری اُردو شاعری میں بہت کم ملیں گی۔ اسلوب اور خیالات کے اعتبار سے اُن کی نظمیں جدید ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد ہیں انھوں نے مغربی جدیدیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کبھی نہیں کی بلکہ اُن کے اسلوب کی جڑیں اُن کی اپنی ذات اور اُن کے ماحول سے وابستہ ہیں انھوں نے جو بھی لکھا اپنے ذہن اور روح کے تقاضوں کے مطابق لکھا موضوعات کے اعتبار سے بھی اُن کی نظمیں متنوع اور رنگارنگ ہیں۔ گہرائی سے دیکھا جائے تو اُن کی نظمیں تخلیقیت پسندی، تاثیر آفرینی، اور عصری حسیت، سیاسی و سماجی شعور اور ادراک جیسی خصوصیات سے مالا مال ہیں۔

اُردو زبان کے معروف استاد اور محقق ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے پروین کی نظم نگاری کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''پروین کی بیشتر نظمیں اُس کی اپنی ذات، اُس کے محبوب، اور اُس کی پھیلی ہوئی کائنات کا مطالعہ تذکرہ اور صحیفہ ہیں۔ اِن نظموں میں بے حد پھیلاؤ اور بے حد ارتکاز ہے۔ یہ یکجائی آپ کو آسانی سے کسی اور جدید فن کار کے ہاں نہیں ملے گی''۔[1]

پروین شاکر کی تقریباً تمام نظمیں غیر معمولی ہیں۔ اِن میں پروینؔ نے اپنے جذبات و

[1] مضمون اِک خوشبو تھی جو اُڑ گئی، مصنف آغا مسعود حسین، ص: ۱۳۷ بشمولہ ''خوشبو پھول تحریر کرتی ہے'' لفظ لوگ پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۶ء۔

محسوسات، تجربات ومشاہدات کوقلمبند کیا ہے، کئی مشہور ہستیاں بھی اُن کی نظموں کا موضوع بنی ہیں۔ اُن کے یہاں بہت زیادہ طویل نظمیں نہیں ہیں جبکہ اکثر نظمیں ڈرامائی اورافسانوی طرز پر ہیں۔جن میں کوئی فکر وخیال نظم کا عنوان بنا ہے یعنی آغاز بھی ہے اور اختتام بھی۔ پوری نظم پڑھنے کے بعد ہی قاری پر نظم کے مفاہیم اجاگر ہوتے ہیں جو شروع تو طربیہ انداز میں ہوتی ہیں لیکن اُن کا اختتام کامیڈی یا المیہ پر منتج ہوتا ہے۔

اب ہم پروین شاکر کے پہلے مجموعے ''خوشبو'' کی طرف آتے ہیں مختصراً اِس کا ذکر شخصیت والے باب میں ہو چکا ہے اب یہاں اِس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی ''خوشبو'' اُن کے اُس دور کے کلام پر مشتمل ہے جب وہ نوعمر تھیں اور اُن کے شعور میں ابھی پختگی نہیں آئی تھی۔ اِس لئے خوشبو کسی حد تک اُن تلخ حادثات سے معریٰ ہے جو''صد برگ'' اور خود کلامی' کا جوہر ہے۔اگر چہ یہ ابتدائی نظمیں ہیں لیکن اِس کے باوجود اُن کے پختہ شعور کا پتہ دیتی ہیں زبان و بیان کے لحاظ سے بھی پختگی اورفنی ہنرمندی کا احساس نمایاں ہے۔خود لکھتی ہیں۔

> ''خوشبو کی اشاعت میری پندرہ برس سے پچیس برس کے دوران کی شاعری ہے بعد میں آنے والے مجموعے ایک مختلف نوعیت کے ہیں۔ظاہر ہے کہ اِس دوران ایک قاری کے نقطۂ نظر سے ''خوشبو'' اور خود کلامی کے مابین خاصا فاصلہ دکھائی دیتا ہے۔[1]

بلا شبہ ''خوشبو'' ایک معصوم، الہڑ اور شوخ دوشیزہ کے جذبات واحساسات کی ترجمان ہے جو پہلے پہل کے 'ان دیکھے' 'ان چھوئے' اور 'ان کہے' جذبوں سے آشنا ہو کر ایک ایسی سرسبز وادی میں

---

[1] مضمون ماہِ تمام ناتمام، مصنف ڈاکٹر سعادت، بشمولہ معاصر صفحہ ۶۴ مرتبہ عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد

قدم رکھتی ہے۔ جہاں تاحدِ نظر پھول ہی پھول ہیں لیکن پھول چنتے چنتے اُس کی آشنائی کانٹوں سے بھی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ہاتھ لہولہان کر بیٹھتی ہے وہ اِس وادیٔ حسن و عشق کی داستان کانٹوں کی چبھن سمیت سب بے خوف و خطر کہہ ڈالتی ہے بس یہی کہانی 'خوشبو' کا موضوع ہے۔ اِس لیے 'خوشبو' میں محبوب کے لیے والہانہ جذبات، خود سپردگی کے لطیف احساسات کے ساتھ ساتھ محبوب کی بے اعتنائی و بے رخی، ناکامی و ناامیدی، بے بسی اور تنہائی جیسے موضوعات کثرت سے ہیں۔ رومانی تجربوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے زندگی کے تلخ حقائق سے نظریں نہیں چرائیں بلکہ زندگی کے یہ دونوں پہلو اُن کے یہاں متوازی طور پر دکھائی دیتے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ غموں کو زندگی کی ٹھوس حقیقتیں سمجھ کر خوش دلی سے قبول کر لیتی ہیں اُن کی شاعری خوشی اور غم کا سنگم معلوم ہوتی ہے۔

آفتاب احمد خان نے پروین شاکرؔ کی شاعری کے بارے میں بالکل صحیح کہا ہے کہ

> ''پروین شاکرؔ نے اپنی شاعری کے سفر کا آغاز ''خوشبو'' کے وطن یعنی خوش رنگ پھولوں، خوشنما رنگوں اور خوش نوا طائروں کی وادی سے کیا مگر جلد ہی زندگی نے اُن کی راہ میں کانٹوں کے جال بچھا دئے چونکہ وہ طبعاً گلشن پرست واقع ہوئی ہیں لہٰذا انھوں نے پھول ہی نہیں چنے، کانٹے بھی سمیٹ لئے، نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی شاعری میں غم و خوشی کی لہریں بیک وقت ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہیں، تخلیق کی دیوی اُن کے ہاں بہ چہرہ تبسم بہ چشم تر آئی ہے''۔[1]

پروین شاکرؔ کے یہاں عورت کی خوشیاں غم، دکھ سکھ، جذبے، احساس، علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں اظہار پا گئے ہیں موضوعات کی رنگارنگی تجربات کی فراوانی اُن کی نظموں میں

---

[1] مضمون ماہِ تمام ناتمام، مصنف ڈاکٹر سعادت سعید، ص: ٦٠، مرتبہ عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد

زندگی پیدا کردیتی ہے۔ایسی زندگی جس میں ٹھہراؤ نہیں بلکہ ثیمابیت ہے۔''خوشبو'' میں شاعرہ زیادہ تر حصارِ ذات، میں الجھی ہوئی ہیں ویسے تو رومانی دنیا میں کافی وسعت اور گہرائی ہے ہر گام پر نت نئے حوادث اور تجربوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اِس ''حصار'' میں انھوں نے روزن بھی رکھے ہیں جن کے ذریعے وہ باہر کی دنیا کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں اور بیرونِ 'حصار' کی ہوا 'حصار' کے اندر کی خوشبوؤں سے ٹکراتی رہتی ہے۔

ہوا اور نظروں کے اسی لمس کے سہارے انھوں نے اپنے اندر کی لڑکی کو منکشف کردینے کی خدا سے جو دعا مانگی تھی وہ 'خوشبو' میں پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''خوشبو'' میں اُن کے اندر کی معصوم سی شبنمیں رخساروں اور حیران آنکھوں والی لڑکی پوری منکشف ہوچکی ہے جبھی تو اُسے چاند کی تمنا کرنے کی عمر میں ذات کے شہرِ ہزار در کا اسم عطا کردیا گیا۔ جسے وہ ''آشوب آگہی''[1] کے عذاب سے تعبیر کرتی ہیں یہ آشوب آگہی کا سفر 'خوشبو' سے شروع ہوکر 'صد برگ' خود کلامی'، 'انکار' 'کفِ آئینہ' تک جاری وساری رہتا ہے اور ''ماہِ تمام'' کی صورت میں اختتام کو جا پہنچتا ہے۔ یہ 'آشوب آگہی'' ہی تو ہے جس کی مختلف صورتیں ہمیں اُن کی پوری شاعری میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ انکشافِ ذات' کے عمل کے دوران ریگ زاروں کی آبلہ پائی کی ساری داستان وہ قارئین کے گوش گزار کرتی ہیں۔جس کے بطن سے وہ دانش و وجدان کی تمام ممکنہ سرحدوں تک رسائی حاصل کر لیتی ہیں۔'شہر ہزار در' کے جتنے بھی دروازے ہیں اُس سے نئے نئے مناظر طلوع ہوتے ہیں جس میں وہ دوسروں کو بھی حصہ دار بنالیتی ہیں۔

نوعمر لڑکیوں کی نفسیات اور جذباتی کیفیات کی اتنی سچی اور اتنی واضح عکاسی اتنے سلجھے ہوئے

---

[1] دیباچہ 'خوشبو' ص:۱۷

انداز میں کسی اور کے یہاں مشکل سے ہی ملے گی ۔محبت کا یہ المیہ بدن وروح میں ارتعاش اور تھرتھراہٹ کی کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اُن کی شاعری میں اور خاص طور سے پہلی کتاب، ''خوشبو'' میں شامل نظمیں انہی خیالات کی آئینہ دار ہیں۔اور یہی پروین کی شناخت کا باعث بنیں ۔نمونے کے طور پر مندرجہ ذیل نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں۔'احتیاط'،'اعتراف'،'کشف'،'گماں پیار'،بس اتنا یاد ہے'،'پہلے پہل'،'کنگن بیلے کا'،'کانچ کی سرخ چوڑی'،'پکنک'اور'اندیشہ ہائے دور دراز'پیش کی جاسکتی ہے۔'کشف کا ایک بند ملاحظہ کریں۔

ہونٹ بے بات ہنسے
زلف بے وجہ کھلی
خواب دکھلا کہ مجھے
نیند کس سمت چلی
خوشبو لہرائی، میرے کان میں سرگوشی کی
اپنی شرمیلی ہنسی میں نے سنی
اور پھر جان گی
میری آنکھوں میں تیرے نام کا تارہ چمکا

'کشف' میں ایک لڑکی کے حوالے سے مختلف جذباتی کیفیات کا اظہار ہے، جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اچھوتے جذبوں کا انکشاف ہو رہا ہے۔وہ جذبے ابھر کر سامنے آرہے ہیں جن سے وہ پہلے انجان تھی۔تبھی تو ہونٹ خود بخود مسکرانے لگتے ہیں زلف بے وجہ کھلتی ہے تن من میں خوشبوئیں بسیرا کرنے لگتی ہیں۔جو اِس بات کا ثبوت ہیں کہ کوئی خوابوں کا شہزادہ من مندر میں آبسا

ہے۔فضا میں جلترنگ بج اٹھے ہیں۔تبھی جاگتی آنکھوں میں سپنے سجنے لگتے ہیں یہی سبب ہے کہ اپنی شرمیلی ہنسی خود اپنے لئے بھی حیرت کا باعث بنی ہے۔ دوسری نظم 'احتیاط' میں بھی یہی کیفیات ملتی ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

سوتے میں بھی
چہرے کو آنچل سے چھپائے رہتی ہوں
ڈر لگتا ہے
پلکوں کی ہلکی سی لرزش
ہونٹوں کی موہوم سی جنبش
گالوں پر رہ رہ کے اترنے والی دھنک
لہو میں چاندر چاتی اس ننھی سے خوشی کا نام نہ لے
نیند میں آئی ہوئی مسکان
کسی سے دل کی بات نہ کہہ دے[1] 'خوشبو'

اِس نظم میں کچی عمر کی لڑکیوں کی سادگی اور معصومیت کا ذکر ہے کہ اِس عمر میں لڑکیاں صرف خواب دیکھتی ہیں انہیں ان کی تعبیر سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کو زندگی کی معراج سمجھ لیتی ہیں جس کو چاہتی ہیں سوتے جاگتے میں صرف اُسی کے خیال اور تصور میں کھوئی رہتی ہیں۔ من چاہے ساتھی کے تصور سے ہی گالوں پر شفق پھوٹتی ہے ہونٹ بے وجہ مسکرانے لگتے ہیں کسی کو پا لینے کی خوشی دنیا کی ہر شئے سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی چاہت کے اِس انمول خزانے

---

[1] خوشبو، ص:۲۸

کو سینت سانت کر زمانے کے ڈر سے دِل کے نہاں خانوں میں چھپائے رکھنا چاہتی ہیں۔محبت سے متعلق اِن معصوم تاثرات کو پلکوں کی لرزش ہونٹوں کی جنبش، گالوں پر اترنے والی دھنک، لہو میں چاندر چاتی خوشی جیسے لفظی ترکیبوں، استعاروں اور پیکر تراشی کے ذریعے بہت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اِس طرح کے احساسات کا اظہار نظم 'پہلے پہل' میں ہوتا ہے جس میں ایک ایسی لڑکی کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے جو پیار کی کونپل پھوٹنے کے بعد کچی عمر کے جذبوں سے سرشار ہے۔ اپنے محبوب سے ملنے کے بعد اس قدر خوش ہے کہ اِسی خوشی کو چھپانا چاہ رہی ہے مگر وہ خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتی ہے۔ ہر آہٹ پر چونک جاتی ہے اپنے آپ سے بھی ڈر جاتی ہے کہ کہیں چہرے کی تمتماہٹ جو کہ محبوب سے ملنے کی وجہ سے ہے اُس 'راز' کو افشانہ کر دے۔ یہاں تک کہ ہوا سے بھی بچنا چاہتی ہے۔ کیونکہ ہوا کے ہاتھ اگر یہ ''خوشبو' لگ گئی تو پھر وہ اُسے زمانے بھر میں پھیلا دے گی۔ اور پھر زمانہ تو سدا سے ظالم ہی ٹھہرا اِس میں کوئی شک نہیں کہ پروین کی ''خوشبو' والی شاعری ایک نوعمر لڑکی کے 'پہلے پہل' کے جذبوں کی مہک سے مزین ہے۔ معصوم جذبے اور احساسات چانداور چاندنی موتیے، گلاب، بارش، اور دھنک کے رنگوں، تتلیوں کی شکل میں تشبیہہ و استعارات کا روپ دھار کر اظہار پاتے ہیں۔ اِن میں سوز و گداز بھی ہے اور قلبی واردات کا آئینہ بھی اظہار کی پرتوں میں تہہ در تہہ معنی کا ایک جہاں آباد ہے جو خوشبوؤں خوابوں خیالوں یادوں اور تاثرات سے عبارت ہے۔اُن کی ساری شاعری عورت کے نفسیاتی منظر نامے کی پوری ترجمانی کرتی ہے۔ کیونکہ انہیں عورت کی نفسیات کا تجزیہ کرنے میں کمال حاصل ہے۔نفسیاتی بصیرت سے کام لیتے ہوئے پروین نے گونگے جذبوں کو قوت گویائی عطا کر کے عشق و محبت کے احساسات کی بہت خوبصورت رنگ میں تہذیب کی ہے پروین کی شاعری سستی قسم کی رومانیت اور

مریضانہ قسم کی جذباتیت سے پاک ہے۔ بقولِ امجد اسلام امجد۔

''اردو ادب میں سچے نسائی محسوسات اور جذبوں کی شاعری بہت کم ہے اور اِس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری شاعرات نے آنکھیں بند کر کے اُردو زبان اور شاعری کے مروجہ آہنگ کی پیروی کی ہے جبکہ اِس آہنگ کا بنیادی ڈھانچہ مردوں کا ترتیب دیا ہے۔ پروین کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُس نے اپنی خوبصورت، نرم و نازک، اور فوارے کی طرح ابھرتی اور پھسلتی ہوئی شاعری کے ذریعے اُردو شاعری کے اسالیب میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ پروین کی شاعری میں آپ کو ایک عورت سے زیادہ ایک لڑکی کی آواز سنائی دے گی ایک ایسی لڑکی کی آواز جو خوبصورت پھول چننا جانتی ہے اور انہیں گلدان میں سجانا بھی''۔[1]

پروین شاکی کی نظموں کے موضوعات نظم کے متن سے پوری طرح میل کھاتے ہیں نظم کے عنوان کو دیکھ کر ہی نظم کا قاری اندازہ کر سکتا ہے کہ نظم کس سے متعلق ہے اِس میں کیا مواد ہو سکتا ہے۔ خوشبو میں شامل نظمیں رومان و جمالیات میں رچی بسی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر 'خوشبو' میں شامل نظموں کے عنوانات کچھ اس قسم کے ہیں۔ 'خوشبو کی زبان'، 'کنگن بیلے کا'، 'بسنت بہار کی نرم ہنسی'، 'گوری کرت سنگھار'، 'بنفشے کا پھول'، 'رات کی رانی کی خوشبو'، 'فلاورشو'، 'سرِ شاخِ گل'، '' کانچ کی سرخ چوڑی'، 'دھوپ کا موسم'، 'خوشبو' کی طرح دیگر مجموعوں میں بھی یہی رجحان کارفرما نظر آتا ہے یعنی نظم کا عنوان نظم کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے، اِس سلسلے میں نظیر صدیقی اپنے خیالات کا اظہار کچھ اِس طرح سے کرتے ہیں ملاحظہ کیجئے

[1] ایک بڑی شاعرہ، مصنف، انجم یوسف زئی، ص: ۱۴۱، بشمولہ خوشبو پھول تحریر کرتی ہے ترتیب و تدوین ڈاکٹر سلطانہ بخش۔

''چونکہ وہ شاعری میں صرف اظہار کی ہی نہیں ابلاغ کی بھی قائل ہیں۔ اِس لئے اُن کی نظموں کے ذاتی اور داخلی ہونے کے باوجود پڑھنے والوں کو اُن کی شاعری کے ادراک میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اُن کی نظموں کے عنوانات قاری کو بڑی مدد دیتے ہیں اُن کی بیشتر نظموں کو پڑھنے کے بعد جب اُن پر دوبارہ نظر پڑتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے عنوان نے نظم کے تجربے کو ''crystalize'' کر دیا ہو اِن کی نظموں میں جس عشق کی مصوری ملتی ہے وہ سادہ بھی ہے اور ''Sophisticated'' بھی ہے۔[1]

پروین کی نظموں میں ہر طبقے کی عورت اپنے ذہنی و جذباتی رویوں سمیت جلوہ گر ہے چاہے مزدور پیشہ عورت ہو یا اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی خاتون ،ان پڑھ گھریلو عورت ہو یا اعلیٰ عہدے پر فائز، سب کے اپنے مسائل اور المیے ہیں۔ اپنی سوچیں، خواب، آرزوئیں، امنگیں ہیں وہ دکھ درد بھی موضوع بحث بنے ہیں جو حوا کی بیٹی کے مقدر کی لکیروں کا خاصہ ہیں۔ مرد اساس معاشرے میں عورت کو کمزور سمجھ کر اُس کا استحصال، ظلم، انصافی جیسے موضوعات پر تفصیلی اظہارِ خیال ملتا ہے۔ وہ معاشرے کے فرسودہ رسم و رواج سے بغاوت کرتی ہیں اور یہی جزبہ انہیں جبر و حبس کے موسموں کی نفی کرنے پر مائل کرتا ہے۔ معاشرے کی تنگ نظری اور دوہرے نظامِ معیار کا ذکر اُن کے ہاں بہت مؤثر انداز میں ملتا ہے۔ وہ عورت کی بے بسی پر کڑھتی ہیں اِس لئے مزاحمتی طرز کا اندازِ بیان نہ صرف ان کی نظموں میں بلکہ غزلوں میں بھی ملتا ہے۔ پروینؔ کے یہاں احتجاج کی کئی صورتیں ہیں

---

[1] مضمون: ''زخمِ جگر سے نقشِ ہنر تک کا ایک سفر'' مصنف نظیر صدیقی، بشمولہ خوشبو کی ہمسفر ص:۱۰۴، ترتیب و تدوین ڈاکٹر سلطانہ بخش۔

پہلی احتجاجی صورت مرد اساس معاشرے میں عورت سے نا انصافی کے حوالے سے ہے۔اُن کے مطابق مرداجارہ داری والے اِس معاشرے میں عورت کوکس کس طرح اپنے ارمانوں کا گلہ گھونٹنا پڑتا ہے۔معاشرہ کیسی کیسی حدیں اورقدغنیں اُس پرلاگو کرتا ہےاورعورت کی بےبسی ومجبوری دیکھئے کہ اُسے دوسرے درجے کےشہری کی حیثیت سے نہ چاہتے ہوئے بھی اِن خودساختہ روایت وقوانین کی پاسداری کرنی پڑتی ہےجس بات کے لیےعورت معیوب ومعتوب ٹھہرائی جاتی ہے وہ مرد کے لیے باعثِ افتخار سمجھی جاتی ہےعورت کے جذبات واحساسات پسند وناپسند کی کوئی قدر و قیمت نہیں وہ دوسروں کے طے کردہ بنے بنائے سانچے میں ڈھلنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے اُن کے یہاں کئی نظموں میں عورت کی بےزبانی اورمظلومیت کا اظہار ملتا ہے۔جن میں عورت کے استحصال کے کئی رنگ ہیں۔ اِن میں ناٹک، مجبوری، نارسائی، پہرے،بنفشے کا پھول، نک نیم ، کتوں کا سپا سنامہ، کنیا دان، بشیرے کی گھر والی، اسٹینو گرافر جزیہ، پوسٹ ڈیٹز آئیٹم ،لیڈی آف دی ہاؤس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ان نظموں میں موضوعات کے علاوہ ان کی فنی ہنرمندی کے بہت عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جوانہیں اپنی ہمعصرشاعرات سے ممتاز کرتے ہیں۔آج جبکہ دنیاترقی کے بامِ عروج پر ہے بظاہرعورت مردوں کے شانہ بشانہ زیست کے ہرموڑ پر گامزن ہے ایسے میں اُس کی تحقیر و تذلیل کے طریقے نئے ہیں لیکن نوعیت وہی پرانی ہے جوصدیوں پہلےتھی نظم ''صرف ایک لڑکی'' میں تمثیلی انداز میں شاعرہ عورت کوسماج کے خودساختہ رسم ورواج میں جکڑی ہوئی عمرقید کی ملزم بتاتی ہیں۔ اِس نظم میں لفظوں کی سب کڑیاں باہم مربوط ہیں نظم کے مرکزی موضوع سے مناسبت رکھتے ہوئے تلازمے نظم میں جان پیدا کردیتے ہیں۔ اِسی قسم کی ایک نظم، ''بنفشے کا پھول'' ، کا تجزیہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ نظم وڈزورتھ کی نظم A Violet under a hidden rock'' سے متاثر ہوکرلکھی گئی

ہے اِس میں علامتی انداز میں بنفشے کی کہانی ہے جو جنگل کی وسیع وعریض کیف آور مست ہواؤں میں پنپنے سے لے کر ایک امیر آدمی کے ڈرائنگ روم کی زینت بننے تک کے عمل پر مشتمل ہے اصل میں شاعرہ اِس کے ذریعے یہ بات واضح کرنا چاہتی ہیں کہ ایک لڑکی کی زندگی کا سہانا بچپن بابل کے دیس میں گڈے گڑیا کے بیاہ رچانے، ساون رتوں میں جھولے جھلانے، روپہلے سپنے سجانے میں بیت جانا ہے۔ بچپن کا دور بیتتے ہی جب اس لڑکی کی آشنائی پیا کی تنگ گلیوں سے ہوتی ہے تو سارا منظر نامہ بدل جاتا ہے۔ انجان لوگوں اور انجان ماحول میں وہ اپنے اندر کیسی گھٹن، حبس اور اپنی تمناؤں، امنگوں اور خوابوں پر کیسے کیسے جبر محسوس کرتی ہے فرائض اور ذمہ داریوں کے انبار کے ایک لامتناہی سلسلے میں پھنس کر کس طرح اپنے آپ سے بچھڑ جاتی ہے وہ بچپن کے اُس سہانے، بےفکرے دور کی پرچھائیوں کو تلاشتی رہتی ہے جو وقت کی بھول بھلیوں میں کہیں کھو گیا ہوتا ہے، ''نک نیم'' میں کم و بیش یہی صورت حال ملتی ہے عورت جس کے وجود سے تصویر کائنات میں رنگ ہے وہ اپنی اصل حقیقت سے آگاہ ہے پروین شاکر عورت کے اعتبار کی شکست وریخت کا اِن الفاظ میں ذکر کرتی ہیں۔

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو:
جو پہنا دو، مجھ پہ سجے گا
میرا کوئی رنگ نہیں
جس بچے کے ہاتھ میں تھما دو
میری کسی سے جنگ نہیں
سوتی جاگتی آنکھیں میری

جب چاہو بینائی لے لو
کوک بھرو اور باتیں سن لو
پیار کرو آنکھوں میں بساؤ
اور پھر جب دل بھر جائے
دل سے اٹھا کے طاق پہ رکھ دو
تم مجھے گڑیا کہتے ہو ٹھیک ہی کہتے ہو۔

تمثیلی انداز کی اِس نظم میں گڑیا کے کردار کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت گڑیا کی طرح بظاہر دل لبھانے والی لیکن بے جان سی مخلوق ہے کیونکہ اِس کی زندگی پر دوسروں کی اجارہ داری ہے۔ اِس کا مجازی خدا جس رنگ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہے وہ اُسی میں رنگی جاتی ہے اُس کا من چاہے تو اُسے سجائے سنوارے دل کے سنگھاسن پہ بٹھا دے دل بھر جائے تو پیروں تلے سے زمین کھینچ لے دونوں صورتوں میں وہ روبوٹ کی طرح اپنے آقا کے فرمان کی پابند ہے اُس کے سسٹم میں حکم عدولی کی کوئی گنجائش نہیں مرد کی خوشیوں سے ہی اُس کی سلامتی مشروط ٹھہری ہے وہ خود کچھ بھی نہیں سوائے اِس کے کہ جو کچھ وہ اُس کے اندر دیکھنا چاہتا ہے وہ ویسی ہی بننے کی کوشش کرتی ہے۔

پروین شاکر اپنی نظموں میں مرد اساس معاشرے کی عورت پر بالا دستی کا برملا اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف ایک ایسی عورت کی نمائندہ بن کر بھی ابھرتی ہیں جو خلوص و وفا کا پیکر ہے، ایثار و ہمدردی کی خوگر ہے صبر و رضا کا مجسمہ ہے جو محبوب کے در پر سر جھکانے میں ہی اپنی شان سمجھتی ہے۔ جو ایک بار کسی کو دل دے تو پھر اُس کے پاس اُس کا اپنا کچھ نہیں رہتا اُس کے خواب خیالات، آرزویں سب اُس ایک شخص سے وابستہ ہو جاتے ہیں جس کے ساتھ وہ زیست کی شاہراہ پر چلنے کا

عہد کرتی ہے وہ دل و جان سے اُس کی ہو جاتی ہے اُسے ٹوٹ کر چاہتی ہے اُس کے بغیر اپنا آپ ادھورا سمجھتی ہے۔ پروین کی بہت سی نظمیں اِسی محور کے گرد گھومتی ہیں جو خود سپردگی اور والہانہ محبت کے جذبات سے سرشار ہیں۔ مثلاً 'موسم کی دعا' 'ڈیپارٹمنٹل سٹور' 'خوشبو کی زبان' 'رفاقت' 'تشکر' 'ویسٹ لینڈ' اور 'پرزم' انہی خیالات کو منعکس کرتی ہیں۔ 'پرزم' میں شاعرہ نے تمثیلی انداز میں سورج اور پانی کے قطرے کی علامتوں کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح پانی کے قطرے پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو اُس میں 'دھنک' کے رنگ پھوٹتے ہیں بالکل اُسی طرح عورت کی زندگی میں ایک مرد کی اہمیت ہے وہ مرد اپنی نظرِ کرم سے اپنی التفات سے اُس کی خوشیوں اور امیدوں میں دلکش رنگ بھر دیتا ہے جیسے ہی وہ بے توجہی و بے اعتنائی برتتا ہے تو وہ عورت سادہ و بے رنگ پانی کے ایک قطرے کی مانند رہ جاتی ہے یعنی ویران اور زندگی سے خالی۔ وہ مرد کی بدولت ہی زندگی کے رنگوں سے بھرپور تھرکتی، ناچتی نظر آتی ہے۔

''پرزم''

میرا بھی اِک سورج ہے
جو میرا تن چھو کر مجھ میں
قوسِ قزح کے پھول اگائے
ذرا بھی اُس نے زاویہ بدلا
اور میں ہو گئی
پانی کا اِک سادہ قطرہ

بے منظر بے رنگ [1]

یہ ایک حقیقت ہے کہ پروین شاکر کی شاعری کے تخلیقی سوتے تخیل کی مضمون آفرینی کے بدلے تجربات و مشاہدات کی گہرائیوں او پنہائیوں سے پھوٹتے ہیں۔ان کی نظموں میں کہیں 'آورد' ہے تو کہیں 'آمد' کا احساس ہوتا ہے۔لیکن دونوں صورتوں میں احساس کی شدت ان کے شعور وحواس پر غالب رہتی ہے۔دوسری خوبی تصنع اور بناوٹ سے پاک ان کا لب ولہجہ ہے سچے اور حقیقت پسندانہ پیرائے میں ان کے شعری تجربے اظہار پاتے ہیں۔ان کے مطابق جب کسی خیال یا جزبے کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا جائے تو اس سے تخلیق کا حسن بڑھ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں پاکیزہ جزبے، اچھوتے خیال، شفاف ونادر سوچیں نرم ونازک لطیف لفظوں کے پیراہن سے مزین ہیں۔ان کے تجربات اور فکر وخیال کے اظہار میں سچائی کی بازیافت ہی شروع سے آخر تک چھائی ہوئی ملتی ہے۔اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب شگفتہ،تروتازہ اور لطافتوں سے بھرپور ہے جیسے کوئی معطر ہوا جھونکا دھیرے سے چھو کر گزر جائے اور اس میں اتنی تازگی ہو کہ دل و دماغ معطر ہو جائیں۔اس سلسلے میں خود بھی اظہارِ خیال کرتی ہیں۔

> ''شاعری میں صداقت کی قائل ہوں تصنع شاعری کے لباس پر ایسی آرائش ہے جو نظر کو شاید بھلی لگے لیکن دل پر بڑا بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ [2]

سچ تو یہ ہے کہ پروین شاکر کی شاعری عورت کے جذبات ومحسوسات کی شاعری ہے پروین کے یہاں جس عورت کا پیکر ابھرتا ہے وہ خالصتاً مشرقی ہے جو پیکر شرم وحیا ہے، جو مجسم حسن ووفا ہے۔وہ

---

[1] ''خوشبو'' ص:٦٠

[2] مضمون ''شاعری کی ایک نئی جہت'' ڈاکٹر سلطانہ بخش بشمولہ ''خوشبو کی ہمسفر'' ص:١٥٨

اپنی محبتوں، چاہتوں اور قربانیوں میں اتنی مکمل اتنی خالص ہوتی ہے کہ اس انمول خزانے کے آگے اپنا سب کچھ ہار جاتی ہے اپنا تن من دھن وار دیتی ہے۔لیکن مرد بلند و بانگ دعوؤں کے باوجود بہت کچھ، بچا رکھتا ہے۔عورت کی معصومیت اور سادہ لوحی کہیے کہ وہ سب دوغلا پن اس کی منافقت سمجھ نہیں پاتی جی جان سے اس پر فدا رہتی ہے اور مرد ان تمام جزبوں کو روند کر اپنی ایک نئی دنیا بسا لیتا ہے۔ ماضی کی ان سب باتوں کو آنے والی کل میں دفن کر کے کھیلا ہوا کھیل پھر سے دہراتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں یہ موضوع بہت واضح طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔مرد کی بے وفائی سنگدلی کا شکوہ کبھی تو ''آنے والی کل کا دکھ'' کی صورت میں ان کے لبوں پر مچلتا ہے تو کبھی ''چاندرات'' اور ''ردِعمل''، ''وہ آنکھیں کیسی آنکھیں''، جیسی نظموں میں نمایاں ہوتا ہے۔نظم ''چاندرات'' سے چند اشعار:

ہوا! کچھ آج کی شب کا بھی احوال سُنا
کیا وہ اپنی چھت پر آج اکیلا تھا؟
یا کوئی میرے جیسی ساتھ تھی اور اس نے
چاند کو دیکھ کے اُس کا چہرہ دیکھا تھا

(چاندرات[1])

جبکہ دوسری نظم میں ''وہ آنکھیں کیسی آنکھیں'' میں یہی صورتِ حال ملتی ہے:

کسی لمحے تم سے روٹھ کے وہ آنکھیں رو دیں
اور تم نے اپنے ہاتھ سے ان کے آنسو خشک کیے

۱۔ خوشبو، ص:۹۶

پھر جھک کر ان کو چوم لیا
(کیا ان کو بھی !!)[1]

پروین شاکر اپنی نظموں میں ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانوں میں جیتی جاگتی نظر آتی ہیں۔ زمانے کے یہ تینوں دھارے بظاہر الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور یکے بعد دیگرے بہتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور زندگی کو خوشیوں اور غموں کی سوغات دے کر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ پروین کبھی تو حال کے جھروکوں سے مستقبل کے واہمات وخدشات کو تکتی رہتی ہیں اور کبھی ماضی کی یادوں کو آواز دیتی رہتی ہیں۔ یادیں جو وقت کی گرد سے دھندلا بھی جائیں، لیکن مرتی کبھی نہیں ہمیشہ ہمارے آس پاس سانس لیتی رہتی ہیں۔ پروین جب بھی یادوں کے سفر پر نکلتی ہیں تو گئی رتوں کا سارا منظر اُن کی نگاہوں میں تازہ ہو جاتا ہے۔ ماضی جو انھیں بہت عزیز ہے وہ یادوں کے مدفن سے گئی رتوں کی شناسا مہک ''تلاشتی'' رہتی ہیں۔'آج کی رات' 'آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی' اور 'رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے جیسی نظمیں انہی خیالات کی آئینہ دار ہیں۔

نظم 'رات کی رانی کی خوشبو' میں دہ گئے موسموں کی شناسا مہک سے مشامِ جاں، کو معطر کر رہی ہیں جو دل کے زخموں کی صورت میں اُن کے پاس موجود ہے وہ اسی مہک سے اپنی روح کا سنگھار کرنا چاہتی ہیں انہی یادوں کے سہارے بھیگی آنکھیں لیے رت جگا منانا چاہتی ہیں وہ ابر پریشان کی طرح گم گشتہ جزیروں کا طواف کرنا چاہتی ہیں تا کہ کچھ سکون حاصل کر سکیں اور بھولے بسرے زخموں کو کرید کر ٹیس، جلن، تڑپ اور کسک کا مزا لے سکیں، زخموں کے یہ خزانے ان کے لیے

---

[1] خوشبو ص:۱۰۹

بہت انمول ہیں کیونکہ یہ بہت پیاری ہستیوں کی دین ہیں۔ ملاحظہ کریں نظم 'رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے':

رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے
آج کی شب نہ مرے پاس آئے
آج تسکینِ مشامِ جاں کو
دل کے زخموں کی مہک کافی ہے
یہ مہک آج سرِ شام ہی جاگ اٹھی ہے

دیومالائی افسانوں کی منتظر موسمِ گل راجکماری کی خزاں بخت دکھی روح کی مانند بھٹکنے کے لیے:

کُو بہ کُو ابرِ پریشاں کی طرح جائے گی
دور افتادہ سمندر کے کنارے بیٹھے گی
پہروں اس سمت تکے گی جہاں سے اکثر
اس کے گم گشتہ جزیروں کی ہوا آتی ہے

اس طرح سے نظم 'آج کی رات' میں گئے وقت کی یادوں کے سمندر سے اٹھتے تلاطم انھیں نیند کی آغوش میں جانے سے روک رہے ہیں کوئی شوخ سی یا دضدی بالک کی طرح ان کی انگلی پکڑ کر ایک ایسے سفر پر نکلی ہے جہاں سے ماضی کے کچھ دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ پیش خدمت ہے 'آج کی رات' کا شعری اقتباس:

نیند پلکوں کی جھالر کو چھوتی ہوئی
اوس میں اپنا آنچل بھگو کے

مرے دکھتے ماتھے پہ رکھنے چلی ہے
مگر آنکھ اور ذہن کے درمیان
آج کی شب وہ کانٹے بچھے ہیں
کہ نیندوں کے آہستہ رو، پھول پاؤں بھی چلنے سے معذور ہیں
ہر بُن مو میں اک آنکھ اُگ آئی ہے
جس کی پلکیں نکلنے سے پہلے کہیں جھڑ چکی ہیں
اور اب رات بھر
روشنی اور کھلی آنکھ کے درمیان
نیند مصلوب ہوتی رہے گی۔[1]

نیند کا پلکوں کی جھالر کو چھونا، نیند کا اوس میں آنچل بھگونا، آنکھ اور ذہن کے درمیان کانٹے بچھنا، نیند کے آہستہ رو پھولوں کا معذور ہونا، بُن مُو میں آنکھ کا اُگ آنا، نیند کا مغلوب ہونا اس نظم میں منتخب لفظوں سے تیار کیئے ہوئے حسی پیکر لاجواب ہیں۔

''زخموں کی مہک'' کو کئی طرح کے حسی پیکر عطا کر کے بیان کیا گیا ہے یعنی زخموں کی مہک کا رت جگا منانا، کو بہ کو بھٹکنا، سمندر کے کنارے بیٹھنا، اس سے پہلے والی نظم میں یادوں کی بھی تجسیم کاری Personification کی گئی ہے۔ اور متحرک پیکروں کے ذریعے اسے اجاگر کیا گیا ہے۔ نینداور مہک کو متحرک پیکروں کی صورتیں دی گئی ہیں۔ اس طرح غیر مرئی عوامل کو متشکل کر دیا گیا ہے۔ یادوں کا رگ و پے میں اترنا، یادوں کا روپہلا چمکیلا سیال صحراؤں کی شریانوں میں بارش، سروش نکہت کی

---

[1] خوشبو ص:۲۲۷

مانند یاد کے بند دریچوں کو کھولنا، یاد کے دریچوں سے رنگوں کا جھلکنا وغیرہ ان نظموں کی لفظیات اگر چہ نئی نہیں ہیں مگر شاعرہ نے ٹھوس اور اچھوتے پیکروں اور منفرد تراکیب و استعاروں کے پیرائے میں انھیں ڈھال کر نئے معنی و مفاہیم سے آراستہ کیا ہے۔

''خوشبو' کے بعد پروین شاکر کے دوسرے مجموعے ''صد برگ'' کا ذکر کیا جائے گا۔ 'خوشبو' کی شاعرہ نے 'صد برگ' سے اپنی ذات اور فن کا ایک اور در وا کر دیا۔ بلاشبہ پروین شاکر کے پانچوں مجموعے ان کی شخصیت کے ایسے سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے ذریعے قاری ان کی شخصیت اور فکر و فن تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ 'صد برگ' میں غمِ جاناں اور غم دوراں کی تصویریں ہیں۔ بغور مشاہدے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خوشبو کے مقابلے میں 'صد برگ' کے موضوعات زیادہ وسیع ہیں حسن و عشق، خود سپردگی کے والہانہ جزبات کے ساتھ عصری مسائل و سیاسی و سماجی شعور اور فکر و فلسفہ کے کئی رنگ ہیں جو کہیں مدھم ہیں تو کہیں بہت گہرے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ 'صد برگ' میں وہ ذات کے حصار سے باہر نکل آئی ہیں۔ اب اُن کے یہاں خوابوں اور خوشبوؤں کا ہی تذکرہ نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی زندگی کا احساس نمایاں ہے۔

'صد برگ' میں لڑکی سے زیادہ ایک عورت کا سنجیدہ مضبوط اور پُراعتماد لہجہ سنائی دیتا ہے، خوشبو کے مدھر و مسحور کن احساسات سے معمور خوابوں اور خیالوں میں رہنے والی لڑکی 'صد برگ' میں زندگی کی کڑی حقیقتوں اور تلخ و تند ذائقوں سے بخوبی آشنا ہو چکی ہوتی ہے۔ وقت و حالات کے بے رحم تازیانے ان کی سوچ اور لب و لہجے میں سختی پیدا کر دیتے ہیں۔ نہ صرف ان کی ذاتی زندگی میں تلخیاں گھل مل جاتی ہیں بلکہ مادرِ وطن پر بھی آمریت اور ظلم و جبر کے بادل سایہ فگن ہو جاتے ہیں۔ لاقانونیت اور حبس و جبر کے موسموں میں اُن کا قلم جو نقش رقم کرتا ہے اس میں طنز کی کاٹ اور احتجاجی

کی آمیزش شامل ہو جاتی ہے۔ پروین کے یہاں احتجاج کی کئی صورتیں ہیں جن میں سے ایک تو مرد اجارہ داری والے معاشرے میں عورت کے استحصال اور ناانصافی کے حوالے سے ہے جو ازل سے ہی عورت کا مقدر بن چکا ہے۔

پروین شاکرؔ عورت کو بتانا چاہتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑی ہو وہ یہ جان لے کہ اس کی اپنی ذات اور جسم و جان کے بھی کچھ تقاضے ہیں جو مرد اجارہ داری والا معاشرہ دینے کو تیار نہیں ۔ جدید دور کی باشعور اور حساس عورت ہونے کے ناطے وہ صرف اپنی ذات سے وابستہ معاملات و مسائل سے نہیں الجھتیں بلکہ اجتماعی شعور کی بناء پر عورت کی نفسیات، اس کے مسائل اور اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا احساس بھی رکھتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ مرد اجارہ داری والے معاشرے میں عورت ہمیشہ ناکردہ گناہوں کی چکی میں پستی آئی ہے۔ پروین شاکرؔ کی شاعری میں دوسرے احتجاجی صورت معاشرے کے ایک مہذب اور ذی شعور فرد کی حیثیت سے ہے۔ جو معاشی و معاشرتی ناہمواریوں، بے اعتدالیوں اور معاشرے میں پائے جانے والے تضادات اور معاشرتی اقدار کے زوال کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ یہ ناہمواریاں آج کے دور کے انسان کا مقدر بن چکی ہیں۔ پروین شاکرؔ انھیں شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ وہ صاف و شفاف پاکیزہ معاشرے کی خواہاں ہیں جہاں سب کو یکساں بنیادی حقوق کے ساتھ ترقی و ترویج کے بہتر مواقع میسر ہوں۔

۱۹۸۰ء میں جب 'صد برگ' لکھی گئی وہ آمریت کا دور تھا ملک میں مارشل لاء لگا ہوا تھا، ظلم و جبر کے پہرے تھے سچائی اور حق و انصاف پر قدغن تھی، اہلِ علم و ہنر کے لیے دستورِ زباں بندی رائج تھا۔ چونکہ وہ جمہوریت کی علمبردار تھیں جمہوریت کو انسان کا پیدائشی حق سمجھتی تھیں انھوں نے اہلِ وطن

کے دردوکرب کومحسوس کیا اس طرح سیاسی موضوعات اور اس دور کے ظلم وستم کو نوکِ قلم تک لانے کے لیے علامتوں کا سہارا لیا ہے۔

فہمیدہ ریاض نے بھی اسی طرح سے احتجاجی نظمیں لکھیں ایوب خان اور ضیاء الحق کے زمانے میں انھیں معتوب ٹھہرایا گیا، نوکری سے برخاست کر دیا گیا کچھ اس طرح سے پروین شاکر بھی پریشان رہیں۔ آمریت کے اجاڑ موسموں میں پروین نے ڈھکی چھپی زبان استعمال کر کے اپنے خیالات اور احتجاج کو منظرِ عام پر لایا ہے۔ انھوں نے 'صد برگ' کے دیباچے میں کہا ہے کہ 'سچائی جب مخبروں میں گھر جائے تو گفتگو علامتوں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔'[1]

'صد برگ' میں علامتوں کے پس منظر کے بارے میں نیوز لائین کے نامہ نگار کو دیے گئے انٹرویو میں کہتی ہیں:

> Sadbarg was published in 1980 a period of military dictatorship. The sweetness and softness of life was gone. Naturally the harshness and the suffocation that one felt during the period was bound to be reflected in one's poetry as well. Since there was checks and curles on freedom of expression them I consciously tried to convey my feeling and thoughts symbolically, that's why Sadbarag unlike a Khushboo, is not a direct from of poetry.[2]

'صد برگ' میں جبکہ باقی موضوعات بالکل سیدھے سادھے انداز کی نثری طرز کی نظموں میں موجود ہیں۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''خوشبو سے خود کلامی کا سفر کتنے متنوع تجربوں، سوچ کی کتنی نادیدہ جہتوں اور حسنِ

---

1. دیباچہ 'صد برگ'
2. Newslines correspondent Ahmad Salim before her departure for the UK to do her Ph. D at Oxford

اظہار کے کتنے تیوروں سے آراستہ ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شاعری کو ہر طرح کے تعصب اور جانبداری سے بلند ہو کر پڑھتے ہیں۔ پھر یہ شاعری اس لیے لائقِ توجہ نہیں کہ اس میں نسائیت ہے یا نسائی سوچوں، نسائی تجربوں اور مشاہدوں کی شاعری بھی ہے۔اصل چیز یہ ہے کہ پروین اپنے عصر کے حقائق کی کیسی کیسی معنویتوں کو بظاہر سادگی اور بھولپن سے مگر دراصل دانش و وجدان کی تمام ممکنہ رسائیوں کے ساتھ ایک نغمے کی طرح گنگنا دیتی ہے'' ۔[1]

یہ سچ ہے کہ پروین شاکر کی شاعری کا محور عورت اور اس سے وابستہ مسائل تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اعلیٰ فکر و شعور اور حساس ذہن کی بدولت عصری و سماجی مسائل کا بھی واضح ادراک رکھتی ہیں۔ جس کا اظہار ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے وہ زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھتی ہیں اور ناقدانہ انداز میں اپنے آس پاس کا جائزہ لیتی ہیں وہ ان تلخ حقیقتوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں جو انسانیت کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ آج کے دور کا انسان ترقی کے بامِ عروج پر پہنچنے کے باوجود اخلاقی پستی کی انتہاؤں پر ہے اگر چہ قدیم دور کی جہالت جدید رنگ اختیار کر چکی ہے۔ پروین شاکر کی بیشتر نظمیں اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہیں جس طرح ''روزِ سیاہ، مارگزیدہ، لمسِ زر، ادرکنی، اونٹ کا حافظہ رکھنے والے' تقیہ' یا Demone Tization شامل ہیں۔ جن میں صالح اقدار کی نایابی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ صحت مند معاشرے کا اصل معیار اخلاقی قدروں پر ہی منحصر ہوتا ہے جب معاشرے کے افراد اخلاقی حدود و ضوابط کی پاسداری نہیں کرتے وہاں پستی و انحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ نظم ''تقیہ'' میں شاعرہ نے اعلیٰ انسانی قدروں کے زوال کو موضوع بنایا ہے کہ آج کے دور کا انسان

---

[1] مضمون 'خود کلامی کی پروین' بشمولہ 'خوشبو پھول تحریر کرتی ہے' مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، لفظ لوگ پبلی کیشنز ۲۰۰۲، ص:۱۳

مادیت پرستی کی دوڑ میں صالح قدروں سے منحرف ہو کر انسانیت کے مرتبے سے کس طرح گر رہا ہے۔ یہاں تک کہ معاشرے کے نجیب افراد کو بھی منافقت، جھوٹ، اور وفاداریوں کے بدلے، مصلحت کوشی کا چلن سکھایا جاتا ہے کیونکہ آج کے دور میں شاعرہ کے نزدیک ماضی کے سب عقیدے باطل ٹھہرے ہیں۔حق وانصاف کے پیمانے منسوح ہو چکے ہیں سماج میں برائیاں، بے ایمانیاں اور جعل سازیاں عروج پر ہیں۔مثبت اقدار کا فقدان ہے۔ایسا معاشرہ جس کی بنیادیں جھوٹ پر کھڑی ہوں وہاں سر اٹھا کر جینے کی یہی شرائط ٹھہری ہیں۔ جب پورے معاشرے کی ہوا ہی ایسی زہریلی ہوتو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی اس کے زہریلے اور ضرررساں اثرات سے بچ سکے لیکن اس نظم کے دوسرے حصے میں شاعرہ کا کہنا ہے کہ اس دور میں بھی کچھ افراد ایسے ہیں جو اپنے اسلاف سے ملنے والی صالح قدروں کو سرمایۂ حیات سمجھ کر اپنا دستور العمل بنائے بیٹھے ہیں۔ وہ راہِ حق وصداقت کے امین ہیں لیکن ایسے لوگوں کو راہِ مستقیم پر چلنے کے جرم بے گناہی میں پتھروں میں چنوا دیا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی شاعرہ کا یہ مشورہ ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ ان کے شجرے بھی رکھ دینے چاہیں تا کہ ہزاروں سال بعد ٹیکسلا یا ہڑپہ جیسے تاریخی شہروں کی کھدائی کی جائے تو وہاں سے ان کے شجرے بھی برآمد ہوں جو ان کے اعلیٰ نسب ہونے کا ثبوت فراہم کر سکیں تا کہ آنے والی نسلیں جان سکیں کہ انھوں نے کس پُر آشوب و پُرفتن دور میں اپنے لہو، عقیدے اور ضمیر کی پاسداری کی ہے جس کی انھیں سزا بھگتنی پڑی ہے۔ملاحظہ ہو نظم تقیہ کا شعری اقتباس:

سواب یہ شرطِ حیات ٹھہری
کہ شہر کے سب نجیب افراد
اپنے اپنے لہو کی حرمت سے منحرف ہو کے جینا سیکھیں

وہ سب عقیدے کہ ان گھرانوں میں
ان کی آنکھوں کی رنگتوں کی طرح تسلسل سے چل رہے تھے
سنا ہے باطل قرار پائے
وہ سب وفاداریاں کہ جن پر لہو کے وعدے حلف ہوئے تھے
وہ آج سے مصلحت کی گھڑیاں شمار ہوں گی
بدن کی وابستگی کا ذکر کیا
روح کے عہد نامے تک فسخ مانے جائیں گے۔[1]

اس طرح کی دیگر نظمیں 'روزِ سیاہ اور Demonetization میں شاعرہ سماجی و معاشرتی پستی و انحطاط کی طرف اشارہ کرتی ہیں 'روزِ سیاہ' میں حق کے لیے سورج اور باطل کے لیے ظلمت کی علامتیں استعمال کر کے معنی و مفہوم کو اجاگر کرتی ہیں۔ شاعرہ کے نزدیک پورا معاشرہ زوال اور پستی کی طرف آمادہ ہے لوگوں کی نگاہیں اندھیروں کی خوگر ہو چکی ہیں جب قدریں بے مول ہو جائیں روشنی اور تاریکی جیسے لفظ ہم معنی ہو کر رہ جاتے ہیں کیونکہ لوگوں میں اس بصیرت کا فقدان پایا جاتا ہے جس کی بناء پر وہ اچھے اور برے کو پرکھ سکیں۔ شاعرہ کے نزدیک پورا معاشرہ مجموعی طور پر بے حسی کا شکار ہو چکا ہے۔ اب کوئی صاحب بصیرت حق و باطل کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کرے تو خلقِ خدا کے نزدیک وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی قرار پاتا ہے۔ نظم کے آخر میں شاعرہ خود سے یہ سوال کرتی ہیں کہ میرے وجدان کا کہنا سچ ہے کہ واقعی سورج قتل ہوا ہے؟ اصل میں شاعرہ اپنی بے پناہ بصیرت کی بناء پر اصل حقائق سے آگاہ ہے ایک اور نظم Demonetization میں بھی طنزیہ اور تمثیلی پیرایہ اظہار میں

---

[1] 'صد برگ' ص:۱۳۵

یہی موضوع تکمیل کے مراحل سے گزرا ہے۔اس نظم میں صالح اقدار کی بے مائیگی کو تندو تیز لہجے میں موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔طوالت کے پیش نظر نظم کے چند حصے دیے جاتے ہیں:

قدروں کے نمبر منسوخ ہوئے
شہر میں کچھ ایسی ٹکسالیں پائی گئی تھیں
جن میں سچ کا چہرہ جھوٹ سے بڑھ کر روشن تھا
بازاروں میں لیکن جیسی گرانی تھی
اس عالم میں
افراطِ خواہش،تفریط وقت کے ساتھ
نقدِ جاں کی ارزانی ہی ممکن تھی!
درہم خودداری،دنیا وعزتِ نفس
کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلے
اچھا ہوا
جو ایسی ٹکسالوں پر چھاپے مارے گئے
اور سچائی،نیکی،اور عفو اور خودداری کا خزانہ
بحقِ کذب زمانہ ضبط ہوا[1]

نظم ''مارگزیدہ'' میں سماج میں پنپ رہی الک اور برائی یعنی منشیات کی لعنت کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس میں شاعرہ ان نو جوانوں کے لیے اپنی تشویش کا اظہار کر رہی ہیں جو نشے کی لت میں پڑ کر دنیا و ما

---

[1] صد برگ،ص:۲۴۹،مراد پبلی کیشنز:اسلام آباد

فیہا سے بے خبر گلی کوچوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر پڑے رہتے ہیں۔ یہ نوجوان جو قوموں کی تقدیر کے مالک ہیں اپنے آپ سے بیگانہ ہو کر نشہ آور چیزوں میں ہی راہِ نجات ڈھونڈنے لگے ہیں۔ شاعرہ کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہونے کے سبب تسنیم وکوثر کی نہریں جن کی میراث ٹھہری ہیں ایسی لعاب آلوئ شئے کو زندگی سمجھ بیٹھے ہیں۔ سماج کو بے راہ روی، بدچلنی اور بے ضمیری کی دلدل میں پھنسا دیکھ کر شاعری کا دل تڑپ اٹھتا ہے وہ معاشرتی اصلاح کی خواہاں ہیں۔

پروین شاکر کی نظمیہ شاعری کے موضوعات کافی رنگارنگ متنوع اور وسیع ہیں۔ یہ نہ صرف ان کے کرب ذات کی کمائی ہے بلکہ غمِ زیست کی کہانی بھی ہے۔ یعنی آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ جاہلیت کے زمانے سے لے کر اب تک یعنی آج کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے زمانے میں بھی عورت مرد اساس معاشرے کے نت نئے حربوں کا شکار ہوتی آ رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ اب عورت زندگی کے ہر میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہے او روقت کافی بدل چکا ہے لیکن عورت کا استحصال بدستور ہو رہا ہے۔ اُسے آج کے جدید معاشرے میں جسمانی عیش اور لطف اندوزی کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے یہاں کے سب قانون و قاعدے مردوں کے اختراع کردہ ہیں اور عورت کی معصومیت اور مجبوری ان پر عمل آوری کا باعث بنی ہوئی ہے۔ انھوں نے عورت کی ذات سے وابستہ مسائل دکھوں سکھوں اور محرومیوں کو ایک منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں عظیم اقبال کا کہنا ہے کہ:

> ''پروین شاکر کی شاعری کے وسیلے سے پہلی بار نہ سہی دوسری تیسری یا پھر چوتھی بار ہی سہی عورت اپنی آواز سنائی دیتی ہے یہ جسم و جان کی مختلف کیفیتوں سے معمور اس عورت کی آواز ہے جو سالہا سال سے معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی جبر و استحصال کا

شکار ہوتی رہی ہے اس عورت نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کے ساتھ ساتھ اپنی روح
پر لپٹی ہوئی زنجیروں کو توڑنے کا قصد کر رکھا ہے''۔[1]

اس ضمن میں 'صد برگ' کی یہ نظمیں جن میں آج کی عورت سے متعلق معاملات و مسائل اجاگر ہوتے ہیں میرے خیال سے نمائندہ نظمیں ہیں۔

پوسٹ ڈنر آئیٹم، کتوں کا سپاسنامہ، ایک معقول نکاح، لیڈی آف دی ہاوس، تو بر من بلا شدی، کنیا داں، ورکنگ وومین، اسٹینوگرافر، جزیہ وغیرہ نثری نظمیں شامل ہیں۔

'پوسٹ ڈنر آئیٹم' اور 'کتوں کا سپاسنامہ' یہ دونوں نظمیں ڈرامائی طرز پر مشتمل ہیں اور ان کے عنوانات سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ طنزیہ آہنگ لیے ہوئے ہیں شاعرہ قاری کی توجہ اس طرف مبذول کراتی ہیں کہ جدید دور کی عورت آج بھی کس طرح مردوں کی خوشامد اور چکنی چپڑی باتوں سے استحصال کا شکار ہو رہی ہے۔ خواہ وہ کسی دفتر میں کام کرنے والی کلرک ہو یا اسٹینوگرافر یا کوئی اور بڑے عہدے پر فائز ذی عزت شخصیت مراد یہ ہے کہ ہر طبقے کی عورت قدم قدم پر کبھی گھٹیا اوچھے حربوں سے اور کبھی تو مہذب و شائستہ طریقوں سے بھی مردوں کی بیمار ذہنیت کی زد میں آتی رہتی ہے۔

نظم 'پوسٹ ڈنر آئیٹم' کے شعری کردار نے (جو ایک خاتون ہیں) کھانے پہ کچھ لوگوں کو مدعو کیا مگر مہمانوں نے کھانا بنانے والی کے حق میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے جبکہ وہ شعری کردار خود سمجھتا ہے کہ یہ لوگ مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں۔ اُسے اس بدنیتی کے پردے میں ان کی کوئی خواہش ہوستی صاف نظر آ رہی ہے اس لیے طنز بھرے انداز میں ان کو منہ توڑ جواب دیا جاتا ہے۔

آپ کی زلف کے ہم تو پہلے ہی گویا اسیروں میں تھے

---

[1] مضمون 'پروین شاکر کا شعری سفرنامہ': عظیم اقبال، شیرازہ، ص:۳۸

آج تو آپ کے ہاتھ بھی چوم لینے کو جی چاہتا ہے
اتنا بہت کچھ پھر اتنا مزیدار کھانا
ہمیں تو کوئی معجزہ ہی لگا
اس پر حیران کن بات یہ ہے کہ
اتنی تھکن پر
جبین اور ساری پر کوئی شکن تک نہیں
نظم کا کردار (خاتون) مہمانوں کو یہ کہہ کر چونکا دیتا ہے کہ
شکریہ
اس پسندیدگی کا بہت شکریہ
اب یہ فرمائیں، کیا پیش ہو
چائے کافی کہ شاعر [1]

اس طرح سے پروین شاکر مرد جارحیت کے خلاف خوشامد کے پس پردہ عورت کے استحصال پر اپنے غم و غصے کا اظہار کرتی ہیں۔ ایک اور نظم 'کتوں کا سپاسنامہ' بھی اسی موضوع کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس نظم کا اختتامیہ حصّہ ملاحظہ ہو۔

کیو بزم کے عجب شاہ پارے سجے ہیں
پکاسو کے ہاتھوں کا سارا ہنر آپ کا تجربہ بن گیا
اتنے بھرپور اور جاں فزا تبصروں کے لیے

[1] صدبرگ، ص:۱۷۲

آپ سب کی تہہ دل سے ممنوں ہوں
مگر قبل اس کے
کہ مجھ مبتدی کے لیے
داد و تحسین کے ٹکراؤ میں
آپ کے سر پھٹیں
ناقدین کرام
اپنی باچھوں سے بہتی ہوئی
رال تو پونچھ لیں!

ان نظموں میں جہاں ایک طرف عورت کے استحصال کے خلاف آواز سنائی دیتی ہے تو دوسری طرف پروین کے مطالعے کی وسعت اور اپنے موضوع پر مکمل گرفت ہونے کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ جس طرح کے "کیوبزم کے شاہ پارے، پکاسو کا ہنر، برش دان گاگ کا، رافیل اور ٹشن کی سوچ، ڈومیا کا تخیل، مائیکل انجلو اور ڈونچی کے اسٹروک، ریمبراں کی مصوری، جان ایک کے اصول کا ذکر کر کے مغربی مصوروں اور تخلیق کاروں کے فن کے بارے میں شاعرہ معلومات فراہم کرتی ہیں۔

'ورکنگ وومین' اور 'اسٹینوگرافر' میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے والی خواتین کی 'گھٹن' اور بے چینی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے کہ کس طرح مردوں کے اس معاشرے میں گھر سے نکل کر عورت کو کن مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ انھیں مردوں کے تیکھے فقروں اور چبھتی ہوئی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت حال کا سامنا نہ صرف دفتروں میں کام کر لینے والی خواتین کو ہے بلکہ فیکٹریوں کارخانوں اور دیگر اداروں میں کام کرنے والی مزدور پیشہ عورتوں کو بھی اس استحصال کا نشانہ

بننا پڑتا ہے۔

نظم 'کنیا دان' اور ایک ''معقول نکاح' جیسی نظموں کے موضوعات تقریباً ملتے جلتے ہی ہیں۔ ان میں متوسط طبقے کی لڑکیوں کی بے بسی و مجبوری کو منظر عام پر لایا گیا ہے کہ کس طرح یہ معصوم لڑکیاں حالات کے بے رحم تھپڑوں کے آگے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتے ہوئے مجبوری حالات کے آگے سرِتسلیم خم کرتی ہیں۔ بھولی بھالی چاندسی لڑکیوں کو ایسے مردوں سے بیاہ دیا جاتا ہے جو عمر شکل وصورت یا کسی بھی لحاظ سے ان کے قابل نہیں ہوتے لیکن ان لڑکیوں کے سرپرست یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ تشنہ ہونٹوں، گرسنہ نگاہوں، لٹکتی زبانوں اور بدن گیر غراہٹوں کے عجب غول میں سے ایک ذرا کم ضرر بھیڑیا اپنی نازوں کی پالی کی خاطر چن لائے ہیں۔ جس کے پلے باندھ کر اس کے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے کم از کم دو وقت کی روٹی کی فکر سے رہائی تو پا لیتے ہیں لیکن اس بات سے انجان ہوتے ہیں کہ اس کے عوض ان کی لاڈلی کو عمر بھر کے لیے غم کا موضوع، 'اداسی کی تحصیل' اور 'تنہائی کا پرگنہ' جیسی سوغاتیں کفالت کے لیے ساتھ ساتھ ہوں گی اور اُسے اپنی زندگی کا طویل سفر جلتے سلگتے ارمانوں کی چتا میں جل کر گزارنا ہوگا۔

ایک فارسی عنوان رکھنے والی نظم ''تو بر من بلا شدی'' میں شاعرہ کچی عمر کی لڑکیوں کی فطری خاصیت کا ذکر کرتی ہیں کہ کچے ذہن کی لڑکیوں کو جس ماحول جس رنگ ڈھنگ میں ڈھالا جائے بغیر حیل و حجت ڈھل جاتی ہیں ان کا دل و دماغ کورے ورق کی مانند سادہ ہوتا ہے جو اُس پر لکھا جائے اپنے آپ نقش ہو جاتا ہے لیکن یہاں شاعرہ خود کو اُن سب سے مختلف پاتی ہیں وہ اپنی شوریدہ مزاجی کے سبب ''کاسۂ خالی'' میں بے وجہ سمانے کے بدلے اس سے ایسے اُلجھ پڑتی ہیں کہ برتن کے خالی پن کا بھرم ہی کھل جاتا ہے۔ شاعرہ اپنے آپ کو اس معاشرے کے لوگوں سے ہم آہنگ نہیں پاتی ہیں

کیونکہ ان کی بے پناہ علمی بصیرت، شعور و وجدان منافقوں کی اس بستی میں لوگوں کی اندرونی اصلی صورت منکشف کردیتے ہیں لوگ اپنی بدخصلتوں کی بناء پر خوفناک شکلوں میں ڈھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ایک ایسے معاشرے میں جہاں لوگوں کے ضمیر مردہ ہو چکے ہوں، اخلاقی اقدار کا بحران برپا ہو وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہیں ملاحظہ ہو'تو بر من بلا شدی' سے یہ شعری اقتباس:

'یا تو میرے ساتھی کی پرچھائیں نہیں بنتی ہے
یا پھر مٹی پر
اس کے پنجے اس کی ایڑی سے پہلے بن جاتے ہیں
انسانوں کی سایہ رکھنے والی نسل ناپید ہوتی جاتی ہے
شام ڈھل جانے کے بعد
جب سایہ اور سایہ کناں دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں
میں مکروہ ارادوں والی آنکھوں میں گھر جاتی ہوں
اور اپنی چادر پر تازہ دھبے بنتے دیکھتی ہوں
کیونکہ مجھ کو ایک ہزار راتوں تک چلنے والی کہانی
کہنا نہیں آتی   ''صد برگ''

یہ نظم افرادِ معاشرہ کی بے حسی اور مرد اساس معاشرے میں عورت کے وجود کو منوانے کی کوشش سے عبارت ہے۔'صد برگ' میں شامل کچھ نظمیں ایسی ہیں جن کے پس منظر میں شاعرہ کا سیاسی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔کہیں تو 'ظلِ الٰہی کے پرابلمز' کا تجزیہ کر رہی ہیں۔'ٹکٹکی اور'اے میرے شہر رسن بستہ' میں آمریت کے دور میں اہل وطن کے زخموں کا شمار کر رہی ہیں۔ایسے گھاؤ جوان کی روح پر بھی

ہیں اور جسم پر بھی۔ اس سلسلے میں اُن کی نظم ''اے میرے شہرِ رسن بستہ'' خاص طور اس پر قابلِ ذکر ہے۔ جس میں انھوں نے آمریت سے پیدا شدہ صورتحال کے تناظر میں عوام کی بے بسی اور مظلومیت کو للکارا ہے کہ ظلم کی زنجیروں سے چھٹکارا پانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا ضمیر بیدار ہو جب عوام اپنے احساسِ زیاں کا حساب کرنے کے قابل ہو جائیں تو انھیں غلامی کی ذلت بھری زندگی بوجھ معلوم ہوگی۔ اس نظم میں شاعری اپنے فکر و خیال اور اسلوب کے اعتبار سے شاعرِ انقلاب فیض احمد فیضؔ اور آزاد نظم کے بڑے شاعر ن م راشد کے قریب معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی حکایتی و تجزیاتی انداز و اسلوب کارفرما نظر آتا ہے۔ نظم ''اے میرے شہر رسن بستہ''

اے میرے شہر رسن بستہ، ترئے بازو کے نیل
اتنے گہرے ہو چکے ہیں اب
کہ تری روح پہ دکھنے لگے
اور ترے ماتھے پہ کوئی بل نہیں
اِن اذیت ناک دھاریوں کو
کیا کلاہِ زخم زدہ میں
تکمۂ نیلوفری سمجھا ہے تو
شہریاروں کے نشاطِ حسن بازی کے لئے
سجدہ گاہِ عشق کو رسوا نہ کر
پاؤں آ کر تو ہر زنجیر بول اٹھتی ہے دوست
دیر بس ہلنے کی ہے

روح کے چھلنے کی ہے
اِک باراحساس آنکھیں مل کے اُٹھ جاتے تو پھر
تجھ کو گہنوں کی طرح پہنی ہوئی زنجیر بھی بھاری لگے
صحنِ زندان سے اُدھر کی زندگی پیاری لگے

شہرِ رسن بستہ، بازو کے نیل، کلاہِ زخم خوردہ، تکمۂ نیلوفری، شہر یاروں کے نشاط حسن بازی، دارورسن، زنجیروں کا بھاری لگنا، صحنِ زنداں وغیرہ جیسے الفاظ وتراکیب فیضؔ کے معنیاتی نظام کی تشکیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پروین شاکرؔ کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر مرئی عوامل کو متشکل کردیتی ہیں۔اور غیر مرئی چیزیں بھی سانس لیتے ہوئے ہوئے محسوس ہوتی ہیں۔

پروین شاکرؔ کو جو چیز سب سے زیادہ کرب و اضطراب میں مبتلا کرتی ہے وہ اِس عہد کی منافقت ہے، ظلِ الٰہی کے پرابلمز میں موجودہ عہد کی منافقت خاص طور پر راج پاٹ کرنے والوں کو اُن کے آس پاس درپیش منافقت کا تمثیلی پیرائے میں اظہار کرتی ہیں۔

اوران کی بھی دو قسمیں ہیں
ایک تو کتے
اپنی وفاداری میں شہرۂ عالم رکھنے والے
جب تک جی چاہے پیروں میں لوٹتے ہیں
پھراپنی ہڈی لے کرا لگ ہوجاتے ہیں
دوسری قسم زیادہ مہلک ہے

یہ دو پیروں پر چلتی ہے
دیکھنے میں انسان، مگر باطن کے ریچھ
تلوے چاٹتے چاٹتے اپنے پیارے آقا کو ایسا کر دیتے ہیں کہ
ایک سہانی صبح کو جب
اپنی کنیز خاص کو بھیرویں سن کر آنکھیں کھولتے ہیں تو
ظلِ الٰہی اپنے پاؤں ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں
(ظلِ الٰہی کے پرابلمز)[1]

پروین شاکر کی شاعری میں خاص طور پر ''صد برگ'' میں کربلا کے حوالے سے استعارے اور علامتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے معنی و مفہوم کو زیادہ واضح طور پر اجاگر کرتی ہیں رثائی ادب سے ہٹ کر پچھلے کئی سالوں سے لگ بھگ بیس پچیس برس سے اُردو شاعری میں یہ رجحان ایک نئے تخلیقی رجحان کے طور پر سامنے آیا ہے اور بہت سے شعراء نے اِسے برتا ہے۔ کربلا کے حوالے سے پانی، فرات، مشکیزہ، علم، سورج، نیزہ، پیاس جیسے الفاظ بطور علامت و استعارہ کے استعمال ہو رہے ہیں۔ پروین شاکر کے یہاں بھی اِس موضوع کی فراوانی ہے جن سے اُن کی مذہب سے عقیدت اور لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے وہ سماج میں صالح قدروں کے فقدان، خیر و شر کی آویزش، حق کی فتح، نسائی احساس کے درد و کرب کے ساتھ ساتھ جدید دور کے انسان کو درپیش مصائب و آلام، بے بسی و مجبوری اور جہدِ زندگی کی علامت کے طور پر کربلا کے استعارے کو استعمال کرتی ہیں۔

کسے کہ کشتہ نہ شد، واوف بعہدک، ''علی مشکل کشا سے'' ''ادرکنی''، شامِ غریباں، یہ تمام

---

[1] صد برگ، ص:۱۴۹ا ایم آر پبلیکیشنز

نظمیں ایسی ہیں جو استعاروں اور امیجری کے اعتبار سے ''سانحہ کربلا'' کے پسِ منظر اور اِسی مرکزی حوالے سے جڑی ہوئی ہیں۔

نظم ''ادرکنی'' اور ''علی مشکل کشا سے'' میں شاعرہ اِس پرآشوب دور کی ہولناکی کے نتیجے میں سسکتی اور کراہتی ہوئی انسانیت کی روح کے لئے اس برگزیدہ ہستی کو خدا کے حضور شفا و مرہم کا وسیلہ بناتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

''واوف بعہدک'' نام کی ایک نظم میں حضرت امام حسینؓ کے آخری الفاظ کو بنیاد بنا کر شہادت کا پورا منظر نامہ تخلیق کرتی ہیں جو اپنی ایک ایک جزئیات کے ساتھ نگاہوں کے سامنے ساڑھے چودہ سو برس کی تاریخ کا واقعہ دہرا دیتا ہے نمونے کے طور پر اِس نظم کا ایک بند:

میں بکھرے ٹکڑوں کو جمع کرتے
بریدہ سر سے بدن کی تلاش کرتے
کنارہ روح تک شکستہ ہوں تھک گیا ہوں
تمام زخموں سے چور چور ہوں
مگر شہادت گہ وفا میں
لہو سے رسمِ وضو کی تکمیل کرنے سے قبل
اپنے سجدے کی مستجابی کی تہنیت مجھ کو مل چکی ہے [1]

''سانحہ کربلا'' کے حوالے سے پروین شاکر کی شاعری کے بارے میں گوپی چند نارنگ اپنے خیالات کا اظہار اِس طرح سے کرتے ہیں

---

[1] ماہِ تمام ''صد برگ، ص ۱۷۵ مراد پبلی کیشنز

''اِس نوع کے اظہار میں پروین شاکر کس طرح ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے کرداروں کی زبان بولتی ہیں، صدیوں کا فاصلہ مٹ جاتا ہے اور وقت ایک نقطے پر سمٹ آتا ہے دوسرے یہ کہ انسانی دکھ کی ازلیں گرہیں کھل جاتی ہیں پروین شاکر کی اِس نوع کی تمام نظمیں ایسی ہیں کہ نئ شاعری اُن کے تاریخی احساس، تازگی اظہار اور خوش سلیقگی پر ناز کرسکتی ہے''۔[1]

پرین شاکر کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ''خوشبو'' سے ''کفِ آئینہ'' تک کی مسافت میں جذبات واحساسات کی بڑے مؤثر انداز میں اِس طرح تہذیب کی گئی ہے کہ جذبے سنور اور نکھر کر سامنے آ گئے ہیں اِس میں ایک عورت کی زندگی کے مختلف کیفیتوں اور مختلف ادوار پر مشتمل جذبات شامل ہیں۔ خاص طور پر عشق و محبت جیسے خوش کن اور سرمدی احساسات جو خودرو پودوں کی مانند پھوٹتے ہیں جن سے دل کے نہاں خانے نے خود بخود جگمگا اُٹھتے ہیں۔ اِس محبت کے عطا کردہ درد بھی راحتیں اور لذتیں بخشتے ہیں۔ ''صد برگ میں بھی نشاطِ وصل کی سرشاری اور کیف و مستی کے مختلف رنگ ہیں۔ جو درج ذیل نظموں سے منعکس ہوتے ہیں 'وصال'، 'سپردگی'، 'دودھ'، 'شہد اور شبنم'، 'ہنی مون'، 'بلاوا'، 'شرارت'، 'گیلے بالوں سے چھنتا سورج'، 'محبت آشنا'، 'جمال ہمنشیں'، 'نیگ'، 'بے پناہی'، 'بدن کے موسم بے اختیاری میں'۔

اِس قبیل کی نظموں میں بہت سیدھے سادھے لفظوں میں حسن و عشق، ہجر و وصال کی کیفیتیں ہیں۔ کہیں وصالِ قرب کی تمنا ہے تو کہیں حسرتیں بھی ہیں اُن کی شاعری میں جزبے کچھ اِس طرح سے مجسم ہوئے ہیں کہ بدن، رومان و لمس کی ساری فضا میں ایک پاکیزگی وقار معصومیت اور رکھ رکھاؤ

---

[1] ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، ص: ۸۵ پروفیسر گوپی چند نارنگ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

کا احساس معجزن رہتا ہے۔ پاکیزہ جزبے لطافت و نرماہٹ کے ساتھ اظہار پاتے ہیں اِس سلسلے میں افتخار عارف لکھتے ہیں۔

''پروین شاکر کی شعری کائنات میں داخل ہوتے ہی آپکو اندازہ ہوگا کہ آپ ایسے جہانِ معنی میں آگے ہیں جس کی فضائیں شائستگی، تہذیب، جمال، حسن اور محبت سے عبارت ہیں''۔[1]

پروین شاکر کی تیسری کتاب ''خود کلامی'' کے نام سے شائع ہوئی جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے خود کلامی کا مطلب اپنے آپ سے کلام کرنا ہے وہ اپنی ذات کے نہاں خانوں میں جھانک کر اپنے ذہن و فکر کے نئے دریچوں سے قارئین کو متعارف کراتی ہیں۔ تقدیر کی عطا کردہ تنہائیوں اور نا آسودگیوں کا دبے لفظوں میں گلہ کرتی ہیں۔ خود کلامی کے موضوعات غزلوں کی نسبت نظموں میں زیادہ وسیع ہیں۔ ''خود کلامی'' کی حساس عورت غزل سے زیادہ نظم میں زیادہ واضح اور تابناک ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ صرف اپنی ذات تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہیں خود کلامی میں اپنی ذات سماج اور کائنات کو سمیٹے ہوئے ہیں دیگر مجموعوں کی طرح اس میں بھی عصری حسیت، سیاسی و سماجی مسائل اور فکر و فلسفہ کے عناصر موجود ہیں۔ البتہ جزبات کا جوش اور والہانہ پن جو 'خوشبو' میں ہے وہ 'صد برگ' اور 'خود کلامی' میں کم ہے۔ خود کلامی میں شامل زیادہ تر نظمیں علامتی ہیں، ظلم، درندگی، ناانصافی اور استحصال کے لئے بھیڑئے کی علامت خاص طور سے استعمال ہوئی ہے۔ انسانیت کی مٹتی ہوئی اقدار پر افسوس کا اظہار یہاں بھی ہوا ہے۔

اِس میں کچھ نظمیں ممتا کے خوبصورے اور پاکیزہ جزبوں سے آراستہ ہیں ایک عورت تخلیق

---

[1] مضمون پروین شاکر میری نظر میں' مصنف افتخار عارف مجلّہ بیادِ پروین شاکر، ص:۲۱

کے مراحل سے گزر کر جو طمانیت و آسودگی محسوس کرتی ہے وہ اِن نظموں میں محسوس کی جا سکتی ہے یہ نظمیں انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے مراد کے لئے لکھی ہیں مثلاً جواز، میرا لعل، تیری موہنی صورت، کائنات کے خالق، اور نوشتہ میں اپنے بیٹے سے ہم کلام ہیں۔ ''نوشتہ'' میں اپنے بیٹے سے مخاطب ہوتے ہوئے اِس حقیقت کا برملا اظہار کرتی ہیں کہ دنیا کے دستور کے مطابق ہر بچے کی شناخت اُس کے باپ کے حوالے سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی بچہ ناسازگاریٔ حالات کے سبب صرف ماں کے ساتھ زندگی گذارنے پر مجبور ہو جائے تو ہمارا سماج اس کے باپ اور بچے کی حیثیت کے بارے میں طرح طرح کے سوالیہ نشان کھڑے کر کے اُس کا جینا دوبھر کر دیتا ہے وہ اپنے بیٹے کے لئے فکرمند ہیں کہ اُسے بھی ''پدر بنیاد'' دنیا میں اپنے یوں ''مادر نشان'' ہونے کی قیمت ادا کرنی پڑے گی ''تیری موہنی صورت' پیش خدمت ہے۔

ہاں مجھے نہیں پروا
اب کسی اندھیرے کی
آنے والی راتوں کے
سب اداس رستوں میں
ایک چاند روشن ہے
تیری موہنی صورت[1]

حسن و عشق، خود سپردگی کی مختلف کیفیتیں بھی کچھ نظموں میں اظہار پا گئی ہیں۔ جس میں دو ساحلی نظمیں۔ سرشاری، اُس کی آواز، آتش بجاں، ایک وکٹورین شخص سے، الوداعیہ اور اِک صدا

---

[1] خود کلامی، ص ۲۱

پکارے جاتی ہے۔ تصوارت و خیالات کی رُو شاعرہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ ''ایک خوبصورت ڈرائیو'' میں ایک سہانے سے خیال کی طرف متوجہ کرتی ہیں جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ من پسند ساتھی کی قربت زندگی کو کتنا دلکش بنا دیتی ہے۔ شاہراہِ زیست کے اونچے نیچے رستوں پر چلتے ہوئے ہم مزاج و ہم خیال ساتھی کی ہمراہی کی تمنا کسے نہیں ہوتی ایسا دوست یا ایسا ساتھی جو بن کہے دل سے دل کی بات جان لے۔ لیکن یہ تمنا شاید ہی کسی کی پوری ہوتی ہو ایسے ساتھی ایسے لوگ ہماری زندگیوں میں قوسِ قزح کی طرح ہوتے ہیں ہمارے اندر اداسی کا موسم چاہے کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو ایسی اداس رتوں میں ایک اچھا دوست ہم مزاج ساتھی مل جائے تو اداس لمحے خوشبوؤں سے بھر جاتے ہیں۔ مایوسی بے زاری اور اکتاہٹ کے بادل دل کے آسمان سے چھٹ جاتے ہیں۔ آرزوؤں، امیدوں کی دھنک نگاہوں کے سامنے مسکرانے لگتی ہے۔ تصویر کے خالی خاکوں میں خود بخود شوخ رنگ جھلملانے لگتے ہیں کائنات چہار طرف رنگ برنگے خوشنما پھولوں سے سج دھج جاتی ہے زندگی ایک دم سے خوبصورت ہو جاتی ہے کہ اِس سے پہلے ایسی کبھی نہیں تھی یہ سچ ہے کہ سارے موسم انسان کے دل کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ دل کے موسموں کے سبب ہی باہر کے موسم خوبصورت یا بدصورت معلوم ہوتے ہیں ''ایک خوبصورت ڈرائیو'' سادہ سے انداز میں اسی خیال کو مجسم کیا گیا ہے جو سادگی اور پرکاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ نظم 'ایک خوبصورت ڈرائیو'۔

اِس راستے پر میں کب سے سفر کر رہی تھی
کبھی نیم تنہا
کبھی دوستوں کی معیت میں
اس طرح بھی کہ اور کبھی چلتی رہی اور ذرا سمت تک جاننے کی ضرورت نہ رہی

مگر اِک اجنبی کے
دلآویز، کم بولتے ساتھ میں
ستمبر کی تپتی ہوئی دوپہر میں
میں نے پہلی دفعہ یہ بھی دیکھا
کہ اس راستے پر
دورویہ گلابوں کے تختے بچھے ہیں [1]

''خودکلامی'' کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ افرادِ معاشرہ کے منفی رویوں اور اخلاقی اقدار کے فقدان کے سبب اپنے منفرد افکار و خیالات کی بدولت شاعرہ خود کو دیگر لوگوں سے ہم آہنگ نہیں پاتیں تو پھر اپنی ذات کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہیں کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں اِس صورت حال کا تذکرہ ملتا ہے کہ شاعرہ خودکلامی سے اپنے اندر کے بوجھ اور درد کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اِس مجموعے کی آخری نظم ''خودکلامی'' میں اِسی صورتحال کا تذکرہ ملتا ہے۔ اِس میں شاعرہ الجھن میں مبتلا ہیں کہ اُن کے گردوپیش کے لوگ کوئی ایسی زبان بول رہے ہیں جو وہ نہیں سمجھ پا رہی ہیں اُن کا خیال ہے یا تو اقدار کے آشوب میں مبتلا معاشرے کی ڈکشنری کوئی اور ہے یا شاعرہ کی اپنی لغت متروک ٹھہری ہے۔ اِس لئے اُن کی بات چیت صرف اب تو دیواروں سے ہے یا پھر اپنے آپ سے ہے اِس لئے اب وہ اِس خدشے میں مبتلا ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کے افکار و خیالات اُن کو اس حد تک دور لے جائیں کہ وہ اس دنیا سے اپنا رابطہ یا تعلق رکھنے والی فریکونسی ہی بھلا دیں اور اِس دنیا سے اپنا رابطہ ہی کھو بیٹھیں۔ خودکلامی کی ایک نظم ''Mis Fit'' بھی اِسی طرز پر مشتمل ہے اِس میں شاعرہ اِس صورت

---

[1] خودکلامی، ص: ۱۶۷ مراد پبلی کیشنز

حال سے پریشاں ہیں کہ وہ اپنی دوٹوک باتوں اور اصول پسند طبیعت کی بناء پر لوگوں کو خوش نہیں رکھ سکتیں لوگ اُن کے تیکھے لہجے کی بناء پر اُن سے ناراض رہتے ہیں وہ اُن کی من پسند بولی نہیں بول سکتیں نظم کے دوسرے حصے میں ملازمت پیشہ عورت ہونے کے ناطے وقت کی کمی کے سبب اپنے عزیز ترین رشتوں سے دوری کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ ایک ملازمت پیشہ خاتون گھر اور دفتر دونوں جگہوں پر ذمہ داریوں کے لامتناہی بوجھ کو ڈھوتے ڈھوتے گھن چکر بنی رہتی ہیں یہ المیہ ہے کہ اِس بھاگ دوڑ کے صلے میں اُسے ''نااہلی'' کا تمغہ عنایت ہوجاتا ہے۔ شاعرہ بنجر ذہنوں کو اپنے شعروں کی ہریالی سے سیراب کرنے کی کوشش کرتی ہیں مگر اُس وقت وہ الجھن میں مبتلا ہوجاتی ہیں جب لوگوں کی نظریں لفظ سے زیادہ نقطوں کی خالق پر ٹھہرتی ہیں وہ اپنی حق تلفی کا شدید احساس رکھتی ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتی ہیں کہ شاید یہ دنیا میرے رہنے کے لئے مناسب جگہ نہیں ہے یہ نظم مردوں کی موقع پرستی اور عورت کی بے بسی و مجبوری پر ہلکے پھلکے انداز میں اشارہ کرتی ہیں جس میں ان کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ شامل ہے۔

شاعرہ کے شعور اور لاشعور میں کشمکش اور ٹکراؤ کی کیفیت سامنے آتی ہے یہ اندر کی جنگ ہے جس میں نہ انسان جیتتا ہے اور نہ ہارتا ہے یہ جنگ بہت تھکا دینے والی ہوتی ہے انسان اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے مگر جئے جاتا ہے۔ نظم ''چہ کُنم'' میں شاعرہ زندگی کے کسی موڑ پر ایک دوراہے پر کھڑی معلوم ہوتی ہیں وہ فیصلہ نہیں کر پاتیں کہ بے لحاظ رسوائی اور ہشت پایہ تنہائی کو گلے لگائیں یا دوسری جانب قلعہ بند چاہت میں اپنے دل کی آبروریزی کا تماشہ دیکھتی رہیں۔

بے بسی کے رستے پر
کیا عجب دوراہا ہے

ایک سمت بے سمتی
بے چراغ تاریکی
بے لباس ویرانی
بے لحاظ رسوائی
ہشت پایہ تنہائی [1]

پروین شاکر کا چوتھا مجموعہ 'انکار' ہے جس کا مطلب بقول اُن کے حالات کی غلامی نہ کرنا اور ہار ماننے سے انکار کرنا ہے۔ اِس مجموعے کے نام کی مناسبت سے بھی یہ بات بالکل سچ ہے کہ ''انکار'' میں انھوں نے بوسیدہ معاشرتی وسیاسی نظام واقدار وروایات کو ماننے سے انکار کیا ہے ایسے نظامِ حیات کی وہ نفی کرتی ہیں جو انسان کی فلاح وترقی کے بدلے اِس کے راستے مسدود کرے، گھٹن کا احساس دلائے غالبًا یہی وجہ ہے ''خوشبو'' کی شاعرہ نے 'انکار' کے سرِ ورق کے لئے کیکٹس کی تصویر کو چنا ہے بقولِ ڈاکٹر سعادت سعید:

''پروین شاکر نے ایک لمبی خود کلامی کے بعد اُردو شاعری میں جس نسائی انکار کی مشعلیں جلائی ہیں وہ مرد حاکمیت کے نشے میں گم لوگوں کی رہنمائی کر سکتی ہیں''۔ [2]

''انکار'' میں فکر وخیال اور اسلوب کے اعتبار سے اُن کا فن پختگی کی منزلوں تک پہنچ جاتا ہے بیشتر حصہ آزاد اور نثری نظموں پر مشتمل ہے۔ موجودہ دور کے شعراء کے یہاں یہ ہیتیں کافی مقبول ہیں۔ اس لئے پروین شاکر نے بھی انکار میں اِس ہیئت کو زیادہ مؤثر جانا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے

---

[1] خود کلامی، ص ۱۲۶

[2] مضمون ماہ تمام۔ ناتمام مصنف ڈاکٹر سعادت سعید، ص: ۵۸، بشمولہ:۔ 'معاصر' زاہد بشیر پرنٹرز ریٹگین روڈ لاہور

اگر چہ انکار کے مسودے کو دیکھ کر نثری نظموں پر اعتراض کیا تھا کہ عمدہ موزوں کلام پر قدرت رکھنے والی شاعرہ کو یہ نثری نظمیں شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن پروین شاکر کا اصرار تھا کہ یہ چیزیں اُن پر اُسی صورت میں نازل ہوئی ہیں اور وہ اس طرح اپنے انسپریشن کا کہنا ماننے کے لئے مجبور ہیں۔

''انکار'' میں خیالات کی رنگا رنگی اور موضوعات کی فراوانی باقی شعری مجموعوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس میں اُن ہستیوں کے لئے بھی نظمیں شامل ہیں جو انھیں بہت عزیز ہیں۔ جس طرح فیض احمد فیضؔ کے لئے دو نظمیں ہیں۔ اِس طرح یاسر عرفات اور اپنی دوست پروین قادر آغا کے لئے بھی ایک نظم ہے۔ حب الوطنی کے جذبے سے معمور ۶ ستمبر ۱۹۷۴ء کے لیے ایک دُعا اور کراچی ۸۹ کی آخری شام، سندھ کی بیٹی کا اپنے رسول سے ایک سوال، سفرِ خواب، نمائش، نیا گرہ فالز، ویسٹ منسٹر ایبے، انگریزی عنوان رکھنے والی چند نظمیں ہیں Hot line, San Francisco, Vanity the name is۔

اُن کی نظموں میں جو چیز زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اِن نظموں میں موضوعات کے علاوہ آہنگ، بناوٹ ترتیب اور لفظیات کے اعتبار سے ایک خوبصورت سا احساس کارفرما نظر آتا ہے کیونکہ دلکش تشبیہہ واستعارات اور کائنات میں بکھرے بے شمار رنگوں کو لفظوں میں ابھارنے کے فن میں خاصی مہارت رکھتی ہیں اور اُن رنگوں کی جمالیات سے تراشے ہوئے پیکر تازگی اور فرحت کا احساس دلاتے ہیں۔ لیکن فنی جمال سے زیادہ جذبے کی سچائی اُن کی شاعری میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اِس سلسلے میں بانو قدسیہ کہتی ہیں۔

''پروین کو الفاظ سے بڑی گہری محبت تھی وہ الفاظ کا رنگ چکھ لیتی تھی، خوشبو سونگھ

لیتی تھی۔ رشتے استوار کر لیتی تھی بکھیر دیتی تھی اِس لئے جب اُس کے الفاظ ہم تک پہنچتے ہیں تو ہم میں نئی کیفیتوں کو جنم دیتے ہیں''۔[1]

فیضؔ صاحب کے لئے ایک نظم میں خوبصورت الفاظ وتراکیب (جو فطرت کے مناظر سے ہم آہنگ ہیں) کے استعمال سے فیضؔ کے تئیں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔نظم ملاحظہ ہو:

کیسا چراغ وقت نے رکھ دیا
کہ سیاہ پوش ہوئی ہوا
کفِ دستِ بادِ صبا سے پھول یہ کیا گرا
چمن نگاہ میں اب بہار کہیں نہیں
ہمہ شہر راہ میں اور نگار کہیں نہیں
مرے مہتاب کہاں ہے تو
کوئی اور بھی ہے نظام مہر و نجوم جس کو رواں ہے تو۔[2]

پروین شاکرؔ کی شاعری انسانیت سے محبت کا درس دیتی ہے وہ ایک دانش ور اور فلاسفر کی طرح اپنے آس پاس کے مسائل کا مشاہدہ اور تجزیہ کرتی ہیں زبردستوں کے ہاتھوں زیردستوں کے استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں'انکار' میں بھی انسانیت کو درپیش تلخ حقائق غزل اور نظم کے پیرائے میں اظہار پا گئے ہیں۔''انکار'' کی ایک نظم ''اسٹیل ملز کا ایک خصوصی مزدور'' قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں شاعرہ مزدور کی قابلِ رحم زندگی کو دیکھتی ہیں جسے جہنمی درجہ حرارت میں رہتے ہوئے دہکتی بھٹی

---

[1] خوشبو کی ہمسفر، ص:۴۶۰ مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، لفظ لوگ پبلیکیشنز اسلام آباد ۲۰۰۲

[2] انکار، ص:۲۳

میں کوئلے جھونکنے پڑتے ہیں۔جس کے عوض میں اُسے کم وقت میں زیادہ معاوضہ ملتا ہے لیکن شاعرہ اِسے خودکشی کا معاہدہ سمجھتی ہیں کہ اُس نے مجبوریٔ حالات کی وجہ سے خودکشی کے اِس معاہدے پر بقائمی حوش وحواس دستخط کیئے ہیں اور اُسے اِس بات کا احساس ہی نہیں کہ وہ بھٹی کا ایندھن بن چکا ہے۔'انکار' میں شامل اکثر نظمیں تمثیلی طرز پر مشتمل ہیں اوران کا اختتام ڈرامائی طرز پر ہوتا ہے۔

پروین شاکر نے اپنے آس پاس کی ہر چھوٹی بڑی حقیقت کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے جس طرح کہ ایک نظم 'ایک سوشل ورکر خاتون کا مسئلہ'' اِس میں ایک معصوم بچے کا کردار دکھایا گیا ہے جسے پینے کے پانی کی تلاش ہے سوشل ورکر خاتون اِس بچے کو پانی کی تلاش میں سرگرداں دیکھ کر اپنے اندر احساسِ ندامت محسوس کرتی ہے کیونکہ وہ اپنے امپوڑٹڈ پھولوں کو کم پانی ملنے کے سبب مرجھائے جانے کے خیال سے فکرمند ہے اور ادھر زندگی دو گھونٹ پانی کے لئے ترس رہی ہے اور جب نظم میں شاعرہ کا تخلیق کردہ خاتون کردار بچے کو پانی نہ دینے کا عذر تراشتا ہے تو وہ بچے کے احساسات کی منظر کشی اِس طرح کرتی ہیں کہ انسان کا دل سوز و گداز سے بھر جاتا ہے اور انسانیت کی بے کسی و مجبوری ابھر کر سامنے آتی ہے ایک U.D.C کی ڈائری میں ایک کلرک کی بیچارگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس کی ساری زندگی شروع سے آخر تک ایک ہی نہج پر گذرتی ہے جس کی واحد عیاشی ٹوٹی ہوئی پیالی میں چائے پینا اور ادھار سگریٹ مانگنا ہے۔ وہ افسروں کی مرضی کے مطابق فائلوں پر فلیگ لگاتا ہے۔ پروین شاکر نے اِسے ''حنوط شدہ'' سے تشبیہہ دی ہے، جو گدھے کی سی دلجمعی سے فائلوں پر نوٹ لکھتا ہے شام گے دم گھونٹنے والی بسوں میں اپنے آپ کو ٹھونس کر جب گھر پہنچتا ہے تو وہاں ایک اور جہنم زار اُس کا مقدر ہوتا ہے اُس کی ساری عمر تنخواہ میں معمولی اضافے اور پراویڈینٹ فنڈ کا حساب کرتے کرتے بیت جاتی ہے اور وہ اپنے سہانے خوابوں کو لوریاں دے دے کر ہمیشہ کی نیند سلا دیتا ہے۔

اِس نظم میں شاعرہ کا طنزیہ انداز اُن کے گہرے مشاہدے اور حساس طبع ہونے کا مظہر ہے مثلاً یہ جملہ ملاحظہ ہو۔

''اپنے وجود سے شرمندہ چپڑاسی اُن فائلوں کی مانند ہیں جنھیں خدا مارک کرنا بھول گیا ہے''۔[1]

پروین شاکر نے غریب طبقے کی زندگیوں کو درد بھری نظروں سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ عہد حاضر کے حالات سے دم بخود ہونے اور زندگی کے بوجھ کو ڈھوتے رہنے کے کرب کا اظہار کیا گیا ہے۔

نظم 'ایک مشکل سوال' میں شاعرہ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے ایک غریب گھر کی بارہ تیرہ سالہ نوخیز کلی کو دیکھ کر رنجیدہ ہو جاتی ہیں اور اِس کا اظہار یوں کرتی ہیں کہ انسان کا دل دکھ درد سے بھر جاتا ہے۔ کہ کتنی تشنہ آرزوئیں اور ناآسودہ ارمانوں کی چتائیں نگاہوں میں پھر جاتی ہیں

وہ چہرہ
بہار کے پہلے پھول کی طرح تازہ تھا
اور آنکھیں
پہلی محبت کی طرح شفاف
لیکن اُس کے ہاتھ میں
ترکاری کاٹتے رہنے کی لکیریں تھیں
اور اُن لکیروں میں

---

[1] انکار، ص:۱۵۴

برتن مانجھنے والی راکھ جمی تھی

اُس کے ہاتھ اُس کے چہرے سے بیس سال بڑے تھے [1]

عورت کے ساتھ صنفی امتیاز برتنے کے خلاف ایک اور نظم ''بشیرے کی گھر والی ہے'' جس میں ایک پسماندہ سے سماج کی ایک غریب لڑکی کی ساری بدحالی اور مفلوک الحال زندگی کا نقشہ نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ پروین شاکر اِس بات کا گہرا شعور رکھتی ہیں کہ کس طرح ہمارے معاشرے میں لڑکا اور لڑکی میں امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور ہر معاملے میں لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دی جاتی ہے چھوٹی سی عمر میں اپنی قد سے بڑی جھاڑو اِس بچی کو تھما دی جاتی ہے اپلے تھاپنا اور گائے کو گھاس دینا اس کا مقدر بنتا ہے جب کہ مکھن کی ٹکیہ اُس کے بھائی کے نصیب میں لکھی ہوتی ہے۔ اُسے تو صرف جھوٹا موٹا پہننے کو دیا جاتا ہے۔ گھر کے لوگوں کی خدمت اور تابعداری کا درس دیا جاتا ہے اُس کی ہر سانس پر پہرے بٹھا دئے جاتے ہیں اُسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب ذمہ داریوں کی بھیڑ میں بچپن رخصت ہوا اور جوانی دستک دینے لگی ابھی وہ بے فکری سے دم بھی نہیں سنبھال پائی ہوتی تو اپنے والدین کی نگاہوں میں کھٹکنے لگتی ہے سولھواں برس لگتے ہی اُس کا باپ اپنے من کا سارا بوجھ دوسرے کے تن پر اتار دیتا ہے جہاں اُسے اِس سے بھی بدتر صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اِس طرح وہ ظلم وستم کی چکی میں پستی چلی جاتی ہے۔ سنہرے موسم کیسے گذرے خبر ہی نہیں ہوئی جوانی کب آئی اور کب رخصت ہوئی اُس کی لغت میں اِن باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اُس کی حیثیت ایک کام کرنے والی ملازمہ سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتی جس کا مقصد صرف اور صرف دوسروں کو آرام پہنچایا اور دوسروں کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ شاعرہ عورت کی بیچارگی و بے بسی پر مضطرب ہو اُٹھتی

---

[1] انکار، ص:۱۶۵

ہیں تمثیلی انداز کی اِس نظم میں شاعرہ پاکستان کے دورافتادہ علاقوں میں عورت کی پسماندہ صورتحال کے پس منظر میں کفِ افسوس ملتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ملاحظہ کریں نظم

ہے رے تیری کیا اوقات!
دودھ پلانے والے جانوروں میں
اے سب سے کم اوقات
ڈھوروں ڈنگروں کو بھی
جیٹھ اساڑھ کی دھوپ میں
پیڑ تلے ستانے کی آزادی ہوتی ہے
تیرے بھاگ میں ایسا کوئی سمے نہیں
تیری جیون پگڈنڈی پر کوئی پیڑ نہیں ہے

نظم کے آخری حصے میں شاعرہ عورت کو جھنجھوڑ کر بیدار کر رہی ہیں کہ وہ کب تک قربانی کا بکرا بنی رہے گی اپنی ذات کی اہمیت کا احساس کرنا کب سیکھے گی۔

سمے کے ہاتھوں ہوتا رہے گا
کب تک یہ اپمان
ایک نوالہ روٹی
ایک کٹورے پانی کی خاطر
دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان! (بشیرے کی گھر والی)[1]

---

[1] انکار، ص:۱۵۵

عورت کے استحصال کے خلاف ایک اور نظم 'ٹماٹو کیچپ' نثری طرزِ اظہار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم صد برگ میں شامل 'پوسٹ ڈٹرآئٹم' ''کتوں کا سپاسنامہ'' کی طرز پر مشتمل ہے۔ مرداجارہ داری والے معاشرے میں عورت کے تئیں اُن کی منافقانہ ذہنیت کو سامنے لایا گیا ہے کہ کچھ اہلِ قلم حضرات خواتین ادبیہ اور شاعرہ کے ساتھ جھوٹی تعریفوں سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی کوششوں میں ہوتے ہیں۔ ہر مرد اپنے آپ کو اُس کا مخاطب سمجھتا ہے لیکن جب حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا تو اُس سے دشمنی پر اتر آتا ہے۔ پروین نے اِسے ٹماٹو کیچپ کا نام دیا ہے

جب تک وہ زندہ رہی
ادب کے رسیا اسے بھنجوڑتے رہے
اُن کی محفلوں میں اُس کا نام
اب بھی لذیذ سمجھا جاتا ہے
بس یہ کہ اب وہ اُس پر دانت نہیں گاڑ سکتے
مرنے کے بعد انھوں نے اُسے ٹماٹو کیچپ کا درجہ دے دیا (ٹماٹو کیچپ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروین شاکر کی شاعری نسوانی ہمدردی اور مشرقی روایات میں جکڑی ہوئی ایک بے بس اور مجبور عورت کی داستان سناتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بے شمار نظمیں اسی موضوع پر مشتمل ہیں ''ایک دفنائی ہوئی آواز'' میں بھی کم وبیش یہی صورتحال ملتی ہے ذہن ودل جب ہم آہنگ نہ ہوں تو مادی آسائشیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون صرف دووقت کے کھانے اور تن کے کپڑوں اور دیگر ضروریات کے پورا ہونے پر ہی مطمئن نہیں ہوتی بلکہ اُسے اپنے جیون ساتھی سے ذہنی وجذبات ہم آہنگی اور اُس کے بھرپور تعاون کی خواہش ہوتی ہے اگر وہ نہ ملے تو

اندر کی آواز بار بار پکارتی ہے کہ کچھ کمی ہے۔ خواہشوں اور امانوں پر چاہے کتنے ہی پہرے بٹھائے جائیں ہر چیز اپنی اصلیت کی طرف لوٹتی ہے انسان اپنے اندر کی آواز کو آخر کب تک دبا سکتا ہے اِس نظم میں ایک عورت کی نفسیاتی الجھن اور داخلی کشمکش کو بہت خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ نظم ''ایک دفنائی ہوئی آواز'':

پھولوں اور کتابوں سے آراستہ گھر ہے
تن کی ہر آسائش دینے والا ساتھی
آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا بچہ
لیکن اِس آسائش اور ٹھنڈک کے رنگ محل میں
جہاں کہیں جاتی ہوں
بنیادوں میں بے حد گہری چنی ہوئی
اِک آواز برابر گریہ کرتی ہے
مجھے نکالو!
مجھے نکالو!

اِس باب میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ پروین شاکر کی شناخت اگر چہ نسائی حسیت یا تانیثی شاعری کے حوالے سے ہی ہے لیکن وہ خواتین کے مسائل سے قطع نظر ایک باشعور فرد کی طرح اپنے ملک کے سیاسی وسماجی مسائل سے بھی آگاہ تھیں اپنے عہد کا سیاسی وسماجی شعور رکھتی تھیں اپنے افکار ونظریات کے اعتبار سے جدت پسند اور روشن خیال تھیں جس کا ثبوت 'روزنامہ جنگ' میں چھپنے والے اُن کے کالم ہیں پہلے باب میں کالموں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے انھوں نے بڑی

باریک بینی سے اپنے دور کے سیاسی حالات کا تجزیہ کیا وہ دور چونکہ مارشل لاء کا تھا مظلوم عوام آمریت کے سایہ میں سسک رہے تھے۔ جمہوری قدریں پامال ہو رہی تھیں سماج کا دانشور طبقہ ذہنی کرب واضطراب میں مبتلا تھا۔ پروین شاکر انسانیت کی بقا اور قومی وملکی فلاح وترقی کے لئے فکر وخیال کی آزادی کی قائل تھیں اِس لئے ''انکار'' جیسی شاعری کے ذریعے انھوں نے آمریت پر بھر پور وار کئے، بقولِ ڈاکٹر سلیم اختر۔

''پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات کے تحت 'خوشبو' لٹانے والی شاعرہ نے ''انکار'' کی صورت میں ایسا مجموعہ کلام دیا جس کی نظمیں شاخِ گل کے بجائے کیکٹس کی معلوم ہوتی ہیں''۔[1]

مشاہدے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ 'انکار' کے بعد پروین شاکر کی شاعری آخر تک 'انکار' ہی کی راہ پر گامزن رہی کیونکہ انکار کے بعد پروین شاکر نے اپنا اندازِ فکر اور موضوع سخن متعین کر لیا تھا جو ''کفِ آئینہ'' تک بدستور قائم رہا ''انکار'' میں شامل اُن کی نظمیں اُس دور کے سیاسی منظر نامے کو پوری طرح سے اجاگر کرتی ہیں انھوں نے بہت بے باکی سے اُن نام نہاد رہنماؤں پر نکتہ چینی کی ہے جو اپنے ظالمانہ دورِ اقتدار کو طول دینے کی خاطر قوم کے جان و مال کا سودا کر کے عوام پر ظلم و جبر کا ہاتھ دراز کرتے ہیں جو عوام کے محافظ ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن پھر لٹیروں کی فہرست میں بھی یہی لوگ شامل ہو جاتے ہیں اِس طرح کی نظمیں 'خود کلامی' اور 'انکار' میں کافی تعداد میں ہیں۔

شہزادی کا المیہ، حبس بہت ہے، دل چاہتا ہے، چیلنج ایسی نظمیں ہیں جن میں سیاسی موضوعات زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔

---

[1] ماہنامہ ''معاصر''، مضمون خوشبو امر ہے مدیران عطاء الحق قاسمی۔ امجد اسلام امجد، ص ۲۶، ۱۹۹۶ء پبلشرز زاہد بشیر پرنٹرز

'شہزادی کا المیہ' طنزیہ لب و لہجے پر مشتمل ہے جس میں 'ایوانِ اقتدار' کے آس پاس موجود موقع پرستوں، خوشامدیوں اور مفاد پرستوں کے اصلی چہرے سے نقاب کشائی کی گئی ہے یہ لوگ محل کے نیچے اپنے اپنے مفاد کے حصول کے لئے جمع ہیں اور منتظر ہیں کہ شہزادی اپنی نظرِ عنایت سے انہیں جاہ منصب سے نوازیں یہ لوگ اپنے اپنے شناخت نامے ہوا میں لہرا رہے ہیں کہ انھوں نے جمہوریت کی بحالی کے لئے بہت تگ ودو کی ہے حالانکہ صورت حال اس کے برعکس ہے جن لوگوں نے جمہوریت کے لئے قربانیاں دیں جیلیں کاٹیں اور تشدد سہا وہ کوئی اور لوگ تھے انہیں تو صلوں کی تمنا بھی نہیں تھی۔ درحقیقت اِس نظم میں شاعرہ ایک مورخ کے فرائض بھی نبھا رہی ہیں اور اپنے دور کے سیاسی واقعات قلمبند کر کے منظرِ عام پر لا رہی ہیں ''شام بے وارثی اترنے کی ساعت' 'سیاہ اپریل کے اوائل' کا ذکر کیا گیا ہے جو دراصل اُس دور کی طرف اشارہ ہے جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو جب وزیرِ اعظم کی حیثیت سے نامزد ہوئیں تو پروین ان کے لئے نیک خواہشات رکھتی تھیں وہ بے نظیر صاحبہ کے پاس موجود خوشامدیوں سے بھی آگاہ تھیں اس لئے انھوں نے نظم 'شہزادی کا المیہ' لکھی۔ اسی نظم کی بہت پذیرائی کی گئی وزیرِاعظم کے پریس اور پبلشنگ کے محکمے نے انہیں وزیرِاعظم ہاؤس آنے کی دعوت بھی دی۔ انہیں وزیرِاعظم کی تقریر لکھنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ پروین شاکر کی تقریر کا مسودہ بہت پسند کیا گیا۔ پروین شاکر کو شعراء اور فنکاروں کے ہمراہ لاڑکانہ جانے کا اتفاق بھی ہوا۔

آمریت کے خلاف لکھی جانے والی نظموں میں ایک اہم نظم شمار کی جاتی ہے جس کا عنوان ہے، 'حبس بہت ہے' پیش خدمت ہے۔

حبس بہت ہے
اشکوں سے یوں آنچل گیلے کر کے ہم
دل پر کب تک ہوا کریں
باغ کے در پر قفل پڑا ہے
اور خوشبو کے ہاتھ بندھے ہیں
کسے صدا دیں لفظ سے معنی بچھڑ چکے ہیں
لوگ پرانے اجڑ چکے ہیں
نابینا قانون وطن میں جاری ہے

یہ 'حبس' آمریت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے اِس لئے شاعرہ آمریت سے پیدا شدہ صورتحال کے تناظر میں اپنے مزاحمتی ردِعمل کا اظہار کر رہی ہیں۔ اِس احتجاجی انداز کے اظہار کے لئے سخت اور کھردرے لفظوں اور لہجے کے بدلے بڑے نرم و ملائم لفظوں اور استعاروں کا استعمال کر رہی ہیں۔ جو تاثر آفرینی کے لحاظ سے بے مثال ہیں۔ مثلاً اشکوں سے آنچل گیلے کر کے دل پر ہوا کرنا۔ باغ کے در پر قفل ہونا۔ نابینا قانون جاری ہونا، لفظوں سے معنی کا بچھڑنا آنکھیں کرھنا قبیح جرم ہونا یہ تمام علامتیں اور استعارے اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے دباؤ، جبر اور مطلق العنانیت کی صورتحال کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس نظم کو مزاحمتی شاعری کے باب میں ایک عمدہ فنی نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

جبر کی خواہ کوئی بھی صورتحال ہو چاہے معاشرے میں برتے جانے والے صنفی امتیازات کی شکل میں ہو یا آمریت کی شکل میں پروین شاکر کسی بھی صورت میں ہار ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اُن کے اندر کا حاصلہ اعتماد، قوتِ ارادی انہیں بار بار حقیقت اور سچائی کو سامنے لانے کے لئے ابھارتا

رہتا ہے۔ وہ باطل قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتی ہیں۔ اِسی متن پر مشتمل ایک نظم 'چیلنج' بھی ہے جس میں جبر کی وہ صورتحال ملتی ہے جب مارشل لاء کے دور میں ذرائع ابلاغ واظہار پر کڑی پابندیاں لگا دیں گئیں تھیں حقیقت اور سچائی کی بازیافت کو قابلِ گردن زنی ٹھہرایا گیا تھا۔ اخبارات پر بھی سنسر عائد کر دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اہلِ فکر و دانش شدید گھٹن اور حبس کے احساس سے دوچار ہوئے۔ اُس دور میں پروین شاکر پر بھی ملک سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی گئی لیکن وہ پھر بھی اپنے اندر کی بھڑاس اپنی شاعری کے ذریعے نکالتی رہیں اور بیرون ملک جانے کا کوئی نہ کوئی موقع نکال ہی لیتی تھیں۔ وہ آمرانہ چیرہ دستیوں کے خلاف اپنے قلم کو استعمال کرتی رہیں ڈرنا اور جھکنا اُن کی فطرت میں نہیں تھا۔ بقولِ سید ضمیر جعفری:

''ملک پر مارشل لاء کا تسلط پروین شاکر کی روح کا سب سے بڑا گھاؤ معلوم ہوتا ہے اُن کی بیشتر نظمیں مارشل لاء کے خلاف جمہوریت کے ایک ''لانگ مارچ' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مارشل لاء کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو یہی کہ پروین نے قلم کو ''کلاشنکوف'' بنا لیا۔ اور وہ اُردو شاعری کی 'سیفو' بنتے بنتے اُردو شاعری کی 'رانی جھانسی' بن گئی''۔[1]

نظم چیلنج کا ایک شعری اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

حاکم وقت کی نظروں میں
میری وفاداری مشکوک ہی ٹھہری تو
مجھ کو کچھ پرواہ نہیں

---

[1] مضمون اُردو شاعری کی رانی جھانسی، ص: ۲۴۵، بشمولہ خوشبو کی ہمسفر۔ مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش

جس مٹی نے مجھ کو جنم دیا
وہ اِس خوشبو سے واقف ہے
اُس کو خبر ہے
فصلِ خزاں کو فصلِ خزاں کہنے کا مطلب
گلشن سے غداری نہیں ہے

شاعرہ کا ضمیر اپنے وطن کے آگے سرخرو ہے کہ اس نے وطن سے غداری اور منافقت نہیں کی بلکہ وطن پہ سایہ فگن اجاڑ موسموں کو سچائی کے ساتھ رقم کر کے وطن کے تئیں اپنی وفاداری کا حق ادا کر دیا۔ اب چاہے اِس رستے میں انھیں دار و رسن کی صعوبتیں بھی سہنی پڑیں تو وہ بخوشی اِسے قبول کرنے کے لئے تیار ہیں کہ اہلِ وفا کا یہی دستور ہے۔

''انکار'' میں شامل کچھ نظمیں اپنے بیٹے مراد کے کئے ہیں جن میں اُسے نصیحتیں وصیتیں بھی کی ہیں وہ اُسے اپنے انداز سے دنیا کو پرکھنا اور برتنا سکھا رہی ہیں دنیا میں موجود بھیڑیوں کے ممکنہ حملوں سے ہشیار رہنے کی تلقین بھی کر رہی ہیں اور اعلیٰ انسانی قدروں پر گامزن رہنے کی نصیحت بھی کر رہی ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنا رختِ سفر باندھنے کی تیاری کر رہی ہیں جبھی تو دنیا سے بیزاری، اکتاہٹ اور گہری اداسی جیسے احساسات انکار اور کفِ آئینہ کی شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جیسے کہ نظم ''پروین قادر آغا کے نام'' جہاں عورت کی مظلومیت کی داستان سناتی ہیں تو دوسری طرف اس میں بڑھ کا درخت آ تما اور نروان کے حوالے سے ترکِ دنیا کے تمام تلازمے موجود ہیں۔

اُن کی شاعری کی دونوں اصناف میں کراچی کا المیہ بہت شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ کراچی جسے زمانے میں عروس البلاد کہا جاتا تھا یہ شہر خوشیوں کی آماجگاہ تھا اب خاک وخون میں

لتھڑا ہوا یہ شہر باعثِ عبرت بنا ہوا ہے کراچی کے خونچکاں واقعات اور اپنوں کے ہاتھوں اِس کی تباہی و بربادی پر شاعرہ بہت رنجیدہ خاطر ہیں۔

اِس شہر کی تھوڑی سی تفصیل عرض کر دوں تقسیم ملک کے بعد لوگوں کی اکثریت اسی شہر میں آ کر سکونت پذیر ہوئی یہ شہر برصغیر میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور کے تہذیبی و تمدنی ورثے کا گہوارہ رہ چکا ہے غالباً اسی خصوصیت کے پیشِ نظر رئیس امروہوی نے کہا تھا کہ ؎

ہند کے پانچ سو شہروں کا بدل ہے یہ شہر [1]

لیکن پھر یہ غریب پرور شہر سیاسی و معاشی الجھنوں کا ایسا شکار ہوا کہ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کبھی یہ روشنیوں کا شہر تھا پچھلے بیس پچیس سالوں سے کلاشنکوف کلچر اِس شہر میں پروان چڑھ چکا ہے۔ اور مرنے مارنے کا بازار گرم ہے ''سندھو دریا کی محبت میں'' ایک نظم کے ذریعے کراچی کے مسلمانوں کی آپسی منافرت و تعصب کے حوالے سے اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ نظم اِس دھرتی پر تباہی و بربادی کے نتیجے میں کسی اور موہنجوڈارو کے وجود میں آنے پر سوالیہ نشان بناتی رہے گی۔ نظم کا آخری بند:

مگر جب اُس کے کناروں پر رہنے والے
اُس کے پانیوں میں نفرتیں ملانے لگیں

بچوں اور پھولوں کو

والیوں اور مالیوں کا شجرہ دیکھ کر
پانی کا پرمٹ جاری کرنے لگیں

---

[1] ماہنامہ ''آواز'' شمارہ سوم مدیر ملکہ جعفری بہار ۱۹۹۹ جلد اول، ص:۶۴ جدید اُردو تحریک نیویارک کی اشاعت

اور یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہے تو تاریخ ہمیں بتاتی
ہے کہ ایسے موقعوں پر
دریا اپنا جغرافیہ تبدیل کر لیتے ہیں
میرا خیال ہے
ہمارے لئے
فی الحال ایک موہن جوڈارو کافی ہے[1]

خوشبو کی شاعرہ کا شعری سفر 'کفِ آئینہ تک پہنچ کر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ کفِ آئینہ پانچویں اور آخری کتاب ثابت ہوئی اِس مجموعے میں اکیس نظمیں ہیں کچھ بلا عنوان ہیں اور کہیں کہیں نظم کا پہلا مصرعہ عنوان کے طور پر دیا گیا ہے۔ اِس کتاب کی شاعری ملے جلے احساسات سے عبارت ہے اُن کا لہجہ بھی کچھ بجھا بجھا سا اور تھکا تھکا سا محسوس ہوتا ہے اداسی، اور خالی پن کا احساس قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ایک ایسا خالی پن جس میں نہ تو کوئی تمنا جاگتی ہے اور نہ کوئی آرزو جنم لیتی ہے نہ ہی آنکھوں میں حسین خوابوں کا بسیرا ہوتا ہے بس وہ صرف اتنا کر سکتی ہیں کہ غموں کے اس انمول خزانے کو جو دل کے نہاں خانوں میں بہت سینت سینت کر رکھا ہوا ہے جھانکتی رہتی ہیں اِس طرح درد سے توانائی اور زندگی پانے کا ہنر حاصل کر لیتی ہیں۔ اس طرح کی نظمیں سوادِ زندگانی میں 'ایک خالی دوپہر' ''اسیر شام'' 'تنہائی سے گلہ کیسا' 'اس دل کی ویرانی' اور 'سنڈریلا تنہائی اور اداسی جیسے جذبات و احساسات کی نمائندگی کرتی ہیں عورت کی تڑپتی سسکتی آرزوئیں، ناآسودہ ارمان، عورت کا بے تہی و دست وجود، زندگی کا سونا پن کفِ آئینہ میں بہت واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جس میں ہونے

---

[1] ماہ تمام، 'انکار' ص: ۱۹۰ مراد پبلی کیشنز اسلام آباد

یا نہ ہونے کا احساس ختم ہو گیا ہے شاعرہ اپنی روح میں ایک خلا محسوس کرتی ہیں۔

ایک خالی دوپہر کا سونا پن اِس طرح بیان کرتی ہیں۔

میں باہر کی تمازت سے
جھلس کر آئی تو دیکھا
مرے گھر میں بھی ویسی دھوپ میری منتظر تھی[1]

سوادِ زندگانی میں بھی یہی کیفیت ہے۔

سوادِ زندگانی میں
اِک ایسی شام آتی ہے
کہ جس کے سرمئی آنچل میں
نہ کوئی پھول ہوتا ہے
نہ ہاتھوں میں کوئی تازہ
نہ کوئی غم سلگتا ہے
نہ کوئی زخم سلتا ہے
نہ کوئی تمنا ہاتھ ملتی ہے
سوادازندگانی میں ایک ایسی شام آتی ہے
جو خالی ہاتھ آتی ہے

پروین شاکر کی نظمیہ شاعری میں حکایت نگاری کا اسلوب پایا جاتا ہے۔ داستانوی وطلسماتی

---

[1] کفِ آئینہ، ص:۱۷۹

فضا دونوں شعری اصناف میں پائی جاتی ہے۔جس سے پرانے قصے کہانیوں کی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔جوہمیں ن م راشدؔ، ابنؔ انشاء، مجید امجدؔ اور منیر نیازیؔ کے یہاں ملتی ہیں۔نظم ’’سنڈریلا‘‘ میں قاری کولوک کہانیوں کی پرانی تلمیح کی طرف متوجہ کرتی ہیں جس کے ذریعے بیانیہ انداز میں خوابوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔شروع میں ایک طلسماتی فضا تراشی گئی ہے ایک ان دیکھا سحر انگیز خواب، ایک اچھوتی خواہش کو پروان چڑھتے ہوئے دیکھا گیا ہے آنگن سے آسمان تک روشن دیے، تازہ گلابوں کی مہک، چمن سے صحنِ چمن تک پھیلی ہوئی ہے، بلوریں جام، ستاروں سے بنا ملبوس، سراپا شوق واضطراب اِک شہزادہ قاری ایک ان دیکھی تخیلی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں صرف رنگ وبو کا سیلاب ہے زندگی خوشبوئیں اور مسرتیں لٹا رہی ہے لیکن اچانک ڈرامائی انداز میں یہ سحر انگیز خواب ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے کیونکہ اِس سے پہلے کہ گھڑی کی سوئیاں بارہ کا گھنٹا بجاتیں ’’سنڈریلا‘‘ کو رقص ادھورا چھوڑ کر اپنی غریب، بدنصیب دنیا میں واپس آنا پڑتا ہے لیکن یہاں شاعرہ ایک ایسی بدقسمت ’سنڈریلا‘ ہے جس کے تعاقب میں کوئی شہزادہ کوئی قاصد شاہی محل سے اُس کے دوسرے پاؤں کی جوتی لے کر صدائیں نہیں لگاتا زندگی کی کڑی دھوپ اُس کے تن من کو جھلسا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے نظم سنڈریلا کا آخری حصہ:

گجر بجے ہی آدھی رات

یہ خواب یکدم ٹوٹ جاتا ہے

ستاروں سے بنا ملبوس میرا

پھر خس وخاشاک ہوجاتا ہے

میرا رتھ اچانک ٹوٹ جاتا ہے

میری شیشے کی جوتی رقص گاہ میں چھوٹ جاتی ہے

''کفِ آئینہ'' کی اکثر نظموں میں شاعرہ کبھی تو خدا سے اور کبھی تقدیر سے گلہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کبھی تو یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلیوں سے بہلاتی ہیں کہ نقاش ازل کچھ نقش ایسے بناتا ہے جو کبھی روشن نہیں ہو سکتے اپنے مقدر کی لکیروں کی شاکی ہیں کہ خدا نے جس وقت اُن کی تقدیر کو لکھا وہ شاید آدھی رات کا وقت ہو گا جب اُس کے پیالے میں سیاہی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

پروین شاکر کی شاعری میں اداسی، درد و کرب، بے چینی جیسے محسوسات کا تعلق براہ راست اُن کی اپنی ذات سے بھی ہے اور معاشرے اور ملک کے سیاسی و سماجی حالات اور قتل و غارت گری کے نتیجے میں پیدا شدہ غیر یقینی صورتحال سے بھی جس کا ذکر وہ چاروں مجموعوں میں کر چکی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی روز افزوں ترقی کی بناء پر پوری دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہونے والا کوئی بھی مسئلہ مقامی نہیں رہا ہر حساس ذہن اِس سے ضرور متاثر ہوتا ہے اِس طرح پروین شاکر بھی ایک طرف ملک و قوم کا درد رکھتی ہیں تو دوسری طرف برصغیر پاک و ہند کے ساتھ ساتھ مشرقِ وسطٰی کے ممالک کے مسائل سے بھی گہری دلچسپی رکھتی ہیں اور انسانیت کو درپیش مسئلوں کی طرف توجہ دلاتی ہیں جن میں امنِ عالم سر فہرست ہے۔ وہ عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور اُن کے اغراض و مقاصد پر بھی نظر رکھے ہوئے ہیں علامتی انداز کی ایک نظم 'ایک ساؤنڈ پروف نظم' میں ساؤنڈ پروف کی اصطلاح کے ذریعے معنوی گہرائی پیدا کر کے استعماری طاقتوں کے حوالے سے تیسری دنیا کی صورتحال کو اجاگر کیا گیا ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ استعماری طاقتیں برصغیر میں اپنی بالادستی کے نشے میں نئے نئے فتنے جگاتے رہتے ہیں پھر اپنے من پسند معاہدے اور مفاہمتیں کر کے اپنی سلامتی کی خیر مناتے ہیں۔

اپنے مفادات کے لئے دنیا کو آگ اور بارود میں جھونک کر اپنے فرحت بخش ماحول میں بیٹھ کر 'ساؤنڈ پروف' شیشوں سے اُن کے تڑپنے کا نظارہ کرتے ہوئے امن و آتشی کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کے بعض خودغرض حکمران اِن کے نذرانوں اور رعنائیوں کو سمیٹتے ہوئے اپنے ناخداؤں کے اشاروں پر کند چھری اپنی عوام کی گردن پر رکھنے سے گریز نہیں کرتے۔ کیونکہ سامراجی طاقتوں کے اشاروں پر یہ نام نہاد حکمران کٹھ پتلی بنے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنے تخت و تاج کو دوام بخشنے کے لئے جارح سماج کی جی حضوری کر رہے ہیں۔ شاعرہ کا دل و دماغ انسانیت کو تڑپتا بلکتا دیکھ کر مفلوج ہوا جا رہا ہے نظم 'ساؤنڈ پروف' سے شعری اقتباس۔

طلسمی رنگ، جادوئی فضا
اِک اور بستی ہے
جہاں دنیائے سوئم کے
کسی کوچے سے آتے بین کو
پروانۂ راہداریٔ عظمیٰ نہیں ملتا
جہاں ہم ہیں
وہاں آواز کو رستہ نہیں ملتا
صدائے شام کا زخمی پرندہ
شیشۂ در سے برابر سر کو ٹکراتا ہے
لیکن باریابی کی کوئی صورت نہیں بنتی (کفِ آئینہ ساؤنڈ پروف)

پروین شاکر استحصالی نظاموں کے ستائے ہوئے لوگوں کے لئے شدید تڑپ رکھتی ہیں اور اس کے اظہار کے لئے کربلا سے وابستہ امیجری و استعارے استعمال کرتی ہیں۔ یہ رجحان غزل و نظم

دونوں اصناف میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ''کفِ آئینہ'' کی ایک نظم بعنوان ''نثری نظم'' میں اس صورتحال کی عکاسی ملتی ہے چاہے یہ استحصالی قوتیں آمریت کی صورت میں ہوں یا سامراجیت اور فسطائیت کی شکل میں دونوں کے خلاف شدید غم و غصے کا اظہار علامتی انداز میں کرتی ہیں۔

نینوا کی سرزمین
ایک بار پھر سرخ ہے
فرات کے پانی پر
ابن زیاد کے طرفداروں کا ایک بار پھر قبضہ ہے
زمین و آسمان ایک بار پھر شمشاہے کا لہو
وصول کرنے سے انکاری ہیں
اور میرے گلاس میں کوکا کولا ہنس رہا ہے
میرے سامنے ڈالر کی ہڈی پڑی ہوئی ہے

یہ حقیقت ہے کہ پروین شاکر کی شاعری فکر و شعور اور جذبے و احساس کی نئی جہتوں سے عبارت ہے جو جدید حسیت اور جدید دور کے ذہنی رویوں سے مالا مال ہے اُن کی شاعری شگفتگی اور لطافت کا مرقع ہے احتجاجی انداز کی نظموں میں طنز اور تنقید کی کاٹ پائی جاتی ہے۔

نظمیہ شاعری کے موضوعات بے حد وسیع ہیں۔ بلا شبہ پروین شاکر نے اُردو شاعری کو نئے امکانات سے متعارف کرایا اُردو نظم کے فروغ میں اُن کی نظمیہ شاعری نے رجحان ساز کردار ادا کیا نسوانی احساسات کو جس جذبے کی سچائی کے ساتھ پیش کیا وہ صرف انہی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے بعد میں آنے والوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بنی ہے۔

باب سوم

پروین شاکر کی غزل گوئی

(الف) اردو میں غزل گوئی کا منظر نامہ

(ب) غزل گوئی میں پروین شاکر کا اجتہاد

غزل کے بارے میں مختلف مفکرین و ناقدین اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ اب اِس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اِس بحث کی کوئی گنجائش نہیں کہ بقول کلیم الدین احمد،''غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے'' یا رشید احمد صدیقی کے مطابق،''غزل اُردو شاعری کی آبرو ہے'' یا آل احمد سرور کے مطابق ،''تلوار کی دھار اور چاول پر قل ھواللہ لکھنے کا فن ہے''۔

سچ تو یہ ہے کہ غزل کو شروع سے ہی اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے اور ہر دور میں محبوب صنف سخن کی حیثیت سے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی بھی کرتی رہی ہے۔ اِس نے زمانے کے کئی نشیب و فراز بھی دیکھے ہیں اور اِن سے بہ احسن وخوبی عہدہ برا بھی ہوتی رہی بلکہ زمانے کے اعتراضات اور مخالفتوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنے وجود کو منواتی بھی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف آج اپنی پوری طاقت، توانائی اور دلکشی کے ساتھ قائم و دائم اور ہر دلعزیز ہے۔ غزل کی مقبولیت کی تمام وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اِس کے خمیر میں عشق، محبت اور اِسی طرح کہ انسان کے دلی جذبات کی حرارت موجود ہے جس کے بغیر انسانی زندگی نامکمل ہے۔ اُردو غزل کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غزل نے ہمیشہ بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دیا ہے اور ہر دور میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا ہر پہلو، ہر

روپ، ہر نقش ہمیں غزل میں جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔

جہاں تک غزل کے موضوعات کا تعلق ہے اِس مقبول و معتبر صنف سخن کو یہ صلاحیت حاصل ہے کہ یہ زندگی کے ہر موضوع کا احاطہ کر سکے۔ ایک عرصے تک غزل کا موضوع ہجر و وصال کی داستانوں اور عاشقانہ معاملہ بندیوں تک محدود تھا بعد میں اِس میں تصوف، اخلاق، تمدن، مذہب، سیاست، مناظرِ قدرت اور حکیمانہ خیالات بھی بیان ہونے لگے۔

اِس طرح غزل کا دامن وسیع ہو گیا۔ انسانی زندگی جتنی وسیع ہے غزل کے موضوعات بھی اتنے ہی وسیع ہونے لگے۔ حیات و کائنات کا کوئی ایسا موضوع نہیں جو کامیابی کے ساتھ غزل میں پیش نہ کیا گیا ہو۔

غزل کا ہر شعر ایک ایسے جز کی مانند ہے جو غزل کا حصہ ہوتے ہوئے اُس سے الگ بھی ہے۔ یہ شعر ایک الگ اکائی کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور غزل سے جڑا ہوا بھی ہے غزل مزاجاً گیت کی اساس پر استوار ہے۔ اِس میں گیت کی خالص فضا ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اِس سلسلے میں وزیر آغا اُردو شاعری کے مزاج میں اِس طرح سے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

”گیت انسانی زندگی کے اُس دور کا مظہر ہے۔ جس میں جُز و کل کے اندر ہے۔ لیکن غزل اُس دور کی پیداوار ہے جس میں جُز و نے کل کی فضا سے باہر نکل کر اپنے وجود کا اعلان کر دیا ہے۔ مگر کل سے اُس کی وابستگی بدستور ہے“۔[1]

غزل میں جذبے اور تخیل کی آمیزش کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ جذبے کی لطیف اور نہایت ہی ارفع شکل تخیل کہلاتی ہے۔ جب جذبے کی بنیاد پر تخیل کی پرواز جنم لیتی ہے تو غزل وجود میں آتی ہے۔

---

[1] اُردو شاعری کا مزاج مصنف وزیر آغا صفحہ ۲۱۳ پبلشرز سیمانت پرکاشن دریا گنج نئی دہلی۔

غزل رمز وایمائیت کا فن ہے۔ انسان کی داخلی کیفیات اور زندگی کے تجربات ومشاہدات کا بیان رمز وکنایہ اور تمثیل کے اسلوب میں کیا جاتا ہے۔ اِس لیے رمز واشارے کے پردے میں معنی ومفہوم کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل میں اختصار وجامعیت پائی جاتی ہے کوئی بھی خیال ایک شعر کے دومصرعوں میں تکمیل کے مراحل تک پہنچ جاتا ہے۔

غزل چونکہ شاعر کے داخلی جذبات اور وارداتِ قلبی کی آئینہ داری کرتی ہے۔ اِس لیے اِس میں خارجی تجربات ومشاہدات کا بیان بھی داخلی احساس کے آئینوں سے منعکس ہوتے ہوئے صفحہ قرطاس پر منتقل ہوجاتا ہے۔ اِس طرح غزل میں ذاتی تجربات ومحسوسات کو آفاقی جہت حاصل ہوجاتی ہے۔ غزل کی تمام تر شاعری علامتی ہے۔ اِس میں براہِ راست بات کہنے کے بجائے علامتوں سے کام لیا جاتا ہے جس طرح ساقی، میخانہ یا خمریات سے وابستہ دیگر لوازمات گل وبلبل، شمع وپروانہ، دارورسن، سبزہ وگل، قطرہ ودریا، صیاد، کفر وایمان، شیخ زاہد ورند وغیرہ اِن علامتوں کے ذریعے معانی کے دریا بہائے گئے ہیں۔

یہ علامتیں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اِس لیے اِن علامتوں کی برت اور تنوع میں کمی آگئی ہے۔ فنِ غزل میں جدید علامتیں بھی وضع کی گئی ہیں۔ جس طرح کہ اقبال نے شاہین کو مردِ ملت اور لالہ بیضا کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ شاہین خودداری اور تگ ودو کی علامت ہے جبکہ ابلیس عشق اور جہد وعمل کی علامت ہے، کبوتر کمزوری اور بزدلی کی علامت ہے۔ اِس طرح اقبال نے عشق، جنسی جذبے کے بجائے انسانوں کے اخلاقی اور سماجی ارتقاء کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

سیاسی وسماجی شعور بیدار ہونے کے ساتھ رہبر، رہزن، منزل وغیرہ علامات کے ساتھ نئے

موضوعات غزل میں داخل ہوئے۔ اِس کے علاوہ ایسی علامتیں بھی وضع کی گئی ہیں جو ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی حدود کو متعین کرتی ہیں اور ہمارے شعور کو آگے بڑھاتی ہیں۔

سوز و گداز غزل کے بنیادی لوازمات میں سے ہے۔ درد و غم کی کیفیات کے اظہار کے لیے غزل کی لے بہت مدھم ہونی چاہیئے۔ شاعر جس قدر دھیمے سروں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے غزل اتنی ہی دل پذیر ہوتی ہے۔

اب نئی غزل میں پرانے مضامین بھی ہیں اور نئے بھی لیکن پرانے مضامین نئے ڈھنگ سے اِس طرح پیش کئے جاتے ہیں جو اپنے طرزِ اظہار کی بدولت نئے پن کا احساس دلاتے ہیں۔

اُردو ادب میں غزل فارسی ادب سے وارد ہوئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو شاعری اور ادب کی ابتداء دکن میں ہوئی اِس لئے تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو شعر و ادب کی با قاعدہ صورت اور ترقی دکن سے ہی شروع ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہاں کی قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں نے ادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بلکہ قطب شاہی سلطنت کا پانچواں حکمراں محمد قلی قطب شاہ پہلا غزل گو شاعر مانا جاتا ہے۔ اگر چہ اُس سے پہلے بھی کچھ شعراء کا کلام ملتا ہے۔ مگر انہیں پہلا صاحبِ دیوان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اُن کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں ۲۱۳ مسلسل غزلیں ہیں۔ جو سادگی، روانی اور برجستگی کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔ اِن میں فارسی غزل کی تقلید کا رجحان ہے لیکن فضا اور خیالات کے اعتبار سے اِن میں ہندی تہذیب و تمدن کی عکاسی ہوتی ہے۔

اُن کے یہاں ترجمے بھی ہیں خاص طور پر حافظ کی غزلوں کا اُردو ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن ایک کمی اُن کے یہاں پائی جاتی ہے کہ وہ اُردو میں تغزل کی روایت کو منتقل کرنے میں کامیاب نہیں

ہو سکے۔ اِس لیے وہ فکری عنصر اور فنکارانہ شُعور جو فارسی شعراء کا خاصہ تھا اُن کے یہاں مفقُود ہے۔ لیکن اِس کے باوجود اُن کی غزلیں غزل کی زمین ہموار کرنے میں ابتدائی کاوش کے طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اُن کی غزل کے دو اشعار ملاحظہ کریں جن سے فارسی شاعری کی پیروی کا رجحان واضح ہوتا ہے۔

کے بنیاد مستی کا تمن دیکھ زاہد و جاہل
کروں کعبہ میں سجدہ ہر کدہر کوئی کہیں گے مو
ازل تھی ہم تمن میں باری ہے اے پیر مئے خانہ
عجب کیا ہے چھپا کر دیو مئے مجھکو پیالی دو[1]

محمد قلی قطبؔ شاہ کے بعد عبداللہ قطبؔ شاہ، شاہیؔ، وجہی، غواصیؔ، طبعیؔ۔ شوقیؔ، ہاشمی اور نصرتیؔ اور غزل کے ابتدائی نمائندے کے طور پر جانے جاتے ہیں جنہوں نے دکنی غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لیکن اُن کے یہاں کوئی نیا پن دکھائی نہیں دیتا اُن کے پیش نظر چونکہ فارسی شاعری کے نمونے تھے اِس لیے اُن کے یہاں نہ صرف خیال و مضمون آفرینی کے اعتبار سے بلکہ الفاظ و تراکیب اور تشبیہہ و استعارات کے استعمال میں بھی فارسی غزل کی تقلید کا رجحان عام ملتا ہے فارسی شاعری کے تتبع کے ساتھ ساتھ اِس دور کی غزل میں ہندی گیت کا لب و لہجہ اور اثرات بھی شامل ہوتے رہے جس کی وجہ سے مجموعی طور پر دیکھا جائے تو دکنی دور کی غزل ہیئت کے اعتبار سے ایرانی اور مزاج کے اعتبار سے ہندی رنگ میں رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُس دور کی غزل ایک دوراہے پر کھڑی ہوئی ہے جسے نہ تو گیت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی وہ غزل کے اصل مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ اُس دور کی غزل کا نمونہ پیش خدمت ہے جس میں ہندی لب و لہجہ کی آمیزش

---

[1] تاریخِ ادب اُردو حصہ اول مصنف جمیل جالبی ص: ۱۴۱۹ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی ۱۹۹۲

کچھ اس طرح سے ہے۔

ے تو پیاری عشق بھی تیرا ہے پیارا
لگتا ہے بہوت تج سوں دل ہمارا
ے سکھی کچ بھی سمج توں دل میں اپنے
کتا منت کرے عاشق بچارا[1]

عبداللہ قطب شاہ

شمالی ہند میں اُردو غزل گوئی کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی کی ابتداء کے ساتھ ولی دکنی کی آمد کے بعد شروع ہوتا ہے ولؔی کی حیثیت ایک پل کی سی ہے جو دکن اور شمالی ہند کو شعری سطح پر ملاتا ہے۔ ولؔی کا دیوان جب دہلی پہنچا تو اُس وقت وہاں زیادہ تر فارسی میں شاعری ہورہی تھی۔ اُردو کو شاعری کے لیے قابلِ اعتنا گردانا نہیں جاتا تھا۔ فارسی ہی علمی وادبی زبان سمجھی جاتی تھی۔ ولؔی نے سعد اللہ گلشن اور دیگر شعراء کے مشورے سے فارسی غزل کی روایت سے استفادہ کیا۔ اِس طرح ولی کے دیوان سے شمالی ہند میں اُردو شاعری کے لئے ماحول سازگار ہوگیا شعراء کا میلان اُردو کی طرف بڑھ گیا یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری روز بروز مقبول ہوتی رہی۔ ولی نے غزل کو نئی جہتیں عطا کر کے غزل کا مزاج ہی بدل دیا غزل کے صحیح خدوخال اور فنی خصائص ولؔی کے یہاں ابھر کر سامنے آئے ولؔی نے غزل کو گیت کی محدود فضا سے باہر نکال کر نہ صرف تجربات ومحسوسات بلکہ موضوعات اور اظہارِ بیان کے لحاظ سے بھی نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ اِس طرح ولؔی کی غزل کی کڑیاں اٹھارھویں صدی کی ترقی یافتہ غزل سے جا ملتی ہیں۔ ذیل میں ولؔی کی غزلوں کے تین اشعار نمونے کے طور پر دئے جاتے

---

[1] اُردو شاعری کا مزاج وزیر آغاص: ۲۳۶ سانت پرکاشن دریا گنج نئی دہلی۔۲۰۰۰

ہیں جو تین ادوار سے متعلق ہیں کہ تیسرے دور کی شاعری کا انداز دوسرے اور پہلے دور کی شاعری سے کس قدر مختلف تھا۔

ے تیرے بن مجھ کو اے ساجن تو گھر اور بار کیا کرنا
اگر تو نا اچھے مجھ کن تو یہ سنسار کیا کرنا

ے تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں تیرے نین غزالاں سوں کہوں گا

ے زندگی جامِ عیش ہے لیکن
فائدہ کیا اگر مدام نہیں[1]

دکنی غزل کا یہ دور دوسوسال کے طویل عرصے پر محیط ہے ولی دکنی اور سراج دکنی اِس دور کے آخری نمائندے ہیں سراج کے ہاں اخلاق، تصوف، حسن و عشق کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ ولی کے بعد دکن میں اُردو غزل کے بڑے شاعر سراج دکنی ہیں۔ بعض اوقات سراج کی غزل ولی سے بھی نکلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی غزل کے کچھ اشعار ے

ے اے جانِ سراج ایک غزل درد کی سن جا
مجموعۂ احوال ہے دیوان ہمارا
شکر للہ اِن دنوں تیرا کرم ہونے لگا
شیوۂ جو روستم فی الجملہ کم ہونے لگا[2]

۱۔ اُردو شاعری کا فنی ارتقاء صفحہ: ۱۱۶۔ مصنف ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۸

۲۔ تاریخ ادب اُردو، مصنف جمیل جالبی ص: ۱۵۶۹ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۔۱۹۲۲

وؔلی نے شمالی ہند کے جن شعراء کو متاثر کیا اُن میں محمد شا کر ناجؔی، آبؔرو، خان آرزؔو، مضمون، یلرنگ، احسن اور اُن کے بعد شاہ حاتم، فغاں، تاباں، مظہر جان جاں شامل ہیں۔ اس دور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان شعراء کے یہاں ایہام گوئی رعایت لفظی اور قافیوں کا غلط استعمال عام پایا جاتا ہے اِس طرح مبتذل خیالات بھی فروغ پانے لگے۔ اِس تحریک کے کچھ مثبت اور منفی پہلو سامنے آئے۔ مثبت اس طرح سے ہیں کہ ایہام گو شعراء نے معنی کی کثرت پیدا کرنے والے الفاظ تلاش کرنے کی خاطر زبان کو کھنگالا اِس طرح زبان و بیان میں وسعت پیدا ہوئی اور نئے نئے الفاظ زبان میں شامل ہونے لگے۔ منفی پہلو یہ تھے کہ ذو معنی الفاظ کی تلاش میں شاعری پر تصنّع اور مرصع کاری کا رجحان غالب آ گیا جس سے غزل کی شعریت اور تغزل میں کمی آتی گئی۔ اسی دوران ایہام گوئی کو ترک کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ایہام گوئی مخالف تحریک پروان چڑھی جس میں جذبات کی صداقت پسندی کے بجائے سادگی بیان حسنِ زبان فارسی الفاظ اور اسالیب کو استعمال میں لانے پر زور دیا گیا۔ اِس تحریک میں مرزا مظہر جاںؔ جاں، تاباںؔ، یقیؔن، باقرؔ، حزیں اور شاہ ظہور الدین بھی پیش پیش رہے۔ میرؔ اور سوؔدا کے دورِ عروج تک ایہام گوئی کا خاتمہ ہو گیا۔ ان میں شاہ حاتم کا نام اِس لئے قابلِ ذکر ہے کہ وہ پہلے ایہام گوئی کے سرگرم رکن تھے لیکن بعد میں انھوں نے اُردو شاعری کی اصطلاح و تہذیب کی طرف خاص توجہ دی اور اپنے کلام میں سچائی، خلوص، بیاں کی سادگی اور حسنِ بیان کا خاص خیال رکھا۔ انھوں نے اپنا پرانا دیوان مسترد کر دیا اور نیا دیوان، ''دیوان زادہ'' کے نام سے مرتب کیا جس میں عربی فارسی الفاظ کے ساتھ ساتھ اصلاحِ زبان کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ یہی وہ دور ہے جس نے غزل گوئی کے اُس سنہری اور شاندار دور کے لیے زمین ہموار کی جس کی شروعات سوؔدا، میرؔ اور دردؔ سے ہوتی ہے۔ اِن تین عظیم شاعروں نے غزل کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ اِس

دوران غزل کی دیگر اصناف بھی کافی پھلیں پھولیں لیکن غزل کی مقبولیت کا پلڑا نسبتاً بھاری رہا۔ اِس دور کے صاحبِ طرز شاعروں میں سوؔدا، میرؔ، اور خواجہ میر دردؔ کے علاوہ میر سوزؔ، میر حسنؔ اور آثرؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اِس دور میں غزل کلاسیکی شعری روایت سے آشنا ہوئی ساتھ ہی غزل میں ربط، روانی، بندش کی چستی محاوروں کا برمحل استعمال اور عربی فارسی لفظوں کو صحت تلفظ کے ساتھ برتنے کا رجحان عام ہوا۔

خدائے سخن میر تقی میرؔ نے اُردو غزل کو صحیح زبان پرسوز لہجہ نیز تہذیبی و ثقافتی مزاج عطا کیا۔ میرؔ کے عہد میں ملک میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر بد نظمی اور انتشار کا شکار تھا۔ جس دور اور حالات سے میرؔ گذرے غم والم اُن کے مزاج میں پوری طرح سے رچ بس گیا تھا میرؔ نے اُس دور کے درد بھرے حالات کی ترجمانی کی اور اپنی ذاتی محرومیوں کو آفاقی رنگ دے دیا۔ جس سے غزل کا رشتہ عوام کی زبان سے جڑ کر وسیع ہو گیا۔

سوؔدا نے اپنی تخلیقی توانائی کے بل بوتے پر اُردو غزل کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ انہیں تمام اصنافِ سخن پر قدرت حاصل تھی قصائد اور ہجو گوئی میں بھی کوئی اُن کا مدِ مقابل نہ تھا۔ لیکن اُن کی غزلیں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے فارسی کی روایت کو ایک نئے قالب میں ڈھالا اِس طرح فارسی کے بکثرت الفاظ و محاورات اُردو زبان میں اِس طرح داخل کیے کہ وہ اِس کا جز و ہو گے اور یہ بعد میں آنے والوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ثابت ہوئے۔

اِس دور کے تیسرے بڑے شاعر خواجہ میر دردؔ ہیں جنہوں نے تصوف اور مجاز کے دلکش نغمے چھیڑے۔ تصوف کے مختلف مسائل اور کیفیات عشقیہ انداز میں اُن کے یہاں ملتے ہیں۔ اِس کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی، قناعت، توکل جیسے مضامین سے غزل میں چند اہم اضافے ہوئے ذیل میں

میر تقی میرؔ اور میر دردؔ کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

ے دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
میرؔ

ے شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں
میرؔ

ے جگ میں آکر ادھر اُدھر دیکھا
تو ہی نظر آیا جدھر دیکھا
دردؔ

ے درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کس طرف چلے
دردؔ

اٹھارھویں صدی عیسوی میں اُردو غزل نے کافی ترقی کی غزل کے ارتقاء کا مرکز دہلی تھا۔ لیکن جب دہلی کے سیاسی و معاشی حالات زوال پذیر ہونے لگے تو شعراء وادباء لکھنو، فیض آباد اور دیگر ریاستوں کا رُخ کرنے لگے۔ اِن حالات کا اثر اُردو غزل پر بھی پڑا اور اُردو شاعری کے لیے لکھنؤ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی شعر و شاعری کی انجمنیں اب لکھنؤ میں سجنے لگیں چنانچہ میرؔ، دردؔ، اور سوداؔ بھی لکھنؤ چلے گئے، اور اُن کے دیگر معاصرین بھی جیسے مصحفیؔ، انشاءؔ، جراتؔ رنگین اور قائم چاند

پوری وغیرہ شامل ہیں، نے بھی لکھنؤ کا رُخ کیا۔ ان میں سے تو بعض نے اجڑی ہوئی دلی کے قصیدے قلمبند کئے جس طرح کہ سوداؔ نے شہر آشوبؔ، قصیدہ تضحیکِ روزگار، میرؔ کا مخمس درحال لشکری، ''مثنوی دربیان کذب'' اور ذکر میر وغیرہ میں کچھ اپنی داستان قلمبند ہے اور کچھ اجڑی ہوئی دہلی کی اِس دور کی غزل میں بھی زوال پذیر معاشرے کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف اِس دور کے کئی شاعروں کے یہاں جیسے کہ مصحفیؔ، انشاؔء اور جرأتؔ ہیں لکھنؤ کی نشاط انگیز تہذیب کی رونقیں اور رعنائیاں بھی پائی جاتی ہیں جس طرح جرأت کے یہاں جسم وجنس کا موضوع اہمیت اختیار کر گیا۔ اِس طرح غزل میں خارجی عناصر شامل ہونے کا رجحان بڑھ گیا۔ معاملہ بندی، ابتذال، جنسی لذت پرستی وارداتِ عشق وہوس عام ہونے لگی۔ ریختی اسی دور کی پیداوار ہے جس سے عام عورتوں کی زبان اور محاورے شاعری میں داخل ہوئے۔ رنگینؔ اور انشاؔء کا نام ریختی کے حوالے سے آتا ہے۔

لکھنوی شاعری کی خصوصیات دلی کی شعری خصوصیات سے کافی مختلف تھیں۔ اِس طرح دو دبستان وجود میں آئے جنھیں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کہا جاتا ہے جو دو مختلف رجحانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دبستانِ دہلی میں داخلیت کا عنصر غالب ہے اور اس پر قنوطیت، یاسیت، درد، سوز اور تصوف کی گہری چھاپ ہے اور زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہے۔

جبکہ لکھنؤیت میں خارجیت کا احساس ہے۔ وہاں کی پر امن زندگی خوشحالی و فارغ البالی وہاں کی شاعری سے پوری طرح سے منعکس ہوتی ہے کہ جس طرح بیبا کی، عریانی کا رجحان سوز وگداز اور جذبات نگاری سے عاری لہجہ، تکلف وتصنع سے بھرپور اسلوب پایا جاتا ہے۔

عشق و عاشقی کا موضوع دونوں دبستانوں میں خوب برتا گیا ہے مگر دہلی کے دبستان میں عشق تصوف کے زیرِ اثر ہے جس میں قلب وروح کی تڑپ اور کسک کا احساس ہے جبکہ دبستانِ لکھنؤ

کے شعرا کے یہاں عشق میں بوالہواسی ہے۔شاعر معشوق کے ظاہری حسن زیور سراپا لباس اور معشوق کی چال ڈھال اداؤں اور گھاتوں تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔

انیسویں صدی کے ابتداء کے ساتھ ہی غزل میں ایک بار پھر تبدیلی واقع ہوتی ہے آتشؔ، ناسخؔ اور شاہ نصیرؔ کے زمانے میں نہ صرف غزل کی زبان کی اصلاح کی طرف توجہ دی گئی بلکہ زبان وشعر کے اصول بھی مقرر کیے گیے ۔

ناسخؔ جنھیں استادِ سخن کہا جاتا ہے اُردو غزل کے تئیں اُن کا سب سے بڑا احسان اصلاحِ زبان ہے۔انھوں نے زبان کو املا اور تلفظِ صحت کے اعتبار سے برتنے پر زور دیا۔ بہت سے نامانوس الفاظ ترک کر کے زبان کو دلکش بنایا تذکیروتانیث کے اصول تراشے۔عروض وقوافی اور اوزان کی صحت پر زور دیا اِس طرح اُردو زبان کو نکھارنے اور سنوارنے کی سعی کی۔اُن کے کلام میں نازک خیالی اور قلبی واردات کی ترجمانی بہت ہے لیکن تاثیر کی کمی پائی جاتی ہے۔

اُن کی شاعری میں اگر چہ تصنع اور آورد کا رجحان پایا جاتا ہے مگر پھر بھی اُردو غزل میں زبان کی اصلاح کے سلسلے میں ناسخؔ نے مجتہدانہ اقدامات کیے۔آتشؔ ناسخؔ کے ہم عصر تھے سوز وگداز کے لحاظ سے اُن کا رنگ تغزل ناسخؔ سے کہیں بہتر ہے۔اُن کے یہاں تغزل کا صاف ستھرا معیار پایا جاتا ہے لکھنؤیت و دہلویت کی عمدہ اقدار وروایات اُن کے فن کی بنیاد بنیں مزاج بھی درویشانہ تھا لہٰذا اُن کے ہاں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور لکھنؤ کی نشاط انگیزی وطر بنا کی کا افز بھی ساتھ ہی دلی کے ماحول کی غم و یاس کی چھاپ بھی آتشؔ کی غزل کے چند اشعار جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں تصوف کا موضوع ایک انوکھی اور نرالی آن بان کے ساتھ جلوہ گرہ ہوا ہے۔

ظہورِ آدم خاکی سے یہ مجھ کو یقین آیا
تماشا انجمن کا دیکھے خلوت نشین آیا

عدم میں ہستی سے جاکر یہی کہوں گا میں
ہزاروں حسرت زندہ کو گاڑداب آیا

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اِس قطرے کو دریا کی جدائی کا

نقش صورت کو مٹا کر آشنا معنی کا ہو
قطرہ بھی دریا ہے جو دریا سے واصل ہوگیا[1]

دہلی کے حالات سنبھلنے کے ساتھ ہی اُردوغزل اپنے پرانے مرکز کی طرف واپس لوٹ آتی ہے۔ جہاں اُسے غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور ظفرؔ جیسے عظیم شعراء کی ہمراہی اور پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔جس سے اُردوغزل نئی بلندیوں سے آشنا ہوتی ہے۔

اِن میں غالبؔ ایک عظیم شاعر ہیں جنھوں نے روایتی انداز سے ہٹ کر بالکل ایک نئے ڈھنگ سے غزل کی مشاطگری کی اور اُردوغزل کو ذہن ودماغ عطا کیا۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کو فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے پرکھنے کے عادی ہیں۔ کہیں وحدت الوجود اور تصوف کے عقدے کھولتے ہیں اور کہیں انسانی نفسیات کی گھتیاں سلجھاتے ہیں، رندی ومستی کے راگ بھی الاپتے ہیں۔فکر وفلسفہ کے رموز ونکات کے ساتھ ان کی غزلیں زندہ دلی اور شگفتگی سے عبارت ہیں ظرافت،طنز اور شوخی اُن کی غزلوں

---

[1] اُردو شاعری کا مزاج: وزیرآغا صفحہ ۲۵۳ سیمانت پرکاشن دریا گنج نئی دہلی ۲۰۰۰ء،''تاریخ ادب اردو'' رام بابو سکینہ مترجم مرزا محمد عسکری صفحہ ۲۸۹

کی پہچان ہے۔اُن کے یہاں تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ تہہ داری بھی ہے، مضمون آفرینی کا کمال بھی ہے اور ترکیب سازی کا ہُنر بھی۔

غم ہستی کا اسدکس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیمان کا پشیماں ہونا[1] غالبؔ

غالبؔ و مؤمنؔ کا عہد جن میں ذوقؔ اور ظفرؔ بھی شامل ہیں انیسویں صدی عیسوی کی ساتویں دہائی تک کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ تمام شعراء دہلی کے دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالبؔ کا کلاسیکی اُردو غزل کے آخری نمائندے ہیں اُن کے بعد مغربیت کے زیرِ اثر انحراف کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اِس عہد کی غزل پر اس دور کے سیاسی و سماجی اثرات دکھائی دیتے ہیں تاہم اِس عہد کی غزل کا کوئی عمومی رجحان موجود نہیں بلکہ ہر غزل گو شاعر دوسروں سے مختلف خصوصیات کا حامل ہے۔ جس طرح غالبؔ کا ایک مزاج ہے اور مؤمنؔ کا اپنا انداز ہے۔ مؤمنؔ کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے مشہور ہے۔ معاملات حسن و عشق کی صحیح ترجمانی، جذبات نگاری، نفسیات شناسی، باریک بینی اور لطیف طنزیہ انداز کی بدولت اپنے ہم عصر شعراء میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

مؤمنؔ کی غزل سے دو اشعار پیش خدمت ہیں۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مؤمنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

---

[1] ''کاشف الحقائق'' امداد امام اثر مرتبہ وہاب اشرفی ص:۴۳۵ قومی نسل برائے فروغ اُردو زبان مئی دہلی ۱۹۹۸

قیس کی دیوانگی میں عقل کیا حیران ہے
مجھ کو وحشت ہوگئی تصویرِ لیلیٰ دیکھ کر

ذوقؔ جنھیں بہادر شاہ ظفر کی طرف ملکِ الشعراء کا منصب عطا کیا گیا تھا، اُن کے یہاں روائتی مضامین عام ملتے ہیں۔ اخلاقیات، تصوف، نیکی، دنیا کی بے ثباتی، زبان و بیان کی سادگی و پختگی کے ساتھ محاورات کا برمحل استعمال وغیرہ عام ہے لیکن تغزل کا عنصر اُن کے یہاں کم پایا جاتا ہے۔ لیکن اُن کی غزلوں میں ایک وزن اور وقار پایا جاتا ہے۔

اِس دور کے ایک اور اہم شاعر سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر تھے۔ انھوں نے پہلے ذوقؔ اور پھر غالبؔ کی شاگردی اختیار کی۔ وہ موسیقی کے فن میں مہارت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں ایک طرح کا ترنم پایا جاتا ہے۔ اُردو غزل کی تاریخ میں ظفر کے کلام کو فراموش نہیں کیا جاسکتا یوں تو اُن کی غزلوں میں معاملہ بندی، خارجی مضامین پائے جاتے ہیں لیکن انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنی آپ بیتی کچھ ایسے درد بھرے انداز میں رقم کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ معصومیت، صفائی، سادگی، بے تکلفی، درد، تڑپ اور رنگِ تغزل کے لحاظ سے اُن کا کلام منفرد ہے۔

یار نہیں غم خوار نہیں ہمدرد ظفرؔ اب کوئی نہیں
کنجِ غم میں آپ ہی کہیئے دل کو مرے بہلائے کون
کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دوگز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں[1]

غالبؔ کے بعد اُردو غزل جدید عہد میں داخل ہو جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے

---

[1] اردو غزل'' مرتبہ کامل قریشی ص: ۱۷۵ اُردو اکادمی نئی دہلی ۲۰۰۰ء

زوال اور ملک پر انگریزوں کے تسلط کے بعد سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر کئی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کے نتیجے میں سماجی بیداری و اصلاح کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اور اس مقصد کے تحت مختلف قسم کی سیاسی و سماجی و اصلاحی تحریکیوں کا دور شروع ہوا۔

اِس سماجی بیداری کا اثر اُردو ادب پر پڑنا لازمی تھا چنانچہ سرسید، حالی، آزاد اور شبلی نے نیچرل ازم کی تحریک کے زیر اثر نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ جس کا مقصد شاعری کو حقیقی با معنی و با مقصد بنانا اور ادب کو ملک و قوم کی خدمت اور اصلاح کے لیے استعمال کرنا تھا۔ اِس ضمن میں حالؔی نے غزل کی اصلاح پر کافی زور دیا اور غزل میں سیاسی، معاشرتی و تہذیبی موضوعات شامل کیے۔ حالؔی نے اُردو غزل کو نئے موضوعات اور نئے تقاضوں سے اہم آہنگ کیا انھوں نے 'مقدمہ شعر و شاعری' کے ذریعے سادگی، اصلیت اور جوش کا تصور پیش کیا۔

حالؔی کی اصلاحی کوششیں رنگ لائیں اور اردو غزل مختلف مراحل طے کرتی ہوئی بیسویں صدی کی جدید غزل کہلانے کے قابل ہوگئی۔

اکبؔر، چکبستؔ اور اقبالؔ کی غزلوں میں حالؔی کے اِس اصلاحی نظریۓ کی کارفرمائی نمایاں طور نظر آتی ہے۔

اُس دور میں محمد حسینؔ آزاد، اسماعیلؔ میرٹھی اور سرور جہاںؔ آبادی نے بھی غزلیں کہیں مگر وہ اِس میدان میں اپنی کوئی خاص شناخت نہ بنا سکے اکبر الٰہ آبادی نے سماجی اصلاح کا کام اپنے ظریفانہ کلام سے سرانجام دیا۔ اُن کی شناخت طنزیہ و مزاحیہ غزلوں کی بدولت ہوئی جو سماج کو سدھارنے کے لیے لکھی گئیں۔

؎ مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی
ایک دن دیکھیں گے ہفتِ اقلیم اُن کے ہاتھ میں

اکبرالہ آبادی

چکبستؔ نے ملی جزبے سے سرشار نظمیں لکھیں جوان کی مقبولیت کا باعث بنیں مگر اہمیت کے لحاظ سے اُن کی غزلیں بھی کچھ کم نہیں جن میں صوفیانہ رنگ، متانت سنجیدگی، کے ساتھ ساتھ روائتی اور فرسودہ مضامین کے بدلے موضوع اور مواد کے اعتبار سے وسعت اور جدت پائی جاتی ہے۔

؎ مٹنے والوں کی وفا کا سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

چکبستؔ

بیسویں صدی میں اُردو غزل کو نئی آب وتاب عطا کرنے والوں میں مولانا محمد علی جوہر کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے اُن کی بدولت اُردو غزل ملکی وملی جذبات وخیالات سیاسی نظریات، قید و بند اور دار ورسن جیسے موضوعات سے متعارف ہوئی۔ اس طرح غزل میں نہ صرف موضوع بلکہ انداز کے اعتبار سے بھی وسعت پیدا ہوئی۔

اقبالؔ کی آمد سے اُردو غزل کے جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اقبال کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہے۔ وہ ایک پیامی شاعر تھے۔ انھوں نے فکر وفلسفہ کے رنگوں سے غزل کی آبیاری کی اور اسے نئے امکانات سے روشناس کیا اِس طرح اُن کی غزل حیات وکائنات کی صداقتوں کی امین بن گئی اور غزل میں ہر لحاظ سے جدت پیدا ہوئی۔

؎ کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے ہر گوش پہ عریاں ہو

اقبالؔ

؎ تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں

اقبالؔ

اُردو غزل کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں شادؔ عظیم آبادی کی غزلیں بھی ایک اہم قدم کے طور پر مانی جاتی ہیں اُن کے یہاں جدید رنگِ غزل کا احساس نمایاں ہے اِس کے ساتھ ہی رندانہ مضامین، عشق کی کیفیتیں، سوز و گداز، سادگی و بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔

اُردو غزل کی روایت میں فانیؔ نے اپنا انفرادی رنگ قائم کیا انھوں نے ذاتی غم و الم کے ساتھ اجتماعی کرب کو فکر و فلسفہ کے ساتھ پیش کیا۔ وہ غالبؔ کے علاوہ میرؔ اور داغؔ سے بھی متاثر تھے زبان و محاورات کی سجاوٹ اور رکھ رکھاؤ جو لکھنوی دبستان کا خاصہ تھا، فانیؔ کے یہاں نمایاں ہے۔

؎ فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانیؔ

جدید اُردو غزل کی زلفیں سنوارنے میں اصغر گونڈویؔ ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ اُن کی غزلیں پاکیزہ رندانہ سرمستی اور کیف و نشاط کی کیفیتوں سے بھرپور ہیں جن میں تصوف بھی ہے، عشقِ حقیقی و مجازی کے جلوے بھی ہیں اور حرکت و عمل کا درس بھی۔

اُن کی غزلیں روح کونشاطیہ کیفیات عطا کرتی ہیں۔

اصغر نشاطِ روح کا ایک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگین نگار کو

اُردوغزل میں اصغر کے بعد جگر کا نام بھی نمایاں نظر آتا ہے وہ رومانی شاعر ہیں اُن کے یہاں حسن وعشق کے ساتھ زندگی کی رنگینی حسن پرستی جذبوں کی سچائی مشرقی اقدار وروایات کے سانچے میں ڈھل کر غزل کی صورت میں سامنے آئی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا جس کا مقصد ادب کے ذریعے سیاسی وسماجی شعور کو بیدار کرنا ادب میں حقیقت پسندی کو فروغ دینا، ادب کو عوامی خواہشات اور امنگوں کا ترجمان بنانا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو اُردوغزل میں سیاسی وسماجی بیداری جیسے موضوعات ترقی پسندی سے پہلے ہی داخل ہو چکے تھے جس کا ثبوت حالؔی، آزؔاد، اور اقبالؔ کے یہاں سے ملتا ہے۔ اُن کے یہاں ترقی پسندی کی چاپ بہت پہلے محسوس کی جاسکتی ہے۔ نیز ۱۸۵۷ء کے بعد سیاسی وسماجی سطح پر کئی طرح کی انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے کئی ایسے موضوعات سامنے آئے جو شعراء وادباء کے لئے قابلِ توجہ تھے۔ اِس طرح یہ تمام حالات وواقعات ترقی پسندانہ موضوعات کی طرف بڑھنے کے لیے پیش منظر کا کام کرتے رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ملک بھر میں اِس تحریک کے ذریعے اردو شاعری اور جدید خیالات کو فروغ بخشا اور اِس کے لیے نئی راہیں استوار کیں۔ ترقی پسندوں نے ادب کو جمہوریت، انسانیت، اخوت ومساوات، جیسی اعلیٰ قدروں کی ترویج واشاعت کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے یہ تحریک کافی مقبول ہوگئی، اگرچہ کئی ترقی پسندوں نے غزل کی تنگ دامنی کی شکایت کی بنا پر اس کی بھر پور مخالفت بھی کی مگر اُن کی مخالفت کا یہ نعرہ کھوکھلا ثابت ہوا۔ بہت سے شعراء نے اپنے افکار

محسوسات کو اِس صنف میں پیش کیا اور اسے نت نئے تجربوں اور ہیئتوں سے مالا مال کیا۔ اِس طرح غزل کا دامن وسیع ہوگیا اور غزل حسن و عشق کے قصوں، گل و بلبل کی حکائتوں سے قطع نظر سماجی حقیقتوں کی عکاسی بن گئی۔

ترقی پسند تحریک وقت کی ضرورت کے طور پر ابھری اور بہت سے شعراء اِس سے وابستہ ہوئے جن میں مجازؔ، مخدومؔ، پرویزؔ، فیض، جذبیؔ، علی سردار جعفریؔ، غلام ربانی تاباںؔ، اختر انصاریؔ، ساحرؔ، وامقؔ جونپوریؔ، جاں نثار اخترؔ، کیفی اعظمیؔ، سکندر علی واحدؔ، ندیم، مجروحؔ، قتیل شفائیؔ، ظہیر کاشمیریؔ، احمد فرازؔ وغیرہ شامل ہیں۔ اِن میں سے کچھ نے اپنا منفرد رنگ اختیار کیا اور غزلیں کہیں اِس طرح ترقی پسند غزل کو ایک خاص مقام عطا کیا ترقی پسند تحریک سے پہلے ہماری غزل پر جو رومانی رنگ چھایا ہوا تھا اُس کا اثر مجازؔ، اور جذبی کے یہاں دکھائی دیتا ہے مجازؔ کے یہاں رومانیت کی چھاپ ہے مگر اُن کے یہاں انقلابی مزاج کا رومان پایا جاتا ہے جس میں جرأت، حوصلہ اور مقصدیت پائی جاتی ہے۔

فیض احمد فیضؔ ایک ایسے ترقی پسند شاعر ہیں جن کے سامنے واضح طور پر اقبال کے نقشِ قدم تھے۔ وہ اپنے فکر و فن اور شہرت کی بدولت اُس مرتبے پر جا پہنچے جہاں غالبؔ اور اقبالؔ فائز ہو چکے تھے۔ اُن کا تصور حسن و عشق، انسانی مسائل، کشمکشِ حیات زندگی کے گوناگوں مسائل سے عبارت ہے اُن کے یہاں سیاسی تشدد، زبان بندی اور قید و بند کے خلاف احتجاج پایا جاتا ہے۔ اِس طرح فیضؔ نے پرانی علامتوں کو نئے معنی و مفاہیم میں ڈھال کر اُردو غزل کے دامن کو وسعت عطا کی۔

؎ مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے   فیضؔ

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر راہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گذر کر جاتی ہے

فیضؔ

احمد ندیم قاسمیؔ بھی بنیادی طور پر ترقی پسند خیالات کے ترجمان ہیں اُن کی غزلوں کے موضوعات حسن و عشق، حیات و کائنات کے مسائل تک پھیلے ہوئے ہیں۔

علی سردار جعفریؔ نے بھی سیاسی موضوعات پر غزلیں کہی ہیں جن میں جوشِ خطابت اور بیانیہ انداز نظر آتا ہے۔ اُن کے یہاں وہی لفظیات دکھائی دیتی ہیں جو ترقی پسندوں کے یہاں عام طور پر استعمال ہوئی ہیں، مثلاً دار و رسن، قفس، صبحِ شہادت جیسے الفاظ بہت استعمال ہوئے ہیں۔

ترقی پسندوں کی فہرست میں قتیل شفائیؔ بھی اہم نام رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں حسن و عشق کے علاوہ سیاسی و سماجی موضوعات بڑے نرم اور مؤثر لہجے میں بیان ہوئے ہیں۔ ساحر لدھیانویؔ بھی ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم رکن تھے اُن کی غزلیں ترقی پسندانہ خیالات کی ترجمان ہیں۔

اِن کے علاوہ ظہیر کاشمیریؔ، کیفی اعظمیؔ، کیف بھوپالیؔ، شکیلؔ بدایونی، اور احمد فرازؔ کے یہاں ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے فکر و فن سے اُردو غزل کو ایک خاص مقام عطا کیا۔ ترقی پسند شعراء کی بدولت اُردو غزل نئے اسالیب، نئی معاشرتی فضا، نئے سیاسی افق کی ترجمان بن گئی نیز اِنکی بدولت غزل میں جدید موضوعات کے ساتھ ساتھ نادر تشبیہات و استعارات اور لفظیات بھی شامل ہوئے جن سے اُردو غزل کے دامن کو کافی وسعت ملی۔

۱۹۴۷ء کے بعد تقسیم سے وابستہ موضوعات غزلوں میں بہت کامیابی سے برتے گئے جن

میں ہجرت اور فرقہ وارانہ فسادات سرِ فہرست رہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اُس دور کے دیگر مسائل بھی موضوعِ سخن بنے۔ تقسیم کے بعد ترقی پسندی کا زور کم ہونے لگا جس کی وجہ یہ تھی کہ جدیدیت کے انتہا پسندانہ رویئے نے دانشوروں کو اس تحریک سے بیزار کر دیا۔ اور یہ تحریک اپنے انجام تک پہنچی نصف بیسویں صدی کے آس پاس ایک نئی شاعری کی شروعات ہوئی جس نے فن کار کو فکری و نظریاتی سطح پر کھلی فضا کے احساس سے آشنا کیا۔

جسے جدیدیت کے رجحان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۰ کے آس پاس ترقی پسندی کے ردِ عمل کے طور پر یہ رجحان وجود میں آیا اِس کا مقصد قدیم روایات سے انحراف کرنا اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا تھا۔ اِس میں جدید فکر و اسلوب کو رائج کرنا اجتماعیت کے بدلے شاعر کی انفرادیت اُس کے مزاج اُس کے ذاتی محسوسات کو نمایاں کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا جماعت سے زیادہ ذات کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ جدید اُردو غزل پر کسی ایک نظریے یا مسلک کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا نہ کسی محدود دائرے میں اس کو قید کیا جا سکتا ہے۔ یہ عصری زندگی کے مسائل اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اِس میں لطیف اور مزیہ انداز میں احساسات کا اظہار کیا گیا ہے۔

جدید غزل کی نمایاں خصوصیت، تنہائی کا کرب، بے وطنی و بے چینی کے احساس، عدم تحفظ اور غیر یقینیت کے اظہار سے عبارت ہے۔ اس کے علاوہ اِس میں احساس کی شدت اور جذبے کی صداقت پائی جاتی ہے۔ پرانی علامتوں کے تکرار کے بجائے نئی اور تازہ علامتوں، تلازموں، تشبیہہ استعاروں سے مزین ہے مثلاً ریت، خاک، دھواں، پتہ، فصل، رات دن، سورج شام، سناٹا پرچھائیاں وغیرہ اس طرح جدیدیت کے رجحان کی بدولت اردو غزل کو کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع میسر آیا۔ اور غزل کی فضا لامحدود ہوگئی۔

جن عہد ساز شعراء نے اُردو غزل کو عصر حاضر کی خوبُو سے متعارف کیا اُن میں ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، ظفر اقبال، باقر مہدی، شہزاد احمد، حسن نعیم، شہاب جعفری، شاد تمکنت، مخمور سعیدی، بشیر بدر، مظفر حنفی، شہر یار، ندا فاضلی، محمود علوی، ساقی فاروقی، افتخار عارف اور پروین شاکر شامل ہیں۔

جدید غزل گو شعراء میں پروین شاکر ایک امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ جدید اُردو غزل کا منظر نامہ اُن کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا اُن کا شمار چند اُن شاعرات میں ہوتا ہے جنھوں نے بہت کم مدت میں اُردو شاعری کے میدان میں اپنا آپ منوایا بلکہ وہ ادا جعفری کے بعد دوسری شاعرہ ہیں جس نے شہرت و مقبولیت کے وہ رستے بھی طے کر لیے جو بہت کم شاعرات کو نصیب ہوئے۔ انھوں نے منفرد لب و لہجے، نئے طرزِ فکر، مخصوص اسلوب اور لفظوں کے انتخاب کی وجہ سے اِس صنف کو نکھارا اور اسے ایک نئی جہت عطا کی، اِس کے ساتھ ساتھ غزل کے باب میں کچھ ایسے اضافے بھی کیے جو ہمیں اس سے پہلے نظر نہیں آتے ہیں، ویسے تو ان سے پہلے بھی خواتین اپنے محسوسات کا اظہار غزل کے پیرائے میں کرتی رہی ہیں لیکن پروین شاکر نے نسوانی جذبات و احساسات کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کیا اور انہیں سچے اور کھرے نسوانی انداز میں لفظوں کے موتیوں میں پرو کر کچھ ایسے پیش کیا ہے کہ جس کی مثال کسی اور اردو شاعرہ کے یہاں نہیں ملتی۔ یہ بات واضح ہے کہ ان کے یہاں غزلوں کی نسبت نظمیں زیادہ پائی جاتی ہیں لیکن غزلیں ہی ان کی شہرت کا باعث بنیں اور اُن کی بہت سی غزلوں کے اشعار زبان زد عام ہوئے۔ بہت سی غزلیں مشہور گلوکاروں کی آواز میں صدا بند ہو کر ہر طرف پروین کی مقبولیت کا سکہ بٹھا گئیں۔

غزل کے لب و لہجے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ کافی بے باک نظر آتی ہیں۔ اردو شاعری

میں پہلی دفعہ کسی عورت نے اس قدر بے باکی سے کسی مرد کو اپنا محبوب ظاہر کیا ہے، ویسے تو ہندی شاعری میں محبوب مرد ہوتا تھا اور عورت کی طرف سے اظہارِ عشق کیا جاتا تھا لیکن مرد شاعر اظہارِ جذبات میں حقیقت نگاری سے قاصر رہتے تھے، اِس میں لطافت نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی ریختی بھی لکھی گئی لیکن اس میں غیر اخلاقی مضامین کی بھرمار تھی اِس کی حیثیت شائستگی اور تہذیب کے نام پر ایک بدنما داغ کی سی تھی۔ پہلی دفعہ کسی عورت نے اس قدر بے باکی سے کسی مرد کو اپنا محبوب جان کر اپنے لطیف جذبات کا جس حسن و دلآویزی سے اظہار کیا ہے وہ ان کا امتیازی رنگ ہے۔

اُردو کی روائتی شاعری میں مرد شعراء نے عورت کو بے وفائی، سنگدلی وغیرہ جیسی صفات کا حامل ظاہر کیا طعنے دیے شکوے کیے لیکن پروین شاکر پہلی ایسی شاعرہ ہیں جنھوں نے مرد کا ہرجائی پن، بے التفاتی، اور سنگدلی کو نسوانی لب و لہجے میں ظاہر کیا۔ اساتذہ غزل کے یہاں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ رقیب روسیاہ ہمیشہ مرد ہوتا تھا لیکن پروین کے یہاں ایک عورت ہے۔ غزل کے روائتی انداز کے برخلاف یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے۔

اگرچہ فارسی شاعری میں قرۃ العینؔ طاہرہ اور انگریزی میں Emily Bronte نے کسی حد تک نسوانی جذبوں کو شاعری کی زبان عطا کی لیکن وہ مجموعی طور پر ''طبقہ نسواں'' کی نمائندگی نہ کرسکیں۔

پروینؔ کی غزلوں کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نسوانی دنیا کا ایک نیا نگارخانہ تشکیل دیا اور اِس کے ساتھ ایک نئ امیجری بھی تخلیق کی جس میں بلبل، پروانہ، شمع برق، خرمن، صیدِ صیاد، دانہ و دام جیسے مضامین جو غزل کا سرمایہ سمجھے جاتے تھے تبدیل ہوکر خوشبو، تتلی، دھنک، جگنو، مہندی، چنری، چوڑیاں، چڑیا کے گیت اور گلاب، رات کی رانی کا روپ دھار کر غزل کو آراستہ کررہے ہیں۔ دھوپ، سورج شفق، چاند، بادل، روشنی، قوس قزح، ہوائیں، پانی جیسے لفظوں سے

انھوں نے اپنی غزل کی امیجری تیار کی ہے۔

فہمیدہ ریاض ان کی شاعری کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔

''پروین شاکر کی شاعری سرتاسر جمال ہی جمال ہے نغمگی ہی نغمگی ہے اور اس قسم کی شاعری ہمارے معاشرے کے لیے ضروری ہے زندگی جیسی کہ ہماری دسترس میں ہے نہ اتنی جمیل ہے اور نہ ہی اتنی نازک، سو ایسے میں پروین کی دھنک رنگ شاعری کا آنچل اگر لہرا رہا ہے تو اِس دھنک کے لیے ہم اِس خوش گو شاعرہ کے دل سے کیوں ممنوں نہ ہوں اور حسن و محبت کے اِس صحیفے کو جو پروین نے ہمیں سوغات میں دیا ہے کیوں نہ پلکوں پہ رکھیں اور اب ہم اس سے کہنا چاہتے ہیں عزیزہ شاعرہ! تم غزل کی البیلی راجکماری ہو، محبت اور فطری ذہانت سے زبان کو تم نے خوب خوب سنوارا ہے اور اپنے موتی جیسے آبدار تخیل سے مصرعوں کے ہیرے تراشے ہیں''۔ یہ کتاب ہاتھ میں لے کر ہم سوچتے ہیں کہ جو معاشرہ تم جیسی حسن دل والی لڑکیوں کی راہ میں کانٹے بچھاتا رہتا ہے کیا اس پھول جیسی سوغات کا مستحق بھی تھا؟ تمہاری شب بیداریوں نے تمہاری کتاب کے ہر صفحے پر جو نگینے جڑے ہیں ان کے عوض ہم تمھیں کیا دے سکتے ہیں یہ نظمیں اور غزلیں جو دل میں اترتی ہیں جیسے تھکی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈی ہوا جاں بخش بوسے دے اور ہمیشہ جھکی رہنے والی نیند آنکھوں میں اتر آئے۔ ہماری داد اس کے بے پناہ حسن کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اور داد سے اس کا واسطہ بھی کیا یہ شاعری تو تمہارے وجود سے اس طرح ابھری ہے جیسے

کونپل آپ ہی آپ نمو کی قوت سے مجبور ہو کر پھوٹ نکلے۔[1]

یونانی شاعرہ سیفو جس طرح زندگی اور حسن سے محبت کرتی ہیں بالکل اُسی طرح پروین شاکر کے ہاں بھی زندگی کی رنگینیوں، رعنائیوں، فطرت کے موسموں اور رنگوں سے والہانہ عشق کا اظہار ملتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حسن سے دوستی اور پسندیدگی کا جزبہ ان کے خمیر میں گندھا ہوا ہے جو مختلف روپ دھار کر جلوہ گر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کی خوبصورت چیزیں اپنے حسنِ نظر کی بدولت انہیں بہت حسین معلوم ہوتی ہیں۔ یہی احساسِ جمال ان کی شاعری کو دلکش اور رنگِ تغزل کے حسن میں اضافے کا باعث بنتا ہے ''خوشبو'' کے دیباچے میں زندگی سے محبت کا خود اعتراف کرتی ہیں۔

> ''کچھ کم گوش یہ کہتے ہیں کہ اس لڑکی کی شاعری میں سوائے بارش کی ہنسی، پھولوں کی مسکراہٹ، چڑیوں کے گیتوں اور اپنی سرگوشیوں کے اور کچھ نہیں اگر زندگی سے محبت کرنا جرم ہے تو یہ لڑکی بڑے غرور کے ساتھ اِس جرم کا اعتراف کرتی ہے''۔[2]

محبت ایک ایسا لازوال موضوع ہے جسے ہمیشہ سے ہی اُردو شاعری میں پذیرائی حاصل ہوتی رہی ہے اِسی موضوع کے طفیل فنکاروں کی تخلیقی صلاحیتیں پروان چڑھتی اور نکھرتی بھی رہی ہیں۔ اسے مختلف روپ میں سجا سنوار کر پیش کیا جاتا رہا ہے، یہی موضوع پروین شاکر کی شاعری میں نرالی سج دھج کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ پروین نے محبت کے جذبے کی بھرپور منظر کشی کی ہے۔ اور اِسے تمام جزئیات کے ساتھ بیان کر دیا ہے آنکھوں کے رستے دل میں بسیرا کرنے، پیار کی کونپل کے تناور

---

[1] مضمون 'خوشبو ایک تاثر' مصنفہ، فہمیدہ ریاض بشمولہ 'خوشبو کی ہمسفر' مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش لفظ لوگ پبلی کیشنز اسلام آباد اپریل ۲۰۰۲ء

[2] 'دیباچہ خوشبو' مراد پبلکیشنز اسلام آباد ۱۹۹۴ء

درخت بننے سے لے کر محبوب کی بے وفائیوں، کج ادائیوں کے ادراک تک سب کچھ شامل ہے۔

پروین کے نزدیک 'محبت' ایک الوہی جزبے کا نام ہے جو اپنے اندر اتنی طاقت رکھتا ہے کہ ذرے کو آفتاب بنا دے، گونگے کو گویائی کا ہنر عطا کر دے، اور اندھے کو چشمِ بینا سے سرفراز کر دے۔

بلاشبہ پروین کی پہلی کتاب 'خوشبو' میں محبت کے پہلے پہل کے احساس کی دستک محسوس ہوتی ہے۔'خوشبو' میں شامل غزلیں ایک نوخیز لڑکی کے کومل جذبوں سے آراستہ ہیں، جو اُس جذباتی دور کی نمائندگی کرتی ہیں جب دل کے سونے کواڑ پر پہلی دستک سنائی دیتی ہے، من مندر کی پہلی گھنٹی کا احساس جاگتا ہے، کچی نیند میں سہانے سپنے جگنے لگتے ہیں، انجانے واہمے گھیرے رہتے ہیں، ہونٹوں پہ شرمیلی ہنسی و بے ساختہ مسکان بسیرا کرتی ہے، بے قراری و بے تابی کا احساس کروٹیں لیتا ہے غرض خوشبو ہجر و وصال کے قصے کہانیوں، گیت موسموں، رنگوں حکائتوں شکایتوں اور اِس قسم کے البیلے احساسات سے مزین ہے یہ نازک خیالات رنگین لفظوں کا پیراہن اوڑھ کر خوشبو میں منعکس ہوئے ہیں یہی جذبے اور احساسات پروین کی پہچان کا باعث بھی بنے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ پروین کی 'خوشبو' میں شامل شاعری اِس انوکھے سفر اور اچھوتے تجربے کی داستان معلوم ہوتی ہے جس سے ہر لڑکی گذرتی ہے۔ جب آنکھیں تو نیند سے بوجھل رہتی ہیں لیکن پلکوں کو خواب چھپانے نہیں آتے۔ ہر جذبہ سچا، ہر احساس پوتر لگتا ہے، بدلتی رتیں، گنگناتے پرندے، اوس میں بھیگی کلیاں، قوسِ قزح کی ست رنگی کمان، شفق کی لالی، چمکتی چاندنی احساسات پر چھائی رہتی ہے۔ یہی جذبے یہی رنگین احساس خوبصورت لفظوں میں پروین نے اپنی شاعری میں متعارف کرائے ہیں۔ اس سلسلے میں فہمیدہ ریاضؔ پروین کی شاعری کے جمالیاتی پہلو پر یوں اظہارِ خیال کرتی ہیں۔

''زندگی کے بے حس بنا رہنے والے روزمرہ سے چند لمحے بچا کر آپ کسی کنج عافیت میں سکون سے بیٹھے ہیں اور پھولوں پر منڈلاتی ٹھہرتی، پنکھ جوڑتی اور کھولتی تتلی کو غور سے دیکھا ہے؟ اس کے نرم و نازک سبک پروں پر پھیلتی ایک دوسرے میں گھلتی رنگوں کی لکیروں ک کانپتے دیکھا ہے؟ پروین شاکر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ''خوشبو' اِس ہولے سے تھرائے ہوئے تتلی کے پنکھ کا ہی دوسرا نام ہے''۔[۱]

بنیادی طور پر پروین شاکر گہرے جمالیاتی شعور کی مالک ہیں۔ اُن کے جمالیاتی شعور میں رچاؤ اور بالیدگی ہے احساسِ جمال کے رنگوں میں ڈوبا ہوا، پروین کے کہنے کا ایک نرالا انداز اُن کی شاعری میں دلکشی اور رنگِ تغزل میں ایک انوکھے حسن کا اضافہ کر دیتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ے اتر رہی ہیں عجب خوشبوئیں رگ وپے میں
یہ کس کو چھو کے میرے شہر میں صبا آئی

ے خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ رستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اُس کا سراغ ہے

ے ہوا میرے جوڑے میں پھول سجاتی جا
دیکھ رہی ہوں اپنے من موہن کی راہ

ے میں پھول چنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ شخص آ کے، مرے شہر سے چلا بھی گیا

'خوشبو'

۱؎ مضمون ''نئی خوشبو'' مصنف سردار جعفری ص: ۲۵ خوشبو کی ہمسفر ترتیب وتدوین ڈاکٹر سلطانہ بخش ۲۰۰۲ء

پروین کی شاعری کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب تک اُردو غزل سادگی، معصومیت سے بھرے پاکیزہ کنوارے، رو پہلے جذبوں اور خوابوں کو گویائی کا ہنر عطا کرنے کے لیے کسی کی راہ تک رہی تھی جنھیں پروین شاکر کی زبان مل گئی۔ پروین نے ایک نوعمر لڑکی کی سوچوں، کیفیتوں، اور تجربوں کو اپنے رگ و پے میں اتار کر اِس طرح سے شعری قالب میں ڈھال دیا کہ جذبے نکھر اور سنور گئے ایسے احساسات اور کیفیات جو نوعمر لڑکیوں کے دل کے نہاں خانوں میں جنم لیتے ہیں اور اقرار و اظہار سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں جنھیں وہ کسی سے کہہ نہیں پاتیں بس اندر ہی اندر چھپائے رکھتی ہیں اکھیوں کے جھروکوں سے ممنوعہ خوابوں کے ذائقے چکھتی رہتی ہیں۔ درد کی ٹیس، سلگنے والی کیفیت کا اظہار خوشبو کی شاعری میں ملتا ہے ملاحظہ کیجیے چند اشعار

؎ وہ بدن کا پہلے پہل آگ چکھنا
رگ و پے میں کوئی لذت عجیب تھی

کانپ اٹھتی ہوں، یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی

؎ بار ہا تیرا انتظار کیا
اپنے خوابوں میں اک دلہن کی طرح

؎ ماں سے کیا کہیں گی دکھ ہجر کا کہ خود پر بھی
اتنی چھوٹی عمر کی بچیاں نہیں کھلتیں

؎ کاش صندل سے مری مانگ اجالے آکر
اتنے غیروں میں وہی ہاتھ، جو اپنا دیکھوں

تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات!
جانے کیوں ترے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں

وہ سوتے جاگتے رہنے کے موسموں کا فسوں
کہ نیند میں ہوں مگر نیند بھی نہ آئی ہو!

'خوشبو'

فطری بے ساختگی میں شاعری کا حسن پوشیدہ ہے۔ پروین کے یہاں بھی فطری بے ساختگی کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اپنے مشاہدات وتجربات کو غزل کے پیکر میں ڈھالتے وقت اُن کا لب ولہجہ بے ساختگی کی طرف مائل رہتا ہے جس سے قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک سچے انسان سے محوِ گفتگو ہے جو ایک ایسی لامتناہی دنیا کی سیر کروار ہا ہے جو اس کے اپنے تجربے ومشاہدات پر مبنی ہے۔ پروین عشق ومحبت کے مختلف مراحل اور کیفیات کی عکاسی اس طرح سے کرتی ہیں کہ جیسے وہ خود اِس تجربے میں شریک رہی ہوں عشق ومحبت اور اِس سے وابستہ تمام معاملات ان کی غزلوں میں بھرپور رعنائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ غمِ فراق کی آگ میں جھلنے کی کیفیت ہے، اور نشاطِ وصل کی سرشاری کا بیان بھی درد، آہیں، آنسو، نیندیں، رت جگے، سراب عذاب کے ساتھ ساتھ لذتِ لمس وخودسپردگی کا نشہ بھی، تہذیب وشائستگی کے دائرے میں موضوعِ سخن بنے ہیں۔ اِس سلسلے میں یوسف رجا چشتی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

''پروین نے اپنی شاعری میں توازن برقرار رکھا جنس اور لمس رومان کے سطحی مضمون میں آتے ہیں۔ لیکن پروین نے رومان کی فضا میں لمس کو بیان کیا تو وہ خوشبو کی صورت سے آئی یہ خوشبو پھولوں کی نہ تھی بلکہ انسانی محسوسات کی خوشبو تھی پروین

شاکر کی شاعری نے خوبصورت سچائیوں کے ساتھ بہ یک وقت نوجوانوں اور بزرگوں کو یکساں متاثر کیا وہ لمس، محبت، اور عقیدے کی بات کرتے ہوئے متوازن نظر آتی ہے اور جسم کی ترجمانی کے ساتھ روح کی پاکیزگی کو بھی خوبصورتی سے برقرار رکھا''۔[1]

پروین کی غزلوں میں عشقِ حقیقی کی برعکس عشقِ مجازی کا بیان ہے۔اُن کے ہاں جس محبوب کا پیکر ابھرتا ہے وہ وہم وگمان سے ماورا نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا گوشت پوست کا انسان ہے اور وہ خود ایک مکمل عورت کی نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جس کے دل میں اپنے محبوب کے لیے والہانہ محبت وعقیدت ہے وہ ایثار وفا کی دیوی ہے ایک طرف خودسپردگی و نیازمندی کے احساس سے لبریز ہے تو دوسری طرف وہ رقابت کا جذبہ بھی رکھتی ہے۔جس سے محبت کرتی ہے اُسے صرف اپنا دیکھنا چاہتی ہے۔اُس کا 'ہرجائی پن' دیکھ کر بے قرار ہو جاتی ہے اپنے سچ کے آگے اُس کا جھوٹ دیکھ کر لاجواب ہو جاتی ہے۔عشق کے رستے کے سارے عذاب اپنے نام اور ثواب اُس کا نام رقم کرنا چاہتی ہے اپنا تن من اُسی پر نچھاور کرنے کو تیار رہتی ہے۔اُس کی چاہت کے بھیگے جنگلوں میں موربن کرنا چنے کی خواہش بھی رکھتی ہے۔اُس کی بے وفائی کو مصلحت کے پردے میں چھپاتی ہے۔تاکہ مرد کے نام کا سائباں اُسے زمانے کی کڑی دھوپ سے بچاتا رہے۔مرد کی بے رخی سے اُس کے ذہن و دل میں کشمکش جاری رہتی ہے۔وہ نم آنکھوں سے اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں کو کھوجتی ہے اور اپنی تقدیر سے شکوہ کناں ہوتی ہے۔خودسپردگی، قربت وآرزومندی حکائتیں شکائتیں ہجر و وصال کے رنگوں سے مزین

---

[1] پروین شاکر سیمپوزیم مقالہ یوسف راجا چشتی خوشبو پھول تحریر کرتی ہے ص: ۳۰۵۔ترتیب وتدوین ڈاکٹر سلطانہ بخش لفظ لوگ پبلکیشنز اسلام آباد ۲۰۰۶ء

خیالات کی رنگا رنگی ملاحظہ فرمائیں۔

ے یہ کیا کہ میں تیری خوشبو کا صرف ذکر سنوں
تو عکس موجۂ گل ہے تو جسم و جاں میں اتر
پیراہن میرا مگر اُس کے بدن کی خوشبو
اُس کی ترتیب ہے ایک ایک شکن کی خوشبو

ے نیم تاریک تنہائی میں سرخ پھولوں کا بن کھل اٹھا
ہجر کی زرد دیوار پر تیری تصویر کیا لگ گئی

ے پھول کی طرح مرے جسم کا ہر لب کھل جائے
پنکھڑی پنکھڑی اُن ہونٹوں کا سایا دیکھوں
رگ و پے میں تیرا لمس اترتا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو دے انتہائی دے 'خوشبو'

پروین کی غزلیہ شاعری میں خوشبو سے کف آئینہ، تک محبوب سے جدائی کے غم کا اظہار بہت شدت سے پایا جاتا ہے جسے انھوں نے کئی رنگ عطا کئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی قیمتی چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو کارزارِ حیات کے گھمسان میں کہیں کھو چکی ہے جس کا ملنا محال ہے۔ اس کا سبب اُن کی ذاتی زندگی کا المیہ بھی ہے شوہر سے علیحدگی کے بعد وہ اُسے محبوب کی شکل میں ہمیشہ یاد کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جسے باوجود کوشش کہ وہ بھلا نہ سکیں۔ اُس کے لیے وہ نیک تمناؤں اور دعاؤں کے نذرانے بھیجتی ہیں۔ اُس کے خیالوں کے حصّار میں رہنا رہنا پسند کرتی ہیں۔ اُن کا دل اُس کی شادابی وخوشحالی کے جذبات سے لبریز رہتا ہے مثلاً اپنے ہاتھوں سے اُس کی دلہن سجانا، اُسے

چاندنی کے سپرد کرکے خود گھر کے اندھیروں میں لاٹ آنا۔رشتہ بے نام کا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا مگر پھر بھی اُس کے اشاروں پہ سر جھکانا، واقعی پروین کے کمالِ ضبط کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔اُن کا یہ کردار ہندی شاعری کی عورت سے بہت حد تک ملتا جلتا نظر آتا ہے جو اپنے گیتوں میں مرد کو مخاطب کر کے تن اور من کے روگ اس کے گوش گزار کرتی ہے اور محبوب کے در پر سر جھکانے کو ہی زندگی کی معراج سمجھ لیتی ہے۔کسی کے سامنے اپنا آپ منفی کر دینا اُس کی رضا میں شامل ہو جانا ایک مشکل کام ہے اُن کے یہاں محبت ایک دوسرے کی خواہشات کے ادراک اور احترام کا نام ہے۔

ے تیرا پہلو ترے دل کی طرح، آباد رہے
تجھ پہ گذرے نہ قیامت شب تنہائی کی
کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دلہن سجاؤں گی
ے سکونِ دل کے لیے میں کہاں کہاں نہ گئی
مگر یہ دل کہ،سدا اس کی انجمن میں رہا
کہیں رہے وہ مگر خیریت کے ساتھ رہے
اُٹھائے ہاتھ تو یاد ایک ہی دعا آئی 'خوشبو'

اُردو غزل کی یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ ہجر یا جدائی کا سبب محبوب کو گردانا جاتا ہے۔پروین شاکر کا یہ منفرد انداز ہے کہ انھوں نے 'ترک رِفاقت' کا الزام اپنے سر لے لیا ہے۔

ے کچھ تو تھی میری خطا ورنہ وہ کیوں
اِس طرح ترک رفاقت کرتا

؎ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے
اُس کا قصور سارا کب تھا

غزل گو شعراء کے یہاں ہجر کی طویل رات کا کرب، عاشق کی بے بسی و بے قراری اضطراب، تارے گننے کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ پروین کے یہاں اب یہی احساسات ایک عورت کے حصے میں آئے ہیں۔

؎نیند تو خواب ہے اور ہجر کی شب خواب کہاں
اِس اماوس کی گھنی رات میں مہتاب کہاں

؎پورا دکھ اور آدھا چاند
ہجر کی شب اور ایسا چاند

اِسی مضمون سے متعلق مؤمن کا ایک زبردست شعر ہے

؎تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
کل تو ہم خوابِ عدم میں، شب ہجراں ہوں گے

ٹھہر کے دیکھے تو رک جائے نبض ساعت کی
شب فراق کی قامت ہے کس قیامت کی

اور غالب 'ہجر کی رات' کا سنگھار کچھ اس منفرد انداز سے کرتے ہیں

؎جوئے خوں آنکھوں سے بہہ لینے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

پروین کی غزلیہ شاعری میں نازک احساسات کی مالک لڑکی کا کردار جیتا جاگتا نظر آتا ہے جو

دل کی تمام تر چاہتوں اور شدتوں سے اپنے محبوب کی پرستش کرتی ہے لیکن ذراسی ٹھیس سے نازک آبگینوں کی مانند ٹوٹ جاتی ہے چاند کو اپنی ہجر کی راتوں کا گواہ بناتی ہے اور روتے روتے دوپٹے بھگو ڈالتی ہے۔

؎ کیا دکھ تھا کون جان سکے گا نگارِ شب
جو میرے اور تیرے دوپٹے بھگو گئے

؎ بس یہ ہوا کہ اُس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لئے

غرض یہ کہ 'خوشبو' ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو ساحل پر ریت سے ننھے ننھے گھروندے بناتے ہوئے سندر سپنے سجانے کی شروعات کرتی ہے۔ انجام سے بے خبر رنگوں، خوشبوؤں، ساون رتوں میں زمردی خواب بنتی رہتی ہے اور اِک دن سمندر کی سرکش لہریں اُس کے خوابوں کا نازک سا گھروندا بہالے جاتی ہیں۔ جس کی یاد میں اس کی پلکیں ہمیشہ نمناک رہتی ہیں۔

'صد برگ' میں سفر کچھ آگے بڑھتا ہے۔ اس میں 'خوشبو' والی لڑکی حصارِ رنگ و بو سے حقیقت کی سنگلاخ دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ زندگی کی تلخیاں اُسے سمجھا دیتی ہیں کہ زندگی صرف خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولنے کا نام نہیں۔ زندگی بارش کی رِم جھم، گُلِ انار کی گلابی چھاؤں اور عنابی شاموں کے فسانوں سے بڑھ کر بھی کچھ ہے یعنی زندگی پیچیدہ اور کڑی حقیقتوں کو سہنے کا نام ہے۔

'صد برگ' کی شاعرہ کے سامنے زندگی کے اچھے اور بُرے پہلو سامنے آجاتے ہیں اُس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چار سکے۔ وہ حالات کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتی بلکہ اعتماد، حوصلے اور جرأت فکر سے حالات سے دوبدو ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

''صد برگ کے دیباچے رزقِ ہوا میں لکھتی ہیں۔

''ہر انکار پر میرے جسم میں ایک میخ کا اور اضافہ ہو گیا مگر میخیں ٹھونکنے والوں نے میری آنکھوں سے کوئی تعرض نہ کیا۔ شائد وہ جانتے تھے کہ انھیں بجھانے سے میرے اندر کی روشنی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا یا پھر اپنی سفا کیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ ایک گونگے گواہ کے طالب تھے، اور میں حیران ہوں کہ اس گواہی سے میری آنکھیں اب تک پتھرائی کیوں نہیں''![1]

''صد برگ'' میں ایک لڑکی سے زیادہ ایک عورت کا پختہ، رچا ہوا لہجہ سنائی دیتا ہے جو 'خوشبو' سے مختلف ہے، اگرچہ کسی حد تک ایک زیریں لہر کی طرح خوشبو والا تاثر کفِ آئینہ تک جھلکتا دکھائی دیتا ہے ''صد برگ'' زندگی کے دشتِ بے پناہ کے رستے کی کٹھنائیوں سے نبرد آزما ہونے والی عورت کی آواز ہے۔ وقت و حالات کی ستم ظریفیاں اُس کے زاویہ نگاہ میں بھی تبدیلی پیدا کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ زندگی کو خوابوں کی چلمن سے دیکھنے کے بجائے ایک چیلنج کے طور پر قبول کرتی ہے۔

ے شب وہی لیکن ستارہ اور ہے
اب سفر کا استعارہ اور ہے

ے سکھ کے موسم انگلیوں پہ گن لئے
فصلِ غم کا گوشوارہ اور ہے

ے کیسی گھڑی میں ترکِ سفر کا خیال ہے
جب ہم میں لوٹ آنے کا یارا نہیں رہا

---

[1] ''دیباچہ ''صد برگ''، مراد پبلیکیشنز اسلام آباد

خوشبو کے مقابلے میں ''صد برگ'' میں جذبات واحساسات کا وفور اور وارفتگی کچھ کم ہے۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شاعرہ کی اپنی زندگی ایک نیا رُخ اختیار کر چکی ہوتی ہے۔ دوسری طرف وطن کی سرزمین بھی مارشل لاء کے تسلط میں آ چکی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ گھٹن اور جبر محسوس کرتی ہیں۔ اپنے دل کا درد علامتوں کے ذریعے اپنی شاعری میں انڈیل دیتی ہیں۔ 'صد برگ' کے لب و لہجے اور موضوعات کا پس منظر بتاتے ہوئے کہتی ہیں کہ۔

''صد برگ، تک آتے آتے منظر نامہ بدل چکا تھا میری زندگی کا بھی اور اُس سرزمین کا بھی جس کے ہونے سے میرا ہونا ہے۔ رزم گاہِ جاں میں ہم نے کئی معرکے ایک ساتھ ہارے اور بہت سے خوابوں پر اکٹھے مٹی برابر کی۔ شامِ غریباں کی پینٹنگ کیسی بنے گی؟ کوفہ شہر کے منارے سبز تو نہیں ہو سکتے نا'' [1]

زندگی کی کڑواہٹوں، تلخ تجربوں اور سفاکیوں کے بیان میں زبان کی دلکشی متاثر نہیں ہوئی بلکہ لفظوں کی نرماہٹ تھوڑی سی سختی میں تبدیل ہوئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن کے لب و لہجے اور فن میں ایک طرح کا نکھار پیدا ہوا ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک ارتقائی صورتحال کا احساس جاگزیں ہے وہ 'خوشبو' کے سفر سے لے کر اپنے آخری مجموعے 'کفِ آئینہ' میں اپنے فکر و فن کے مختلف مدارج زینہ بہ زینہ طے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اکثر شعراء شروع سے آخر تک اپنے ابتدائی دور میں پیش آنے والے موضوعات و تجربات کی گتھیاں سلجھاتے رہتے ہیں۔ اُن کی سوچ ایک ہی دائرے میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اِس طرح اُن کے ہاں ایک یک رنگی اور اکتاہٹ پائی جاتی ہے۔ لیکن پروینؔ کے یہاں ''خوشبو'' کے بعد تجربات و مشاہدات اور موضوعات

---

[1] دیباچہ ''صد برگ''، پروین شاکر مراد پبلیکیشنز اسلام آباد جون ۱۹۹۰ اسلام آباد

کے اعتبار سے ندرت اور وسعت پائی جاتی ہے۔ اگر چہ ''خوشبو'' کی شاعری سے ہی اِس کے آثار نظر آتے ہیں۔ سوچ اور فکر کی تبدیلی کے ساتھ لفظیات میں بھی نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے جو اُن کی فنکارانہ عظمت کی دلیل ہے 'خوشبو' میں تبدیلی، دھنک، پھول، ہوا جیسے استعارے استعمال ہوئے ہیں جبکہ 'صد برگ' 'خود کلامی' اور 'انکار' میں کڑے حالات کی بھٹی میں جھلسنے کے بعد ان کے یہاں لفظیات بھی تبدیل ہوئی ہیں۔ جن سے اظہار کی شدت اور تلخ نوائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

جرم، سزا، منصف، فردِ جرم، تیر، تعزیر، لہو، قاضی، مقتل، صلیب، سانپ، زہر رنگ، بھیڑیا، بھنور، پھن وغیرہ جیسے استعارے معنویت کی گہرائی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں جو زندگی کی سنگین حقیقتوں ملک کے سیاسی منظر نامے، اور ناگفتہ بہ حالات کے اظہار کے لیے مناسبت رکھتے ہیں۔ سیاسی و معاشرتی ظلم و چیرہ دستیاں تیکھے اور کاٹ دار انداز میں اظہار پا گئی ہیں۔ چند مثالیں

؎ بس اے بہار کے سورج بڑھا یہ قہر کا رنگ
جلا گئی ہے تری دھوپ مرے شہر کا رنگ

؎ کنارے جوئے رواں جب سے قتل گاہ بنی
ہجوم اُمڈنے لگا دیکھنے کو نہر کا رنگ

؎ پا بہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بدستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون

وہ اپنے وطن کے اُس سیاسی و معاشی و معاشرتی نظام کی شاکی ہیں جہاں بہار شہر کے رنگ کو جھلسا دے جہاں سچ کا علم بلند کرنے والوں کو پابند سلاسل کیا جائے اور انصاف کا خون ہو، لوگ اتنے بے حس ہو جائیں کہ وہ اپنوں کے بہتے ہوئے لہو کا نظارہ مزے لے کر دیکھتے ہوئے دل بہلاتے رہیں۔

کسی بھی معاشرے میں عدالتیں حق و باطل کے میزان کی علامت سمجھی جاتی ہیں جو مظلوموں کی دادرسی، غریبوں کو انصاف کی فراہمی اور ان کے حقوق کی بازیابی میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ لیکن آج کے دور میں انصاف کا حصول کارِ دراز والا معاملہ ہے آئے دن یہاں انصاف کا خون ہوتا رہتا ہے اور ہم چپ سادھے تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔ شاعرہ کو یہ احساس ہے کہ اِس اقدار کے آشوب میں مبتلا معاشرے کے یہ قانونی ادارے حق و انصاف کے نام پر ایک مذاق ہیں۔ خاص طور پر صنفِ نازک کے لئے اِن عدالتوں کے ذریعے انصاف کا حصول کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ جس معاشرے کی بنیادوں میں جھوٹ اور منافقت رچ بس گیا ہو، وہاں خلقِ خدا کا سچ کے ''آئینہ ساز'' کو قابلِ گردن زنی ٹھہرانا یقینی ہے۔ پروین اپنے تجربے کی وسعت وصداقت کے بل بوتے پر جھوٹ، منافقت، ریاکاری کے مقابلے میں حق وصداقت کا علم بلند کئے رہتی ہیں۔ 'صد برگ' اور ''خودکلامی'' سے چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

ے سچ جہاں پابستہ، ملزم کے کٹہرے میں ملے
اُس عدالت میں سنے گا عدل کی تفسیر کون

ے کس بستی میں ہوگی سچ کی حرمت
ہمارے شہر میں باطل بڑا ہے

ے میری پھٹی ہوئی ردا دے بھی گئی بیان مگر
فیصلہ رک گیا ہے ایک اور گواہ کے لئے

ے جھوٹ کے شہر میں آئینہ کیا لگا، سنگ اُٹھائے ہوئے
آئینہ ساز کی کھوج میں جیسے خلقِ خدا لگ گئی

وہ اپنی غزلوں میں کافی باریک بین نظر آتی ہیں۔حقیقتوں کی آگہی نے بے شک ان کے قلم میں تلخی بھر دی ہو لیکن یہ تلخی اُن کے مزاج میں دل موہ لینے والی مٹھاس اور والہانہ پن کو متاثر نہیں کر سکی۔اگرچہ بے رحم حالات کے تازیانے نارسائی کے عذاب اُن کے مقدر میں لکھ دیتے ہیں۔جو کہیں نہ کہیں اُن کے ہاں اُن کے شعروں میں بولتے نظر آتے ہیں دکھ اور شکستگی کا احساس دلاتے ہیں۔

ے لوگ نہ جانے کن راتوں کی مرادیں مانگا کرتے ہیں
اپنی رات تو وہ جو تیرے سات گزار گئی جاناں

ے بجھ گئی آنکھ تو پیراہن تر کیا لائے
چاہ سے اب مرے یوسف کی خبر کیا لائے

ے شب گذارو! وہ ستارہ تو مرا ڈوب گیا
اب دمِ صبح دعاؤں میں اکثر کیا لائے

وہ زمانے کے غم کو اپنا غم بنا کر پیش کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔اُن کی شاعری کی خاص بات وہ سچائی اور حقیقت ہے جسے انھوں نے بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے اپنے شعروں میں بیان کر دیا ہے۔ اِس میں درد و کسک بھی ہے اور ایثار و وفا کے کئی رنگ ہیں ایسا لہجہ جو محبتوں اور چاہتوں کی شدت سے بھرپور ہے۔

ے عجیب خواب تھا آنکھیں ہی لے گیا مری
کرن کا عکس اب بھی مری دسترس میں نہیں

ے قدموں میں تکان تھی گھر بھی قریب تھا
پر کیا کریں کہ اب کہ سفر بھی عجیب تھا

ے اِک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے

زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

پروین شاکر کی شاعری میں بیسویں صدی میں سانس لینے والی عورت کا پیکرا بھرتا ہے وہ یہ جانتی ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے بلکہ اُسے خدا نے تخلیقی جوہر سے آراستہ کرکے مرد سے بھی برتر مقام پر فائز کیا ہے لیکن اُس کی تمام تر ذہانتوں اور لیاقتوں کے باوجود اُس کی سوچیں، خیالات اُس مرد کے تابع ہوتے ہیں جسے اُس کی تقدیر کا مالک بنادیا جاتا ہے جب تک وہ اُس کے ہر جھوٹ سچ کے آگے اُس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہے تب تک تو سب ٹھیک ہوتا ہے تضاد اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب عورت اپنے وجود کا اثبات چاہتی ہے۔ مرد اپنی جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر اُسے نیچا دکھانا چاہتا ہے وہ ہر طرح سے اُسے زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مرد اساس معاشرے میں عورت کے استحصال اور مرد کی منافقت کی کہانیاں پروین کی غزل کا موضوع ہیں۔

؎ اندھیرے میں تھے جب تلک زمانہ ساز گار تھا
چراغ کیا جلا دیا ہوا ہی اور ہوگی

؎ اب تو اس کے چہرے میں بے پناہ چہرے ہیں
کیا عجیب نعمت تھی ورنہ بے خبر ہونا

؎ اِس ترکِ رفاقت پہ پریشاں تو ہوں لیکن
اب تک کہ تیرے ساتھ پہ حیرت بھی بہت ہے

؎ اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشاں ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

پروین کی غزل اُس جدید عورت کی ترجمان ہے جو ذہن وفکر شعور واحساس کی دولت سے

بہرہ ور ہے۔ جو اپنی زندگی کی الجھی راہوں کو اپنے فکر کی تابنا کی سے سلجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ عورت کو درپیش بے رحم حقیقتوں اور سفا کیوں کے پردے چاک کرتی ہے۔

ے جلا دیا شجر جاں کہ سبز بخت نہ تھا
کسی بھی رُت میں ہرا ہو، یہ وہ درخت نہ تھا

ے ذرا سے جبر سے میں بھی تو ٹوٹ سکتی تھی
مری طرح سے طبیعت کا وہ بھی سخت نہ تھا

ے بدن میں پھیل گیا سرخ بیل کی مانند
وہ زخم سوکھتا کیا، جس کا چارہ گر ہی نہ تھا

ے میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

ے رفاقتوں کا مری، اُس کو دھیان کتنا تھا
زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا

پروین واقعات کو اُن کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی اہلیت رکھتی ہیں اُن کی غزل نِت نئے تجربوں کی حامل ہے جدید دور کی زندگی اُس سے وابستہ مسائل اور المیے اپنی تمام جزئیات کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ایسے مسائل اور المیے جو انسان کی پرسکون دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتے ہیں جن سے انسان لامتناہی دکھوں میں بٹ جاتا ہے۔ یہ تجربے اور مشاہدے آفاقی حیثیت رکھتے ہیں۔ آفاقیت کے عنصر کے بغیر کوئی بھی شاعر اونچی اڑان نہیں اڑ سکتا۔ پروین کے یہاں جو تجربے ہوئے ہیں اُن کی معنویت ہر دور کے لیے مسلم ہے۔ پروین کی شاعری کی انقلابی اور آفاقی روح اُن کے

جذبہ انسانیت کی گواہی دیتی ہے۔ وہ ایسے افراد کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں جو اپنے گھناونے افعال و اعمال سے معاشرے کے لیے ناسور ثابت ہوتے ہیں جو لوگوں کے لبوں کی مسکراہٹ چھین کر آنسوؤں، آہوں، اور سسکیوں کے تحفے دیتے رہتے ہیں یہ بے شناخت و بے چہرہ لوگ اپنی ذاتی مفاد کے لیے معاشرتی نظام کو درہم برہم کر کے دکھ دیتے ہیں۔

پھر رہے ہیں مرے اطراف میں بے چہرہ وجود
اِن کا کیا نام ہے، یہ لوگ ہیں کِن ذاتوں کے
پورے انسانوں میں گھس آئے ہیں
سر کٹے، جسم کٹے ذات کٹے

آج دنیا کا منظر نامہ بدل گیا ہے۔ آج کا انسان معاشی و معاشرتی نظام کے درہم برہم ہو جانے سے نئے نئے مصائب، الجھنوں اور محرومیوں کا شکار ہے وہ تلخیوں بھری زندگی گذارنے پر مجبور رہے ہر طرف سے ذہنی دباؤ، گھٹن، نا آسودگی جیسے احساسات میں گھرا ہوا ہے۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ ہے لیکن اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے وقت و حالات کی سنگینی و سرد مہری نے اُس کے احساسات کو کچل کر رکھ دیا ہے وہ ایک روبوٹ کی طرح مشینی زندگی گزار رہا ہے۔ جسے پروین ''حنوط شدہ لاشوں سے تشبیہ دیتی ہیں۔

اہرام ہے کہ شہر مرا
انسان ہیں یا حنوط لاشیں
سڑکوں پہ رواں، یہ آدمی ہیں
یا نیند میں چل رہی ہیں لاشیں

پروین شاکر کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہ صرف ایک عورت بن کر بلکہ انسان بن کر سوچتی ہیں نسائی احساسات و مسائل کے ساتھ انسانیت کو درپیش مسئلوں اور المیوں کی طرف توجہ دلاتی ہیں اُن کے ہاں ایک فرد کی تصویریں اُس کے خوابوں اور عذابوں سمیت نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے غم سے نکل کر کائنات کے دکھوں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ دورِ جدید میں سائنسی و صنعتی ترقی اور نت نئی ایجادات کی بدولت دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے انسانی زندگی میں تیز رفتار تبدیلیوں، نئے خیالات کی پرورش، مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید نے پرانے تہذیبی تصورات کو رد کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اعلیٰ قدریں ماند پڑتی جا رہی ہیں۔ اِس نئی تہذیب نے انسان کو داخلی کرب و انتشار اور بے چینی سے ہمکنار کیا ہے لاقانونیت، لوٹ کھسوٹ، خود غرضی، اقربا پروری، سیاسی عدم استحکام، تشدد، دہشت گردی اور بہت سے خوف ہمارا مقدر بنتے جا رہے ہیں۔ دنیا جتنی اب بدصورت ہے پہلے کبھی نہیں تھی آج کے انسان کا باطن ہمہ وقت ناموافق حالات کے زلزلوں کی زد میں ہے جو اُس کے قلب و ذہن کو جھنجھوڑ کر صدموں سے دوچار کرتے رہتے ہیں لیکن ظاہری طور پر دوسرا فرد اِس درد کو محسوس نہیں کر پاتا یا اتنا بے حس ہو چکا ہے کہ محسوس کرنا ہی نہیں چاہتا۔ پروین آج کے فرد کی باطنی کیفیتوں کو گہرا ادراک رکھتی ہیں۔ سانپ، جنگل، بھنور، سمندر کے استعاروں میں سمو کر آج کے انسان کو درپیش آشوب کا ذکر کرتی ہیں تو اُن کی غزلیں ''آشوبِ آگہی'' کی مؤثر پیکر تراشی کا نمونہ بن جاتی ہیں۔

ے موجوں کے ساتھ سانپ بھی پھنکارنے لگے
جنگل کی دہشتیں بھی سمندر سے مل گئیں

ے قدم تو ریت پہ ساحل نے بھی نہ رکھنے دیا
بدن کو جکڑے ہوئے صرف اِک بھنور ہی نہ تھا

ے بس رقص پانیوں کا تھا وحشت کے راگ پر

دریا کو سب دھنیں تو ہواؤں نے لکھ کے دیں

ے فشار جاں کے بہت ہیں اگر نظر آئیں
ہر ایک زلزلہ زیرِ زمین نہیں آتا

ے بستی میں اتر رہا ہے پانی
ہم اور کہاں اتر کے جائیں

ے پانی ہے، ہوا ہے یا خلا ہے
ہم اپنے قدم کہاں جمائیں

مخالف حالات کی شدت انسانی وجود کو زمین پر قدم رکھنے سے روک رہی ہے۔آج کے دور کا انسان محسوس کر رہا ہے کہ زمین اُس کے قدموں سے کھسکتی جا رہی ہے۔انسان اِسی کوشش میں ہے کسی طرح سے زمین پر مضبوطی سے قدم جما کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے مگر اِس پر آشوب دور میں ایسا کرنا ناممکن نظر آتا ہے ہوا غبارِ وجود‘‘ کو پل میں اڑا دیتی ہے کسی کے پائے سفر میں استقامت نہیں ہے اس مضمون کو حامدی کشمیری صاحب نے اِس طرح بیان کیا ہے۔

ے ہوا اڑاتی ہے پل میں یہاں غبارِ وجود
کسی کے پائے سفر میں ثبات ہو تو چلیں حامدی کشمیریؔ

ے ایک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا پروین شاکرؔ

ے سانس اکھڑ جاتا ہے اب وقت کی ہم گامی میں
جی میں آتا ہے کہ ہم پاؤں کو پہیہ کرلیں پروین شاکرؔ

پروین شاکر کا شعری کینوس بہت وسیع ہے۔اس میں ہر طرح کے پھول کھلے ہیں جو اپنی خوشبو اور رنگ کے لحاظ سے الگ اور منفرد ہیں۔ جہاں ایک طرف لطیف جذبوں کی بات کرتی ہیں تو دوسری طرف بڑے بڑے مسائل سے بھی آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں ایسے مسائل جن سے انسانی زندگی براہِ راست متاثر ہوتی ہے۔جس طرح کہ ادب کا اہم موضوع 'ہجرت' رہا ہے۔جدید اُردو غزل میں کثرت سے اِس پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے ابتدائے آفرینش سے ہی انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر ہجرت کرتے رہے ہیں۔بہشت سے نکالے جانے کے بعد سے اب تک انسان مسلسل سفرو ہجرت میں ہے۔وجہ اِس کی خواہ کچھ بھی ہو ہجرت بہت ہی کربناک عمل ہوتا ہے، اپنوں سے بچھڑنے کا غم ، اپنی زمین کے پرایا ہونے کا غم ، انسان کو اندر ہی اندر کریدتا رہتا ہے۔اپنی مٹی اور اِس مٹی سے وابستہ یادوں کو چھوڑ کر پرائی جگہ نیا تعلق استوار کرنا ، ماضی کی یادوں کو پلکوں کے دریچوں میں سنبھال رکھنا۔اپنے دیس کی صبحوں اور شاموں کو یاد کرتے رہنا۔تصور ہی میں اپنی مٹی کی بو باس محسوس کرتے رہنا اِس طرح ایک کسک کا احساس جاگتا رہتا ہے۔اپنی مٹی سے محبت انسان کی جڑوں میں رچی بسی ہوئی ہوتی ہے وہ کہیں بھی جائے اپنی مٹی کی یاد اُسے بے چین و بے قرار رکھتی ہے۔اُردو شعراء نے اِس موضوع کو متنوع زادیوں سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔جس طرح کہ وزیر آغا نے کہا ہے کہ

ایک عجب تجربہ ہے اپنے پرانے گھر میں
مدتوں بعد کسی شخص کا جاکر رہنا

جبکہ پروین شاکر اِس کرب کو اِن الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

ہجرت کا اعتبار کہاں ہوسکے کہ جب
چھوڑی ہوگی جگہ کی نشانی بھی ساتھ ہے

ے سارے رشتے ہجرتوں میں ساتھ دیتے ہیں تو پھر
شہر سے جاتے ہوئے ہوتا ہے دامن گیر کون

پروین شاکر

جبکہ مظہر امام اس موضوع پر یوں حسرت بھرے انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

ے اپنا ہی فیصلہ تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے
مڑ مڑ کر پھر کیوں درودیوار کو دیکھنا

مظہر امام

پروین شاکر کی غزل کے کئی اشعار انسان کے اُس ازلی سفر کی داستان سناتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو آج بھی جاری ہے۔جنگل سے شہروں کی طرف رخ کرنا پھر شہروں کو چھوڑ کر نئے نئے جہانوں کی دریافت اور دشت نوردی ابنِ آدم کا مقدر ٹھہری ہے یہ الگ بات ہے کہ پہلے سے اب اِس نوعیت بہت مختلف ہے پروین شاکر جدید عہد کے منظر نامے میں اِس سفر کا مشاہدہ کرتی ہیں۔سفر کا استعارہ بار ہا استعمال ہوا ہے جو ان کی زندگی کی داخلی کائنات سے ہم آہنگ ہے۔

ے آسیب کون سا ہے، تعاقب میں شہر کے
گھر بن رہے ہیں، نقلِ مکانی بھی ساتھ ہے

گھر جو ایک انسان کے لیے گوشۂ عافیت ہوتا ہے، انسانی رشتوں کی پاکیزگی ذہنی و جذباتی سکون کی علامت سمجھا جاتا ہے۔شاعرہ کے نزدیک گھر تو بن رہے ہیں، لیکن شہر کے تعاقب میں کوئی ایسا آسیب ہے جس کی وجہ سے شہر کے لوگ نقلِ مکانی پر مجبور ہو رہے ہیں تعاقب میں شہر کے کہہ کر شاعرہ پوری انسانیت سے ہم رشتہ ہو جاتی ہیں۔شہر کے سب لوگ انہیں نقلِ مکانی کرتے ہوئے

دکھائی دیتے ہیں اور یہ بات انسانیت دوست شاعرہ کو داخلی کرب سے ہمکنار کرتی ہے۔ جدید دور کا انسان ان دیکھے آسیب سے خوف زدہ ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک شہر سے دوسرے شہر بھاگ رہا ہے۔ اُسے اس دور میں کئی طرح کی آسیبوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں ہے جو اُسے گھر کے حقیقی مفہوم سے آشنا کر دے۔ مگر امن وسکون کی تلاش میں اُس کی یہ دشت نوردی آج کے دور میں محض خود فریبی اور سراب ثابت ہوتی ہے۔

پروین شاکر چونکہ نسائی حیثیت اور رومانیت پسند شاعرہ کی حیثیت سے ہمیشہ پہچانی گئیں اور اُن کی شاعری کے مزاحمتی پہلو کی طرف قارئین اور ناقدین کی توجہ نہیں گئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے آمریت کے دور میں ظلم کے خلاف سچائی اور حریتِ فکر کے چراغوں کو روشن رکھنے کی تگ ودو قلم کے ذریعے اپنا مؤثر کردار نبھایا نہ صرف اُن کی نظموں بلکہ پروین کی ساری شاعری میں استحصالی قوتوں کے خلاف بھی شدید ردِ عمل کا اظہار پایا جاتا ہے وہ جاگیردارانہ نظام کی زیادتیوں، ناانصافیوں کا اظہار بھی کرتی ہیں اور استحصال کے مارے کسانوں کے لیے بے پناہ ہمدردی رکھتی ہیں ۔اُن وڈیروں اور زمینداروں کے کردار کو بے نقاب کرتی ہیں جو مزدوروں اور کسانوں کی خون پسینے کی کمائی پر شب خون مارتے ہیں اور انھیں دانے دانے کا محتاج بنا دیتے ہیں۔

؎ یہی رہا ہے مقدر مرے کسانوں کا
کہ چاند بوئیں اور گہن زمین سے ملے

؎ جب بھی غریب شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نم ناک ہو گئے

پروین شاکر اپنے عہد کے سخن فروشوں سے بہت دھیمے انداز میں ناراضگی کا اظہار کرتی ہیں جو

حاکمِ وقت کے آگے منہ مانگے داموں اپنے ضمیر کا سودا کر کے بک جاتے ہیں۔ حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ اہلِ علم و ہنر شعور آ گہی کی قندیلوں سے عوام کے خوابوں اور تمناؤں کی ترجمانی کو اپنا شعار بناتے لیکن اُن کی بے ضمیری انھیں اپنی خودداری اور انا کے بدلے اپنی شناخت کھونے پر مجبور کرتی ہے جبکہ ایسے حالات میں حق پرست لوگ اپنے آپکو بے ہنر ہی ٹھہراتے ہیں۔

؎ اے آنکھ! اب تو خواب کی دنیا سے لوٹ آ
مژگاں تو کھول! شہر کو سیلاب لے گیا

جو قوم بے ضمیر ہو جائے تو وہ احساس زیاں سے بھی عاری ہو جاتی ہے۔ اس کا صفحۂ ہستی سے مٹ جانا یقینی ہے۔ پروینؔ قوم کے شعور کو پیدا کرنا چاہتی ہیں تا کہ وہ اپنے سود و زیاں کا حساب کر سکے۔ غزلوں اور اخباری کالموں میں بھی ایسے نمونے ملتے ہیں کہ انھوں نے ظلم و جبر کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا اور مصلحت آمیز خاموشی کو وطن کے تئیں غداری سے تعبیر کیا۔

؎ چراغ بجھتے رہے اور خواب جلتے رہے
عجب طرز کا موسم مرے وطن میں رہا

؎ کیسی بے چہرہ رتیں آئیں وطن میں اب کے
پھول آنگن میں کھلے ہیں، نہ چمن میں اب کے

؎ اِس اسیری میں بھی ہر سانس کے ساتھ آتی ہے
صحنِ زندان میں انہیں دشتِ وطن کی خوشبو

؎ لوگ تھرا گئے جس وقت منادی آئی
آج پیغام نیا ظلِ الٰہی دیں گے

؎ طائر جاں کے گذرنے سے بڑا سانحہ ہے
شوق پرواز کا ٹوٹے ہوئے پر میں رہنا

پروین شاکر مارش لاء کے نتیجے میں وطن کی بے چہرہ رُتوں، بجھتے چراغوں اور اہلِ وطن کے جلتے ہوئے خوابوں کا تذکرہ کرتی ہیں۔ وطن کی رونقوں کے ماند پڑ جانے سے فضا کی سوگواری انھیں دکھ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ فیض احمد فیض کی لفظیات کو معنی کو نئی جہتوں سے ہمکنار کرتی ہیں۔ اِس طرح ''دشتِ وطن'' اور ''صحن زنداں'' جیسی تراکیب استعمال کر کے وطن سے محبت کے احساس کو بخوبی اجاگر کرتی ہیں۔ وطن سے دور ہونے کے بعد وطن کے شب و روز انسان کو بے قرار کر دیتے ہیں وطن سے والہانہ محبت رکھنے والے افراد ''صحنِ زنداں'' میں وطن کی یادوں کے سہارے اپنے جینے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ وطن کی یاد ان کے اندر جینے کی امنگ اور حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ جس سے انھیں زندان کی صعوبتیں بارِگراں نہیں ہوتیں۔

پروین کی غزلوں کے کئی اشعار ایک بے پایاں اضطراب و بے چینی کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی وجہ ظلم و جبر اور ناہمواریاں ہیں جس کا نشانہ معاشرے کے افراد بنے ہوئے ہیں۔ قاتل کے خونی ہاتھ ایک ایک فرد کو موت کی نیند سلا رہے ہیں لیکن اُس کی پیاس بجھنے کا نام نہیں لے رہی۔

؎ میں بچ بھی جاؤں تو تنہائی مار ڈالے گی
مرے قبیلے کا ہر فرد، قتل گاہ میں ہے

؎ بچھڑنے والے اتنے ہو گئے ہیں شہر در شہر
کہ باقی اب کسی گھر میں عزاداری نہیں ہے

یہ شعر معنویت کے اعتبار سے پاکستان کے موجودہ منظر نامے کی عکاسی کرتا ہے۔ ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ وہاں کی امن و امان کی صورتحال دہشت گردی، بموں کے دھماکوں، ٹارگٹ کلنگ کے تناظر میں کہا گیا ہے۔ مجبور و بے کس انسانیت سسک رہی ہے، سب چپ سادھے موت کا خونی رقص دیکھ رہے ہیں۔

؎ جدھر دیکھوں کھڑی ہے فصلِ گریہ
مرے شہروں میں آنسو بو گیا کون

؎ ابھی تک بھائیوں میں دشمنی تھی
یہ ماں کے خون کا پیاسا ہوگیا کون

؎ غیروں کی دشمنی نے نہ مارا ہمیں مگر
اپنوں کے التفات کا یہ زہر آب لے گیا

ایک سچے محبِ وطن کی حیثیت سے اپنے سرزمین کو لہو سے رنگین ہوتا دیکھ کر پروین کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ گروہی، لسانی اور مسلکی بنیادوں پر اپنے اہلِ وطن کو دست و گریباں دیکھ کر وہ مجسم سوال بن جاتی ہیں اور اُن عناصر کے خلاف اپنے غم و غصے کا اظہار کرتی ہیں جو ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچا رہے ہیں جس کا ثبوت پہلے کراچی شہر تھا جو آگ وہاں لگی ہوئی تھی اب دیگر صوبوں اور شہروں میں پھیل چکی ہے پروین اس کا ادراک بہت پہلے کر چکی تھیں۔ کراچی شہر کی اپنوں کے ہاتھوں تباہی پروین کو خون کے آنسو رلا گئی۔ جائے پیدائش ہونے کے ناطے اِس شہر سے اُن کی جذباتی وابستگی تھی اِس لیے نانھیں ے کئی غزلیں اور نظمیں اس موضوع پر کہی ہیں، نظم کے باب میں اِس موضوع پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ کراچی کے سانحات پر اِس دکھ کا اظہار کرتی ہیں جس طرح کہ اقبال نے ’’غرناطہ‘‘ پر کیا تھا۔ کراچی کے ایسے ہی دکھ بھرے منظر کے بارے میں

پروین نے کہا تھا۔

؎ پیشِ آثارِ قدیمہ رک گئے مرے قدم
شہر کے دیوارودر کچھ جانے پہچانے لگے

؎ اِس شہرِ خوش جمال کو کس کی لگی ہے آہ
کس دل زدہ کا گریۂ خوفناک لے گیا

؎ آنکھوں سے آج کون مرے خواب لے گیا
چشمِ صدف سے گوہرِ نایاب لے گیا

کراچی کے حالات نے ہمیشہ انھیں اذیت کے احساس سے دوچار رکھا اور انھوں نے اپنے اِس شدتِ احساس کو لوگوں تک اپنی شاعری کے ذریعے پہنچانے کی کوشش کی۔'روزنامہ جنگ' کے ایک کالم بعنوان''حالاتِ حاضرہ کو کئی سال ہوگے؟ میں کراچی کے پریشان کن حالات پر متفکر دکھائی دیتی ہیں ملاحظہ کیجیے اخبار''جنگ'' کے ایک کالم سے اقتباس

''قائداعظم کے جشنِ ولادت کے سلسلے میں پاکستان ٹیلی ویژن نے ایک مشاعرہ برپا کیا۔۔۔۔اور ہمیں بھی مدعو کیا لیکن قائد کے شہر کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے اِس کے بعد ہماری ہمت نہیں پڑی کہ ہم جشن میں شریک ہوسکیں۔۔۔۔جس شہر نے آپ کو جنم دیا ہو، اُسے دم توڑتے ہوئے دیکھنا اتنا آسان کام نہیں۔۔۔پانچ سال پہلے ایسی ہی صورت حال تھی جب ہم نے ایک نظم لکھی تھی۔کراچی ۸۹ کی آخری شام'' آج ۹۴ ہے۔۔۔اور فرق کوئی نہیں حالتِ حاضرہ کو کئی سال ہوگئے''۔[1]

---

[1] ''روزنامہ جنگ'' ۲۸ دسمبر ۱۹۹۴

پروین شاکر جس عہد میں سانس لے رہی تھیں وہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے عدم استحکام کا دور تھا قدریں اور رشتے شکست وریخت کا شکار تھے۔ ایسے دور میں پروین جیسی حساس شاعرہ نے وہی لکھا وقت جس کا تقاضا کررہا تھا۔ حقیقت کی نقاب کشائی میں پروین کے جذبوں اور محسوسات کی شدت اور حدت بھی شامل ہوگئی۔

''خودکلامی'' کی غزلوں کا کینوس اداسی اور حزن وملال کے رنگوں سے عبارت ہے زندگی کے اِس موڑ پر وہ فیصلہ لے چکی تھیں کہ انھیں زندگی کا باقی ماندہ سفر تنہا ہی کاٹنا ہے، ''صد برگ'' میں وہ جس، ''گومگو'' کی کیفیت میں تھیں، ''خودکلامی'' میں اِس سے باہر نکل آتی ہیں اور اُن کا فیصلہ کن انداز سامنے آجاتا ہے اِس لئے ''خودکلامی' کی غزلیں تنہائی، محبت میں ناکامی کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اندر کی دنیا میں گم ہوکر خارجی دنیا اور حقیقتوں کی تلاش بھی نمایاں ہے، بالغ النظر حساس عورت کے ذہن کی فکری پختگی اور دانشورانہ سوچ کا اندازہ بھی ہوتا ہے، انسانیت کے لیے دردمندانہ جذبات کا اظہار بھی۔

نظموں کی نسبت غزلوں میں زیادہ تر ذاتی واردات کے تجربے محسوس ہوتے ہیں غزلوں میں دیگر موضوعات کم ہی ہیں۔

کسی محبوب ہستی کا بچھڑنا، رفاقت کی تمنا اِس کے بعد ایک ادھورے پن کا احساس، پچھتاوے، شکستِ آرزو کے نغمے بن کر ابھرتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی تنہائی میں اپنے بیتے لمحوں کے کرب کا شمار کررہا ہے ملاحظہ کیجئے چند مثالیں

ے میری طلب تھا ایک شخص وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دُعا سے یوں گرا، بھول گیا سوال بھی

ے اُس کو نہ پا سکے تھے جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھئے، بات تھی کچھ محال بھی

ے جب ستارے ہی نہیں مل پائے
لے کے ہم شمس و قمر کیا کرتے

ے اتنا سمجھ چکی تھی اُس کے مزاج کو
وہ جارہا تھا اور میں حیران بھی نہ تھی

ے اُس کی خوشبو کا ہی فیضان ہیں اشعار اپنے
نام جس زخم کا ہم نے گل تر پر رکھا

غزل کے زیادہ تر اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف اور صرف وہی موضوع ہے جوان سے بچھڑ چکا ہے مگر انداز ''خوشبو'' والی شاعری سے کافی مختلف ہے۔خود کلامی کا لہجہ پختہ اور رچا ہوا ہے۔

ے عشق نے سیکھ ہی لی ہے وقت کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

ے اُس سے ملنا ہی نہیں دل میں تہہ کرلیں
وہ خود آئے تو بہت سرد رویہّ کرلیں

وہ اس گھر کی بنیادوں کے بیٹھ جانے کا دکھ تو بہت کرتی ہیں مگر ساتھ ہی اپنے آپ کو یہ تسلی بھی دیتی رہتی ہیں کہ اُس گھر کی بنیادیں ایک شکستہ کھنڈر پر قائم تھیں جس کا ٹوٹنا یقینی تھا۔

وقت بہت بڑا مرہم ہے سب زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو جاتے ہیں، جاں بلب یادیں وقت کی گرد سے دہیرے دہیرے ڈھک جاتی ہیں۔صرف کسک باقی رہ جاتی ہے۔ان کے دل کے زخم بھی

جل بجھ چکے ہیں بس انھیں شکوہ ہے تو یہ کہ دل کا ایک پرانا زخم لو دیتا رہتا ہے۔ مگر وہ زخموں کا چہرہ دھوکر جشنِ بہار میں شرکت کرنے کا ہنر سیکھ لیتی ہیں لیکن صبر وضبط کے باوجود گاہے گاہے یہ شکوہ ان کی زبان پرآ ہی جاتا ہے کہ آج تک جو اُن کی شاعری کا عنوان بنا ہوا ہے وہ خود تو اس کی بزم میں اک حرفِ زیرِلب بھی نہیں۔ زندگی و حالات سے سمجھوتے کے باوصف کوئی زخم دینے والا مسلسل یاد آتا رہتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے خیالوں کی زنجیر اسبابِ سفر کے ساتھ ہی بندھی ہوئی آگئی ہے جو بار بار انھیں خوابوں کے مدفن پر دوبارہ کھینچ لاتی ہے پیکر تراشی، منظر کشی، اور کیفیت سازی کے کے تخلیقی رموز سے بھرپور اشعار خوابوں کی تعبیریں پانے کی حسرت اور پھر خوابوں کے بکھرنے کے المیے سے جانبر ہونے کی کوشش سے عبارت ہیں۔

ے ایسا لگتا ہے پیروں سے لپٹ آئی ہے
ایک زنجیر بھی اسباب سفر کے ہمراہ

ے کوئی زنجیر پھر واپس وہیں پر لے کے آتی ہے
کٹھن ہو راہ تو چھٹتا ہے گھر آہستہ آہستہ

آراستہ تو خیر نہ تھی زندگی کبھی
پر تجھ سے قبل اتنی پریشان بھی نہ تھی

ے جس جا مکین بننے کے دیکھے تھے میں نے خواب
اُس گھر میں ایک شام کی مہمان بھی نہ تھی

ے تری زیبائی سلامت رہے اے قامت دوست
زیب پوشاک رہیں گے مرے زخموں کے گلاب

خواب ہماری زندگیوں کا لازمی جُز ہیں اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خواب بہت دیکھتا ہے۔ اپنی آرزوؤں، تمناؤں، اور امیدوں کے رنگ سے خوابوں کی آبیاری کرتا رہتا ہے۔ خواب تعبیروں سے ہمکنار نہ بھی ہوں تو بھی وہ خواب دیکھنے سے باز نہیں آتا بلکہ نئے سرے سے خوابوں کے تانے بانے بنتا چلا جاتا ہے۔ اِس طرح انسان کے خوابوں کا تسلسل جاری رہتا ہے یہ خواب ہی تو ہیں جو اُس کی ذات کے نخل کو سرسبز و شاداب رکھتے ہیں۔ لیکن جب آنکھیں ہی خوابوں سے محروم ہو جائیں تو زندگی بے کیف و بے رنگ ہونے کے ساتھ تہی دست تہی دامن بھی رہ جاتی ہے۔ جدید شاعر نہ صرف خواب دیکھتا ہے بلکہ اِن کا تذکرہ بھی کرتا ہے اور اِن خوابوں کی ترسیل بھی کرتا ہے۔ جدید شاعری خوابوں کا سرچشمہ ہے۔

موجیں بہم ہوئیں تو کنارہ نہیں رہا
آنکھوں میں کوئی خواب دوبارہ نہیں رہا

پروین بھی خوشبو سے لے کر ''کفِ آئینہ'' تک حسین خوابوں کی اسیر رہی ہیں۔ زیست کے ٹیڑھے میڑھے رستوں پر چلتے ہوئے وہ ایک آدھ لمحہ خواب دیکھنے کے لیے چرا ہی لیتی ہیں، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ رستوں کی تھکن اتار کر خواب بننا چاہتی ہیں لیکن اُن کی آنکھوں میں کیکٹس اُگ آتے ہیں۔

؎ شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اِک خواب نہیں
کوئی اس گھر میں نہیں روشنی کرنے والا

؎ ہم سفر چھوٹ گئے راہ گزر کے ہمراہ
کوئی منظر نہ چلا دیدۂ تر کے ہمراہ

؎ خواب کیا دیکھے کوئی نیند کے انجام کے بعد
کس کو جینے کی ہوس، حشر کے ہنگام کے بعد

؎ آنکھیں ابھی کھل نہیں سکی تھیں
اور خواب مرے بکھر گئے تھے

؎ جس طرح خواب مرے ہوگئے زیرہ زیرہ
اِس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

پروین شاکرؔ اپنے آپ کو سیفوؔ اور میراؔ کی ہم قافلہ کہتی ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی شاعری کا محور عشق ہے۔ اِس لیے انھیں اپنی شاعری میں سیفوؔ اور میراؔ کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ میراؔ کے ہاں عشقِ حقیقی ہے جبکہ پروین کے ہاں عشقِ مجازی ہے لیکن یہ بات تو طے ہے کہ سیفوؔ اور میراؔ ایک ایسی عورت کا استعارہ ہیں جس کے جسم و جان محبت کی تپش میں آہستہ آہستہ پگھل رہے ہیں لیکن دونوں کے یہاں عشق کی کیفیتوں کے بیان میں کچھ باتیں اور خاصیتیں مشترک ہیں جس طرح پروین بھی جسم و جاں کو پگھلا کر اپنی شاعری کا پیکر تراشتی ہیں، سوز و گداز دونوں کی شاعری میں موجود ہے، عشق کی بے قراری و بے تابی اور خودسپردگی کا حال بھی ایک جیسا ہے۔ اِس کے علاوہ دونوں میں بے ساختگی و برجستگی بھی پائی جاتی ہے لیکن ''چاندنگر'' میں رہنا دونوں کا مقدر نہ بن سکا۔

اس سلسلے میں میراؔ اور سیفو کا مختصر سا تعارف ضروری ہے۔ سولہویں صدی کی راجستھان کی سرزمین سے تعلق رکھنے والی صوفی شاعرہ میراؔ بچپن سے ہی شری کرشن کے عشقِ حقیقی میں غرق تھیں بچپن سے ہی بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا

مورے تو گردھر گوپال دوسرو نہ کوئی[۱]

شری کرشن کی تعریف میں انھوں نے بیش بہا گیت اور بھجن گائے اپنے آبائی گھر اور سسرال کی آسائشی زندگی کو خیر باد کہہ کر اپنے کرشن کنہیا کے لیے جوگن کا روپ دھار کر گیت گاتی رہیں ایسے میں انھیں اپنے تن من کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ عام طور پر عشقیہ کی شاعری جھوٹ اور مبالغے پر مبنی ہوتی ہے۔ لیکن میرؔا کے بھجن عقیدت کا پر خلوص اظہار ہیں۔ ان میں آرزومندی، عاشق کی تشنگی محبوب کے لیے وارفتگی اور خود سپردگی پائی جاتی ہے۔ میرؔا ہاتی ہندی زبان کی شاعرات کے علاوہ دنیا کی تمام معروف زبانوں کی شاعرات سے سبقت لے گئی ہیں جس کی وجہ ان کا نسائی لب و لہجہ اور نسائی جذبے کی ترجمانی ہے۔ جس میں ایک عورت کی روح اور درد و کرب ہے اور اس کے ساتھ جذبے کی صداقت اور پاکیزگی بھی پائی جاتی ہے۔ میرؔا کی شاعری نسائی احتجاج کی پہلی آواز ہے جو میرؔا نے عورت کی آزادی کے لیے سو برس پہلے بلند کی تھی۔

اس طرح سے یونان کی شاعرہ سیفو ہیں انھوں نے بھی عشقیہ شاعری کی۔ ان کا دور ۷۰۰ قبل مسیح پر مشتمل ہے۔ سیفو کا عشق گوشت پوست کے جسم اور اس کے ظاہری حسن سے ہے جبکہ میرا میرؔا نے عشق میں پاکیزگی اور الہیاتی تقدس ہے۔ ان کی زندگی بہت حد تک میرؔا سے ملتی جلتی ہے۔ سیفو کو یونان چھوڑ کر سسلی میں پناہ لینا پڑی۔ ان کی شاعری کی دریافت بھی ان کی موت کے تین چار سو سال بعد ہوئی۔

لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ یونانی شاعرہ سیفوؔ اور ہندی شاعرہ میرؔا کی طرح پروین کا عشق بھی اُردو کے شعری سرمائے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

۱۔ پریم دوانی میرؔا مصنف پروفیسر ثاقب رضوی اخذ میرؔا شخصیت اور فن مرتبہ ثروت خان، ص:۲۰۴

کوئی سیفو ہو کہ میرا ہو کہ پروین اُسے
راس آتا ہی نہیں چاند نگر میں رہنا

پروین کی غزلیں سادگی و پرکاری کا عمدہ نمونہ ہیں اُن کے ہاں لفظوں کے انتخاب اور اُن کے استعمال میں ایک رکھ رکھاؤ، تہذیب اور سلیقے کا احساس ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُن کی غزل میں ایک نیا نکھار، نرالی سج دھج اور گداز و لطافت کی صفت بھی پیدا ہوگئی ہے جس کی مثال اُن کی ہم عصر شاعرات میں بہت کم دکھائی دیتی ہے نغمگی اور موسیقی کی لے ان کی غزلوں کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ اِن خصوصیات کے ساتھ ساتھ اُن کی غزلوں میں گہرا تفکر، سنجیدگی، تنوع، قدرتِ بیان اور عصری حسیت بھی موجود رہے۔ اُن کے موضوعات بھی اتنے وسیع ہیں کہ ذات سے کائنات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ملک پر گیارہ سالہ آمریت کا دور بھی اُن کی شاعری پُر اثر انداز ہوا ہے، ''صد برگ'' اور ''انکار'' میں احتجاجی لہجہ زیادہ نمایاں ہے جبکہ دیگر مجموعوں میں دھیمے لہجے میں اِس کا اظہار ہوا ہے۔ ''خود کلامی'' میں احتجاجی عنصر بظاہر نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس کی وجہ وہ اخبار ''نیوز لائین کے نامہ نگار احمد سلام کو دیے گیے انٹرویو میں بتاتی ہیں ملاحظہ ہو پروین کے انٹرویو سے اقتباس۔

Q: Khud Kalami, which followed Sadbarag, was also published during material law, but it is less reactionary Than Sadbarag.

A: Yes, I agree with you. There is more loneliness and tiredness in Khud Kalami. There is a dominant feeling in it that now nothing can be done. You have rightly said that there was a feeling of hope and the urge to struggle in Sadbarag but in Khud Kalami not only are these missing, but there are added feeling of loneliness and depression coupled with bewilderment at the happening of the period. At that time, it seemed as if that force would never pass. When you are left alone you can only talk to yourself because it is you alone who can understand your own thoughts. There was an intense feeling that dialogue with others was not possible.[1]

---

[1] (اخبار ''News Line'' احمد سلام کو دئے گئے انٹرویو سے اقتباس)

''خود کلامی'' کی شاعرہ کو دھیمے لہجے میں گہری بات کہنے کا سلیقہ حاصل ہے۔ ایسا سلیقہ جو آج کی جدید اُردو غزل کا تقاضا ہے وہ واقعات کو واردات میں ڈھالنے اور واردات کو ہمہ گیریت عطا کرنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ غرض دنیا کے اِس ہجومِ بے حس میں ''خود کلامی'' ذہنی تنہائی کے کرب کی علامت بن کر ابھری ہے جس میں محرومیٔ حیات بھی ہے، درد و کسک بھی، زمانے والوں کی بے سمتی و بے حسی کے شکوے بھی لیکن خود اعتمادی اُن کی ذات کا ایک ایسا جوہر ہے جو اُن کی شعری کائنات میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے وہ اپنے شعور و وجدان اور خود اعتمادی کے بھروسے پر زندگی کی الجھی پر پیچ راہوں کو سلیقے سے سلجھانا جانتی ہیں اور آگے بڑھتے رہنا بھی۔

؎ جو اپنے پیڑ جلتے چھوڑ جائیں ہر بار
انھیں کیا حق ہے کہ روٹھیں باغباں سے

؎ نشتر بدست شہر سے چارہ گری کی لو
اے زخمِ بے کسی تجھے بھر جانا چاہئے

؎ ہر بار ایڑیوں پر گرا ہے مرا لہو
مقتل میں اب طرزِ دِگر جانا چاہئے

؎ طوفان کے جلو میں مری بے بضاعتی
بستی کو دیکھتی کبھی دریا کو دیکھتی

اِن غزلوں میں نشتر بدست شہر زخمِ بے کس، چشمِ شناسا، بے بضاعتی، لہو، مقتل، معاشرے کی بے حسی اور احتجاجی لب و لہجے کو نمایاں کرتے ہیں۔ انکار اور کفِ آئینہ کا کینوس اداسی، تھکن، دکھ، آزردگی کے رنگوں سے آراستہ ہے۔ دیگر مجموعوں کی نسبت جواب مزید گہرے اور منفرد شکل اختیار کر

چکے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شہرت ومقبولیت کی اعلیٰ منزلوں پر پہنچنے کے باوجود کئی حوالوں سے دکھی اور تنہا تھیں جس کا اندازہ ''انکار'' اور ''کفِ آئینہ'' سے ہوتا ہے۔ کیونکہ قدرت نے انھیں دکھ اور سکھ دونوں فراوانی سے عطا کئے ہوئے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ زندگی کے بارے میں اُن کی Idealistic Approach تھی ایسے لوگ دنیا میں باوجود کوشش کہ نہ تو خود خوش رہ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی دوسروں کو خوش رکھ سکتے ہو۔ بحرحال دونوں مجموعوں میں اُن کا فن اپنی انتہاؤں پر ہے جس میں پختگی بھی ہے اور خود شناسی بھی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے موت کی آہٹیں اپنے قریب محسوس کر لی تھیں اِس لئے وہ شعوری طور پر اپنے آپ کو اِس بات کے لیے تیار کر رہی تھیں کہ یہ دنیا ان کے رہنے کے لائق نہیں ہے۔ کہیں اپنے ماحول میں رہنے والے بھڑیوں کا ذکر کرتی ہیں اور کہیں ''درونِ شہر گلابوں کی باڑ'' کے ختم ہونے کا اعلان۔ اسی طرح کتاب کا نام ''ماہ تمام'' یا آخری کالم ''گوشہ چشم''، جس کا پہلا ہی جملہ موت سے متعلق ہے۔ یہ سب باتیں اِس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اب یہاں مزید رکنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔

خود کلامی اور کفِ آئینہ میں اداسی بھی تھکی سی محسوس ہوتی ہے۔

ے درونِ شہر گلابوں کی باڑ ختم ہوئی
کنارِ شہر پرانی ببول باقی ہے

ے بابِ حیرت سے مجھے اذنِ سفر ہونے کو ہے
تہنیت اے دل کہ اب دیوار در ہونے کو ہے

ے موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دل میں کیوں
کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے پروین شاکر

تنہائی اور ترک دنیا کے جذبات اِن دونوں مجموعوں میں پائے جاتے ہیں۔موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔شاعر کے تخیل کی آخری منزل موت ہے جہاں اُس کے فکر کی پرواز تھم جاتی ہے اور عنقائے تخیل کے پر جل جاتے ہیں ہر زبانِ میں شعرا و ادباء نے موت کی دستِ ستم کاریوں کا ذکر کیا ہے لیکن باوجود کوشش کہ کوئی یہ گتھی نہ سلجھا سکا۔جس طرح چکبستؔ نے زندگی کو عناصر کا ظہورِ ترتیب اور موت کو اِن اجزاء کا پریشان ہونا ٹھہرایا ہے کسی نے موت کو واماندگی کا وقفہ بتایا ہے تاکہ تھوڑی دیر دم لے کر آگے بڑھا جائے غالبؔ اور اقبالؔ نے زندگی اور موت کو فلسفیانہ نکتہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اقبالؔ موت کی نیند سوئے ہوؤں سے موت کا راز جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ؔ آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا
اُس رعایت میں بھی ہے انسان کا دل مجبور کیا
تم بتا دو راز جو اِس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انسان میں ہے

پروین کے یہاں موت سے آگاہی کا اندازہ کچھ مختلف طریقے سے ہے''صد برگ''،''انکار اور ''کفِ آئینہ'' سے مثالیں۔

ؔ موت وہ ساقی کہ جس کے کبھی تھمتے نہیں ہاتھ
بھرتی جائے سدا جام وہ اِک جام کے بعد

ؔ تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی
اور تیری بزم سے کوئی اٹھا چاہتا ہے

؎ اپنے انجام تک آ گئی زندگی
یہ کہانی مگر اختلافی رہی

؎ سرائے خانہ دنیا میں شام ہوتی ہے
مسافروں کو نوید سفر نہیں آتی

زندگی اور موت سے متعلق ایک چھوٹے سے شعر کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا شعر علم ہست و بود کے فلسفے کا احاطہ کیئے ہوئے نظر آ تا ہے۔

بڑھتی جاتی ہے کشش وعدہ گۂ ہستی کی
اور کوئی کھینچ رہا ہے عدم آباد سے بھی

پروین شاکر کے لہجے میں آبشاروں کا زور و شور نہیں بلکہ موجوں کی نغمگی اور جھرنوں کا سا ترنم ہے سمندر کا گہرا سکوت ہے جو اپنے اندر کئی طوفان سموئے ہوئے ہے۔ کفِ آئینہ اور انکار میں تھکے ماندے عزائم ہیں اور یاس گرفتہ خوابوں کا عکس ہے۔اس کے علاوہ عمرِ رواں کا احساس بھی شدت سے پایا ہے۔

؎ مٹھی میں تو رنگ تھے ہزاروں
بس ہاتھ سے ریت بہہ رہی تھی

وہ محسوس کرتی ہیں کہ جس کے دم سے زندگی کے اجالے تھے وہ کسی دوسرے دیس کا راہی بن چکا ہے۔ اِس لیے اب زندگی اندھیاروں کی نذر ہو گی لیکن شب کی تنہائی میں صرف گفتگو تو اُسی سے ہے وہ جانتی ہیں کہ صیاد کا دل بھر چکا ہے ورنہ تو وہ خوبصورت قید میں زندگی بھر کے لیے اڑنا ہی بھول جائیں لیکن محبوب یا دوست ساتھی کے رستہ بدلنے پر ایسی بے یقینی کی کیفیت جنم لیتی ہے کہ روح تک

حیران رہ جاتی ہے اُن کی ذات جسے لوگ ہنستی ہوئی آنکھوں کا نگر سمجھتے ہیں لیکن اصلیت سے کوئی واقف نہیں کہ پسِ دیوارِ جاں کیسی کیسی آرزوئیں، تمنائیں نوحہ وگریہ بن کر دم توڑ چکی ہیں۔'انکار' 'کفِ آئینہ' میں بے نگہت موسموں اور ویران خوابوں کے نمو کی نوید سنائی دیتی ہے۔

میں ستاروں کی سفارش بھی اگر لے آتی
یہی لکھی تھی مرے خوابوں کی تعبیر، سو ہے

تجھ کو بھی نہ مل سکی مکمل
میں اتنے دکھوں میں بٹ گئی تھی

اُس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

بڑھتی جاتی ہے کشش وعدہ کی ہستی کی
اور کوئی کھینچ رہا ہے عدمِ آباد سے بھی

'کفِ آئینہ' اور 'انکار' میں اہلِ اقتدار پر تنقید کی گئی ہے جو طاقت ثروت کے نشے میں عوام کو ظلم وستم کا نشانہ بناتے ہیں۔ اُن کو ایسے الفاظ میں مخاطب کیا گیا ہے جو رعونت اور تکبر کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ "ظلم سہنا ایک طرح سے ظالم کی حمایت کرنا ہے اور خاموشی ایک طرح کی ظلم کی پشت پناہی ہے"۔

سو وہ ظلم و جبر کے آگے چپ رہنے کے جرم سے انکار کر جاتی ہیں اور انھیں ہدفِ تنقید و ملامت بناتی ہیں۔

؎ وہی شداد وہی جنتِ خاشاک نہاد
ویسے ہی عظمتِ یک لحظہ پر مغرور ہوئے

؎ وہ رعونت ہے کہ لگتا ہے ازل سے ہے یونہی
نشۂ مسندِ شاہانہ سے مخمور ہوئے

؎ چھاؤں بیچ آئے ہیں یوں نفس سے مجبور ہوئے
وہ جو تقسیمِ ثمر پہ یہاں مامور ہوئے

؎ شعبۂ رزق خدا نے جو رکھا اپنے پاس
نائب اللہ بہت بددل و رنجور ہوئے

پروین کی یہ انفرادیت ہے کہ طنزیہ انداز والقاب استعمال کرتے وقت بھی غزل کا مزاج اور شعریت برقرار رہتی ہے خونین واقعات کی تصویر کشی کرتے ہوئے بھی پروین کا لہجہ نرم وکومل رہتا ہے اور زبان کی دلکشی متاثر نہیں ہوتی۔

؎ سلگ رہا ہے مرا شہر جل رہی ہے ہوا
یہ کیسی آگ ہے جس میں پگھل رہی ہے ہوا

؎ رکھی ہوئی ہے ہر اک گھر کے صحن میں میت
سو وقفے وقفے سے جیسے سسک رہی ہے ہوا

؎ جب گھر میں رکھی ہوئی ہو میت
پھر جشن بپا کیا ہے کس نے

جب یہ مناظر دیکھنے کی تاب ختم ہوجاتی ہے تو اُن کے دل کا درد دبی دبی سسکیوں کی شکل

اختیار کر لیتا ہے جوان کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔

؎ پیراہنِ غم سیا ہے کس نے
خوابوں کو کفن دیا ہے کس نے

؎ بستیاں آخری دموں پر ہے
اور حرفِ شفا نہیں ملتا

؎ ظلم کے ہاتھوں اذیت میں ہے جس طرح حیات
ایسا لگتا ہے کہ اب حشر ہے کچھ دیر کی بات

تلخی حالات کے تکلیف دہ احساس کو خوشگوار خوابوں کے تانے بانے بن کر سلجھاتی رہتی ہیں۔ کفِ آئینہ میں خیالوں اور خوابوں کا سیلِ رواں ہے جو آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کہیں پر یادیں مندمل ہوتے زخموں کو کھر وچ ڈالتی ہیں تو کہیں ماضی کی یادوں کے سہارے حال کے بے کیف لمحات کو خوبصورت بنانے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ کہیں کچھ پانے کی خوشی ہے تو دوسری طرف کچھ کھونے کا غم ہے۔ کئی اشعار ایسے ہیں جن میں جذبات واحساسات سے عاری لہجہ بھی سامنے آتا ہے۔

خوش گمانی کی کیفیات یا تصور بھی ہے ایک سرور کا احساس بھی ہے پیکر تراشی کے ایسے نمونے پروین کے ہاں ملتے ہیں جو تمام حواسِ خمسہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے پیکر تراشی کے ذریعے جو تجربات بیان کئے ہیں وہ بصری، سمعی اور شامی و لمسی کیفیات کو متحرک کرتے ہیں۔ حسیاتی تجربے کی وسیع دنیا ان کی ملکیت ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں منظر نگاری، مصوری اور حسیاتی محاکات کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔

ے آنکھوں نے کیسے خواب تراشے ہیں اِن دنوں
دل پر عجیب رنگ اترتے ہیں ان دنوں
رکھ اپنے پاس اپنے مہ و مہر اے فلک
ہم خود کسی کی آنکھ کے تارے ہیں اِن دنوں
رکی ہوئی ہے ابھی تک بہار آنکھوں میں
شب وصال کا جیسے خمار آنکھوں میں
مٹا سکے گی اسے گردِ ماہ وسال کہاں
کھنچی ہوئی ہے جو تصویرِ یار آنکھوں میں

پروؔین کے ہاں وہ حسیات بھی بہت ہنرمندی سے لفظوں کے پیراہن میں مقید ہیں جو وصال واختلاط کے لمحوں کا حصہ ہیں۔

ے ایسا نہ ہو کہ لمس بدن کی سزا ملے
جی بھول کا ہوا کی محبت سے بھر نہ جائے
ے خود پھول نے بھی ہونٹ کیئے اپنے نیم وا
چوری تمام، رنگ کی تتلی کے سر نہ جائے

پروین کے یہاں روائتی عشق کی واردات کی عکاسی تو ضرور ہے مگر خیال کی شگفتگی اوراسلوب کی ندرت روایت کی تپتی زمین پر برسات کی اُس پھوار کی مانند ہے جو دھرتی کوسوندھی سی مہک سے آشنا کر دیتی ہے۔اُن کے ہاں محبت کے جذبے کی تشریح ایسے انداز میں ہوتی ہے کہ یہ جذبہ جب

اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو وہ کیفیت جنم لیتی ہے جو ہجر و وصال سے بے نیاز ہوتی ہے ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا، وہ ہمارا ہو نہ ہو اُس کی مرضی ہے کہ وہ ہمیں پاؤں کی دھول سمجھ کر جھٹک کر آگے بڑھ جائے یا گلاب سمجھ کر اپنی آرائش کا سامان کرے۔ فیصلہ تو اُسی کے ہاتھوں میں ہے، محبت یادوں کو کہکشاں بنا کر ہجر میں وصل کا ساماں پیدا کرتی ہے۔ محبت جہاں انسان کو مجبور بنا دیتی ہے تو وہاں انسان کو مغرور بھی کر دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو کفِ آئینہ سے اشعار جو انہی خیالات و کیفیات کی آئینہ سامانی کرتے ہیں۔

ؔ وصال ہجر اب یکساں ہیں، وہ منزل ہے الفت میں
میں آنکھیں بند کر کے تجھ کو اکثر دیکھ سکتی ہوں

ؔ میں تجھ کو دیکھ نہ پاؤں تو کچھ ملال نہیں
کہیں بھی ہو تو، ستارہ نشاں گذرتا رہے

ؔ میں تیری چھاؤں میں کچھ دیر بیٹھ لوں اور پھر
تمام راستہ بے سائباں گذرتا رہے

ؔ میں تیرا ساتھ نہ دے پاؤں پھر بھی ترا سفر
گلاب و خواب کے ہی درمیان گزرتا رہے

ؔ کس کی یاد میں ڈوبا ہوا دل
بہانے سے مجھے بھی ٹالتا ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروین شاکر اپنے عہد کے پورے شعری منظر نامے میں اپنے

قد وقامت کے اعتبار سے اپنی ہمعصر شاعرات میں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔اُن کی شاعری ایک نئے ذائقے اور نئے طرزِ احساس کی شاعری ہے۔اُن کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ابتداء سے ہی اپنا ایک منفرد اسلوب اختیار کرلیا تھا جو اُن کی پہچان بن گیا۔یہی جدید اور منفرد لہجہ انھیں سب سے الگ کرتا ہے۔

انھیں اعلیٰ شاعری کا ملکہ حاصل تھا۔جذبے کی سچائی اور حرارت خیالات کی تازگی اپج،زبان و بیان پر دسترس اور موضوعات کے تنوع سے اردو غزل کو نئی سمت اور نئی جہت عطا کی۔اُن کی شعری کائنات حسن و جمال سوز و گداز اور تہذیب و شائستگی سے مزین ہے۔ان کی غزل اردو کے شعری سرمائے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے جیسے اردو شاعری کی تاریخ میں مدتوں یاد کیا جائے گا۔

باب چہارم

پروین شاکر کی شاعری کی انفرادی خصوصیات

یہ باب پروین شاکر کی انفرادی خصوصیات کے جائزے سے متعلق ہے یہ جائزہ نظم نگاری اور غزل گوئی کی تاریخ کے حوالے سے ہے۔ پچھلے دو ابواب میں نظم نگاری اور غزل گوئی کی تاریخ کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے پھر بھی موضوع کے تسلسل کے اعتبار سے مختصراً خواتین کی شعر و ادب میں حصّہ داری کا ذکر ماضی کی تاریخ کے حوالے سے ضروری ہے۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں خصوصاً خواتین کی موجودگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ابتدائی دور سے لے کر کلاسیکی دور تک کوئی ایسا نام سامنے نہیں آتا جس کی شناخت قابلِ ذکر قرار دی جا سکے اس کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ پہلے کی عورت بہت زیادہ پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ آج کی نسبت پہلے کی خواتین کو اس قدر آزادی اور سہولیات بھی میسر نہیں تھیں ایسا نہیں کہ اس دور کی خواتین شعر و ادب اور علم و آگہی سے بے بہرہ تھیں بلکہ بہت سے پڑھے لکھے گھرانوں کی معزز خواتین شعر گوئی کا ذوق بھی رکھتی تھیں مگر اپنے نام کی تشہیر پسند نہیں کرتی تھیں کیونکہ تب عورت کا شعر و شاعری پر مائل ہونا بے حیائی اور عیب سمجھا جاتا تھا، خاندانی اور معاشرتی دباؤ کی وجہ سے اہل ذوق خواتین پردوں کے پیچھے گھٹن کی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ عورتوں کی طرف سے کتابوں اور رسالوں میں کچھ چھپنا تو دور کی بات تھی، ان

میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے احساسات کو لفظوں کی زبان میں بیان کرتیں کیونکہ شعر وشاعری کا تعلق عام طور پر طوائف اور بازاری عورتوں سے ہوتا تھا، لہٰذا معزز گھرانوں کی خواتین میں شعری ذوق کا پایا جانا معیوب گردانا جاتا تھا۔لیکن انیسویں صدی سے کچھ خواتین کے ہاتھ سے لکھے ہوئے عمدہ شعر منظرِ عام پر آئے ہیں لیکن افسوس کہ معاشرے کے مخصوص ذہنی رویئے کی بناء پر انھیں یا تو نظر انداز کیا گیا یا اُن کی کاوشیں دیگر ناموں سے منسوب کر دی گئیں جس طرح کہ 'بہارستانِ ناز' میں احمدی بیگم نامی شاعرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔اُن کے شوہر نے اُن کا دیوان جلا کر ختم کر ڈالا اور یہی صدمہ اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔اس طرح انھیں شہرت سے قبل ہی گمنامی کے اندھیروں میں دھکیل دیا گیا۔

خواتین کے شعری کارناموں کا ذکر کئی تذکروں میں موجود ہے سب سے پہلا تذکرہ مولوی عبدالکریم نے تذکرۃ النساء کے نام سے لکھا ہے جس میں خواتین کے شعری کارناموں کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ 'بہارستانِ ناز' مولف فصیح الدین رنج میرٹھی ۱۸۶۴، چمن انداز درگا پرشاد نادر ۱۸۷۸ء[1] وغیرہ تذکروں میں خواتین شاعرات کا ذکر ہے۔مگر تفصیل اور حوالے موجود نہیں ہیں۔ان خواتین میں سب سے پہلی شاعرہ اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے بڑی صاحبزادی زیب النساء مخفی تھیں جو بہت اہلِ علم و فضل خاتون مانی جاتی تھیں اگر چہ ان کا دیوان اب دستیاب نہیں ہے۔خواتین کی شاعری کے حوالے سے دوسرا نام میر تقی میر کی صاحب زادی بیگم کا ہے جنھیں شعری ملکہ فطری طور پر وراثت میں ملا ہوا تھا۔ان کی شاعری میں اس قدر بے حجابی دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ اس زمانے کے شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والی خاتون کے شعر ہیں۔نمونے کے طور پر ان کے دو اشعار:

---

[1] بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب

ے کچھ بے ادبی اور شبِ وصل نہیں کی
ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا
ے اتنا بھی غنیمت ہے تیری طرف سے ظالم
کھڑکی نہ رکھی روزنِ دیوار تو رکھا

ولی شاہ عالم کی اہلیہ اور مرزا باہر کی صاحب زادی جینا بیگم بھی شعر و شاعری سے گہرا شغف رکھتی تھیں ان کے اشعار ایک منجھے ہوئے عاشقانہ شعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ے آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسر
کیا جانئے کس ساعت پر آنکھ لگ گئی

ان کے علاوہ کاملہ بیگم بھی شاعری کرتی تھیں۔ ان کا صوفیانہ انداز قابلِ تعریف ہے۔

ے کہا منصور نے سولی پر چڑھ کر عشق بازوں سے
یہ اُس کے بام کا زینہ ہے آئے جس کا جی چاہے

جمعیت نام کی ایک عیسائی شاعرہ بھی بہت مشہور گزری ہیں۔ اختر نامی ایک شاعرہ جو تیمور خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اُن کی شاعری مذہبی رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔

ے دردِ عصیاں کے سبب سے تو مری جان چلی
اور بچنے کی نہیں سوجھتی تدبیر کوئی

مرزا علی خان کی اہلیہ ثریا کا بھی شعر و شاعری کے حوالے سے تذکرہ ملتا ہے۔ قدیم شاعرات میں مہ لقا بائی چنداؔ بھی کافی شہرت کی حامل ہیں انھیں پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انھوں نے اردو شاعرات کے پہلے تذکرے 'بہارستان ناز' سے پہلے ہی اپنا دیوان مرتب کر دیا تھا۔

ٹسوے بہا کے ہر گھڑی زاری نہیں ہے خوب
یہ رازِ عشق ہے اِسے مشہور مت کرو

ماضی کے ایوانِ ادب کی محرابوں میں کئی اور شمعیں جھلملا رہی ہیں جن میں منی بائی حجاب، نواب شاہ جہاں، بیگم شیرین ریاست بھوپال وغیرہ ہیں ان میں سے زیادہ تر کا تعلق بیگمات، شہزادیوں یا حرم کی کنیزوں سے ہوتا تھا۔ قدیم زمانے میں کچھ ہی خوش قسمت خواتین ایسی تھیں کہ جن کو اپنے خاندان سے اپنے ذوق کی بناء پر پذیرائی حاصل ہوتی رہی ورنہ تو زیادہ تر چھپ چھپا کر فرضی ناموں سے یا مردوں کے ناموں سے لکھتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان خواتین کے ہاں کھل کر اپنے جذبات و احساسات کی عکاسی کا رجحان بہت کم ہے۔ ان کی شاعری میں ایک تشنگی اور حجاب آمیز کیفیت پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود ان شاعرات کے تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ماضی میں شعر وادب سے دلچسپی اور تعلق صرف مردوں کا ہی میدان نہیں رہا بلکہ خواتین نے باوجود بہت سی بندشوں کے اس میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے گیسوے ادب کو سنوارا سدھارا اور اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی حیثیت منوانے کی تگ ودو میں حصّہ لیا۔

۱۸۵۷ء سے ہندوستان میں جدید دور کے آغاز کے ساتھ ہی عورت کو سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے تسلیم کرنے کا احساس پیدا ہونے لگا اور اس حوالے سے ادب میں عورت کی زندگی سے وابستہ مسائل کو موضوع بحث بنا کر منظرِ عام پر لایا گیا اس طرح عورت میں اپنی ذات کے حوالے سے فکر و شعور کو بیدار کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ سر سید احمد خان نے سماج میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت کے احساس کو اجاگر کیا۔ مولانا الطاف حسین حالؔی نے سماج میں عورت سے متعلق صنفی امتیازات روا رکھنے کے خلاف آواز اٹھائی اور سماج کی کئی ایسی بُری رسومات کی نشاندہی کی جن کی وجہ

سے عورت بہت زیادہ متاثر ہورہی تھی۔ حالؔی نے عورت کی تعلیم وتربیت، ذات پات اور کمسنی کی شادی اور بیوہ عورت کے مسائل پر اظہارِ خیال کیا۔ ترقی پسند تحریک کی بدولت سماج میں عورت کے روائتی تصور کے برخلاف چند مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں جن میں عورت کے مسائل کے ساتھ معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے زندگی کے ہر شعبے میں اُس کی برابر کی حصّہ داری بھی تھی۔

آزادی سے پہلے کی اردو شاعرات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر چہ اُس دور میں کئی خواتین کے ہاں اپنے عہد میں ہونے والی تبدیلیوں اور سماجی حالات کا گہرا اثر پایا جاتا ہے لیکن اکثر نے اپنے عہد کے مروجہ رجحانات کی پیروی کر کے تقلیدی انداز اختیار کیا۔ بہت کم خواتین ایسی ہیں کہ جن کے ہاں اپنا کوئی الگ رنگ ہو، یا انھوں نے اپنی کوئی الگ شناخت قائم کی ہو، اکثر کے ہاں اس دور کے مشہور شعراء کے رنگِ کلام سے استفادہ کرنے کا رجحان عام ہے۔ بقول نورالحسن ہاشمی:

> ''کوئی اقبال کی پیروی کرتی ہے تو کسی نے جلیل اور حسرت کے رنگ کو اختیار کیا ہے، کسی نے فانی اور یگانہ کے نقشِ قدم کو رہبر بنایا ہے تو کوئی جگر، سیماب کے طریقے کو پسند کرتی ہے کوئی فراقؔ اور اخترؔ کی شاعری سے متاثر ہے تو کوئی جوشؔ اور ساغر کی ہمنوا ہے۔[1]

ماضی کی شعری روایت کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پہلے غزل صرف مردانہ طرزِ احساس کی نمائندگی کے طور پر جانی جاتی تھی جس میں عورت صرف معشوقہ تھی اور اس میں صرف اس کے حسن و جمال کا اظہار کیا جاتا تھا اور عورت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے لیکن جدید شعری رجحان عورت کے اس روائتی روپ کی یکسر نفی کرتا ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ

---

[1] رسالہ ہمایوں مضمون 'پچیس سالہ اردو ادب میں خواتین کا حصّہ' ص:۹۳

آزادی سے پہلے کی جدوجہد میں خواتین نے بھی کافی اہم رول ادا کیا تھا بلکہ اس دور کی تحریکوں میں بھی سرگرم رہتی تھیں مگر ملک کی تقسیم اور فسادات کے موضوع پر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک خواتین کی کوئی شعری تخلیق سامنے نہیں آئی بلکہ اس موضوع پر خواتین کے یہاں جمود چھایا رہا۔ آزادی کے بعد زندگی کئی طرح کی انقلاب آمیز تبدیلیوں سے دوچار ہوئی تو زندگی کی ترجیحات بھی بہت حد تک بدل گئیں جس نے انسان کے فکر و خیال کے دھاروں کو بھی بدل ڈالا اور اس کا اظہار ادب میں ہونے لگا۔ اردو شعر و ادب کی ترقی میں مرد شعراء کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اس دوران ایک نئی تبدیلی یہ واقع ہوئی کہ آغاز میں خواتین شاعرات کے یہاں جو تقلیدی رنگ نمایاں تھا وہ آہستہ آہستہ مدہم ہو کر نسائی وجود کی شناخت کا وسیلہ بننا شروع ہو گیا۔ وقت و حالات کے تقاضوں نے ان کی سوچ اور فکر کے دھارے کو عورت کی زندگی اور اس سے وابستہ مسائل کے اظہار کی طرف موڑ دیا۔ عورت میں نہ صرف اپنے وجود کی اہمیت کا احساس شدید ہونے لگا بلکہ اس نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا بھی شروع کی۔ مرد اساس معاشرے میں عورت کی یہ کوششیں اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئے اضافے کا باعث بن گئیں۔ اس طرح باغیانہ رویے کا اظہار رواج پانے لگا۔ جدید شاعرات کا لب و لہجہ بغاوت کی بنیادوں پر استوار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت فکر و شعور کی دولت سے بہرہ ور ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتی ہے۔ اپنے گرد و پیش کو اپنے نظریے اور اپنے مشاہدے سے دیکھنا اور پرکھنا چاہتی ہے اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنا چاہتی ہے۔ وہ مرد کی طرح انا اور خودداری کے جوہر سے آراستہ ہے اور اپنی شناخت چاہتی ہے۔ یہ رویہ باغیانہ طرزِ احساس کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چند مثالیں:

ے میں نظر آؤں ہر ایک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں

ے در اگر بند ہوں تو یہ دیوار گرا ڈالے گا
دل کا سیلاب کناروں سے نکلنا چاہیے[1]

جب خواتین نے غزل سے اپنا رشتہ استوار کیا تو غزل میں ایک نیا انداز اور نیا رنگ پیدا ہو گیا۔ یہ نیا رنگ نسائی سوچ و فکر اور محسوسات کی صورت میں تھا یہ نسائی رنگ بہت سی شاعرات کے یہاں نمایاں ہے۔ان میں کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔لیکن میں ان چند شاعرات کا ذکر کروں گی جو نئے رجحان اور باغیانہ طرزِ احساس کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، زہرہ نگار، ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، شفیق فاطمہ شعریٰ، سکینہ ساجد، پنہاں، رابعہ سلطانہ، رفیعہ شبنم عابدی سارہ شگفتہ، کشور ناہید، پروین فنا سیّد، سیدہ حنا اور پروین شاکر شامل ہیں۔ ان شاعرات نے عورت کی نفسیات گھر آنگن کی زندگی لطیف جزبوں، خواہشوں دکھوں اور سکھوں کو موضوع بنایا اور ایک ایسی عورت کی نمائندگی کی جو خاندانی بندھنوں میں بندھ کر بھی جزباتی طور پر تنہا ہے۔ وہ رشتوں کے حوالے سے پہچانے جانے کی خواہش بھی رکھتی ہے۔ وہ عاشق بھی ہے اور محبوبہ بھی، ایسا بھی نہیں کہ یہ شاعرات بس گھر آنگن اور خوابوں خیالوں کی دنیا میں بھٹکتی رہیں بلکہ یہ خواتین اعلیٰ تعلیم اور فکر و شعور کی دولت سے بہرہ ور تھیں انھوں نے تانیثی شاعری کے حوالے سے مرد اجارہ داری والے معاشرے میں اپنی ایک منفرد پہچان قائم کی اور یہ ثابت کر دیا کہ عورت کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظر شعر و ادب کے جدید رجحانات، عالمی تغیرات اور فلسفیانہ افکار و نظریات پر بھی

---

[1] جدید غزل کی علامتیں، ص: ۱۷۷، ڈاکٹر نجمہ رحمانی ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۰۰۵ء

تھی۔اس لیے انھوں نے اپنے شعری تجربات میں پورے عہد کی ترجمانی کی حیات وکائنات کے مسائل وموضوعات کوایک نئی نظر سے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔

ان شاعرات میں پاکستانی خواتین اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور بے باکی اظہار کے لحاظ سے بہت آگے ہیں اور وہاں نسائی لب ولہجے کوزیادہ فروغ ملاہے۔جن میں پروین شاکرؔ کا نام نسوانی لب ولہجے اور بے باکانہ جرأتِ اظہار کی بدولت سب سے نمایاں ہے۔انھوں نے ادا جعفریؔ،زہرہ نگار، فہمیدہ ریاضؔ اور کشور ناہیدؔ کے شعری وفکری شعور سے متاثر ہوکراپنی شاعری کی ابتداء کی لیکن جلد ہی اپنے منفرد اسلوب وفکر کی بناء پر اپنے پیش روؤں کے جلائے ہوئے چراغوں کی لوکومزید قوت وتابنا کی عطا کرتی ہوئی ان سے بھی آگے نکل گئیں۔یہ الگ بات ہے کہ ان کے راستے کے کانٹے تو ان کی پیش روشاعرات نے چن لئے تھے اس لیے انھیں خوداس میدان میں کسی مزاحمت کا سامنانہیں کرنا پڑا جس کا اعتراف وہ اکثر وبیشتر کرتی رہی ہیں۔

یہاں پروین شاکرؔ کی انفرادی خصوصیات کے تذکرے سے غرض ہے۔ان کی شاعری میں بعض خصوصیات ایسی ہیں جوان کی پیش روشاعرات میں بھی پائی جاتی ہیں جس طرح کے ان کی شاعری کے موضوعات ہیں وہ نئے نہیں ہیں جیسا کہ خودان کا کہنا ہے کہ جوموضوعات میری شاعری میں پیش ہوئے ہیں وہ نئے نہیں ہیں بلکہ پہلے بھی کئی شاعرات ایسے موضوعات پرطبع آزمائی کرتی رہی ہیں لیکن یہ ہمارے اندر کا کہانی کار ہے جو ہر موضوع کو نئے رنگ وروپ اور نئے ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔بلاشبہ پروینؔ شاکر نے اپنے طرزِ اظہار کے لیے وہ رجحانات اور میلانات قبول کئے ہیں جو جدیدحسیت اور عہد جدید کی ذہنی بیداریوں کا ساتھ دے سکیں۔موضوعات کا اتنا تنوع پیش کش کا ایسا سلیقہ لفظوں کا ایسا عمدہ استعمال صرف پروین شاکر کے لیے ہی مخصوص ہوکررہ گیا ہے۔ان

کے سوچنے اور محسوس کرنے کا منفرد انداز جدت کاری لیے ہوئے ان کا لہجہ ان کی قوتِ اظہار ایسی خصوصیات ہیں جس نے روایت کے حسن میں اضافہ کیا ہے اور اسے نئی سمتیں عطا کی ہیں۔ وہ اپنی ہمعصر شاعرات کی طرح بھی نظر آتی ہیں۔ جنھوں نے تانیثی شاعری میں کچھ امتیاز حاصل کیا، اور ان سے منفرد بھی، روایت سے بھی تعلق برقرا ہے اور جدت کے افق بھی ان کے دسترس میں ہیں۔ بقول محسن احسان:

> ''وہ روائتی جادو سے بہک کر ابہام کے گرداب میں نہیں الجھتی بلکہ وہ قدامت کے گنبد سے نکل کر جدیدیت کے کشادہ صحن میں درآتی ہیں۔ تاکہ وہ جدید زندگی کے سجے سجائے ڈرائنگ روم کی بھرپور تصویر کشی کر سکے وہ اپنی عمر کے موسموں اور زندگی کے نشیب وفراز کی طرح شاعری میں چڑھائیوں اور ڈھلوانوں سے گزرتی نظرآتی ہے۔ اس کے کلام میں اس کی آواز اپنی ہمعصر شاعرات سے متاثر ہونے کا باوجود اس کی اپنی آواز ہے''۔[1]

غزل کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے اشعار واقعاتی نہیں ہوتے یعنی تخلیقی طور پر غزل میں وضاحتی بیانیہ کا انداز اختیار کرنا عیب سمجھا جاتا ہے کیونکہ غزل میں اشاروں، کنایوں میں بات کی جاتی ہے۔ اس لیے وضاحت کی گنجائش نہیں ہوتی کوئی بھی موضوع دو مصرعوں میں ہی تکمیل کے مراحل میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن پروین کے یہاں استعاراتی اسلوب تو ہے لیکن سادہ بیانی اختیار کر کے بھی انھوں نے موضوعاتی اور شعری اعتبار سے ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ غزلوں میں عام بول چال کی زبان استعمال کر کے بھی ان کے ہاں فکری اعتبار سے معنویت اور شعریت پائی جاتی ہے۔ سادہ الفاظ کا

---

1 مضمون پروین شاکر، ص: ۲۰۸، خوشبو کی ہمسفر ترتیب وتدوین ڈاکٹر سلطانہ بخش، لفظ لوگ پبلی کیشنز اسلام آباد

انتخاب کیا گیا ہے مگر غزل کی غنایت برقرار رہے۔ یہ مشکل کام ہے ناصر کاظمی اور افتخار عارف کے یہاں یہ انداز پایا جاتا ہے یعنی غزل کا آہنگ سادہ اسلوب کے ساتھ نغمگی لیے ہوئے ہے۔ اس طرح پروین کی غزل کی بحریں سادہ رواں اور موسیقیت سے مربوط ہیں۔ غزل کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں ریزہ خیالی ہو اور وحدتِ تاثر کا احساس پایا جائے۔ نفسیاتی تنقید کے زیر اثر اکثر نقاد غزلوں میں وحدت تاثر کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ارود شعراء کے یہاں سوائے چند ایک کو چھوڑ کر ایسی مثالیں بہت کم پائی جاتی ہیں کہ غزل مسلسل تاثیر کے اعتبار سے وحدت پر مبنی ہو۔ پروین کے یہاں زیادہ تر ایسی غزلیں پائی جاتی ہیں جن میں فکر و خیال کے اعتبار سے تسلسل پایا جاتا ہے اور ان میں وحدتِ تاثر جیسی خوبی کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

'خوشبو' اور 'کفِ آئینہ' سے نمونے کے طور پر چند مثالیں جن میں تازگی موزونیت، موسیقیت، غنائیت، تسلسل اور وحدتِ تاثر کی صفات پائی جاتی ہیں۔

ے
ہوا کی دھن پر بن کی ڈالی گائے
کوئل کوکے، جنگل کی ہریالی گائے
رُت وہ ہے جب کونپل کی خوشبو سُر مانگے
پروا کے ہمراہ عمریالی گائے
رات گئے میں بندیا کھوجنے جب بھی نکلوں
کنگن کھنکے اور کانوں کی بالی گائے[۱]

---

[۱] خوشبو، ص: ۲۴۶، بشمولہ ماہ تمام مراد پبلی کیشنز، اسلام آباد

؎ یہ چاند اور یہ ابرِ رواں گزرتا ہے
جمالِ شام تہہِ آسمان گزرتا ہے
؎ بھرا رہے تری خوشبو سے تیرا صحن چمن
بس ایک موسم عنبر فشاں گزرتا رہے
؎ خدا کرے تری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
دیارِ وقت سے تو شادماں گزرتا رہے[1]

پروین شاکر کی غزل کا اسلوب اور مخصوص آہنگ انھیں دیگر غزل گو شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی غزل میں روانی، ترنم، شگفتگی اور رعنائی جیسی ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ غزل کا ہر لفظ قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔

ان کے یہاں احتجاجی لب ولہجہ تو ہے جو ان کے منفرد سماجی اور اخلاقی شعور کا نتیجہ ہے لیکن پروین شاکر نعرہ بازی سے پرہیز کرتی ہیں ان کی شاعری جلسے جلوسوں کی شاعری نہیں ہے وہ جانتی ہیں کہ غزل میں تغزل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور تغزل کا معنی اب یہ نکالا جارہا ہے کہ زبان وبیان میں لطافت اور شیرینی ہونی چاہیے اس لیے پروین شاکر اپنی غزلوں میں تغزل کے اس تقاضے کو پورا کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ مزاحمتی رویے کا اظہار کرتی ہیں باتیں تو تلخ ہوتی ہیں مگر ان کو بیان کرنے کا اسلوب ولہجہ دھیما اور نرم وکومل ہی رہتا ہے۔ ان کا یہ رویہٗ فیض احمد فیض سے بہت حد تک مطابقت رکھتا ہے کہ شعر نعرہ بازی نہ بننے پائے اور فیضؔ مزاحمتی وسیاسی رویوں کے بیان میں بھی اظہار کے جمالیاتی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ جبکہ مزاحمتی شاعری میں جمیل

---

[1] کفِ آئینہ، ص:۱۱۴، مراد پبلی کیشنز اسلام آباد

جالبؔ بہت بلند و بانگ لہجہ اور درشت اسلوب اختیار کرتے ہیں جبکہ پروینؔ شاکر کے ہاں اسلوب کی شیرینی اور جمالیاتی شعوران کے اندازِ سخن میں ہمیشہ نمایاں رہتا ہے۔فیض احمد فیضؔ کی طرح ان کا احتجاجی انداز سماعتوں پرگراں نہیں گزرتا۔

ے حاکمِ شہر کے اطراف پہرہ ہے کہ اب
شہر کے دکھ اُسے موصول نہیں ہوسکتے

ے جنبشِ ابروئے شاہاں نہ سمجھنے والے
کسی دربار میں مقبول نہیں ہوسکتے[1]

ہاتھ تو کاٹ دیے کوزہ گروں کے ہم نے
معجزے کی وہی امید مگر چاک سے ہے [2]

جدید طرزِفکر رکھنے کے باوجود پروین شاکرؔ کی غزلوں میں مشرقی تہذیب وثقافت کی ترجمانی کا رجحان ملتا ہے۔ان کے یہاں شادی بیاہ کے حوالے سے برتی جانے والی رسومات کی عکاسی بھی کی گئی ہے اُن کی غزلوں میں مہندی، چوڑیاں، سرخ زرتار جوڑے، بندیا، موتیے کے گجرے، پائل، دھانی آنچل، سیج، دھانی بانکیں، کاجل، لالی، گھونگٹ، شگن کا پرندہ، کنگن، بالی، افشاں جیسے الفاظ اور استعاروں کے برتاؤ سے مشرقی تہذیبی روایات کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔وہ مخصوص رسم و رواج روایات واقدار جو برصغیر پاک و ہند میں صدیوں سے چلی آ رہی ہیں پروین شاکرؔ کی شعری فضاؤں میں جھلکتی نظر آتی ہیں۔مشرقی عورت کا ہارسنگھار نسوانیت اور حیا کا بانکپن اس نظم سے ظاہر ہوتا

---

1. انکار، ص:۸۷، ایم۔آر۔پبلی کیشنز، اشاعت ۲۰۱۱
2. ایضاً، ص:۱۳

ہے جو بعنواں ''گوری کرت سنگھار'' کے نام سے ہے اس میں جذبات اور لہجہ گیت کی طرز پر ہے۔

بال بال موتی چمکائے
روم روم مہکار
مانگ سندور کی سندرتا سے
چمکے چندن ہار
جوڑے میں جوہی کی بینی
بانہہ میں ہار سنگھار
کان میں جگ مگ بالی پتہ
گلے میں جگنو ہار
سبز کٹاراسی آنکھوں میں
کجرے کی دھار
گالوں کی سرخی میں جھلکے
ہردے کا اقرار

زبان و بیان پر دسترس کے لحاظ سے بھی وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں ان کے ہاں سادگی بھی ہے اور بے ساختگی بھی۔ لفظیات کا بہت عمدہ استعمال ان کے ہاں دکھائی دیتا ہے اور یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ جوشؔ کے بعد پروین شاکر ایسی شاعرہ ہیں جن کے یہاں لفظوں کا انتہائی خوبصورت، موزوں اور برجستہ استعمال ملتا ہے۔ لفظوں کا چابکدستانہ استعمال ان کے خیالات کو چار چاند لگا دیتا ہے اور ان کے خیالات کی دلکشی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ لفظیات

کے اعتبار سے بھی وہ جدید اور منفرد تھیں اگر چہ اردو شاعری میں استعمال ہونے والے روائیتی الفاظ و تراکیب بھی پروینؔ کی شاعری کا حصّہ بنے ہیں لیکن بہت منفرد انداز میں جنھیں پروین شاکر نے اپنے اچھوتے اور جاندار تخیل سے معنی کی نئ نئ جہتیں عطا کی ہیں مثلاً صدائے گریۂ شبنم، زخموں کے گلاب، یا تنہائی کو چاند کے نرم ہالے سے تشبیہہ دی ہے جس کی مثال پوری اردو شاعری میں ملنا مشکل ہے حالانکہ تنہائی کے لیے اماوس اور تاریکی جیسی تشبیہیں اور اصطلاحیں مروج ہیں۔ جس طرح فصیلِ شوق، شاخِ گریہ حرفِ تحریص، موجِ خواب، کے ساتھ نئ تراکیب مثلاً لہو سے فصل تارے چھاننے کی چشم پوشی کے التفات دستکیں دینے کا فن، ہجر کی تمہید، ہوا کا راہوار بننا، بانجھ منظر، خوابوں کی چاندنی، پھولوں کے چانداور تاروں کے گلاب چمپئ شامیں، مہندی کی باڑھ، ساعت دید کے عارض، تتلیوں کی سیماب پائی، کرن کے شجر، جگنوؤں کی سبک تابی شاخِ گل پر چاند کی صلیب، لہو میں چاند رچاتی خوشی، زخموں کی مہک، پتھر کی زباں، شفق عذرا سبز پتوں کی چھانجھن، قوس قزح کی پازیب وغیرہ الفاظ وتراکیب کے ذریعے پیکر اور تمثیلی انداز اختیار کرتی ہیں اور ان سے کام لینے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔ان کی شعری فضائیں جدید حسیت کی پروردہ ہیں اور غزل کے منظر نامے میں اضافے کا باعث بنی ہیں۔ پروین شاکر کی شاعری میں استعمال ہونے والے الفاظ وتراکیب میں معنی کے لحاظ سے وسعت، توانائی زندگی کی حرارت رنگارنگی اور حرکت وارتعاش پایا جاتا ہے۔ انھوں نے فطرت کے رنگوں، موسموں ہواؤں اور آبشاروں سے اپنی شاعری کا رشتہ استوار کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں تتلیوں پھولوں اور پرندوں کی چہچہاٹیں شامل ہوگئ ہیں۔ اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی پروین شاکر کی شاعری سے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

''میں نے اردو، پنجابی، انگریزی، فارسی اور کسی حد تک عربی شاعری کا مطالعہ کیا

ہے اور متعدد دیگر زبانوں کی شاعری کے انگریزی اور اردو تراجم پڑھے ہیں مگر میں نے آج تک پروین کی سی امیجری شاذ ہی دیکھی ہے کہ اس کے ہاں تو بادل کے ہاتھ کو تھام کر چلنے والی خوشبوئیں ہیں، سناٹوں کے تہہ خانے ہیں، کھڑکیوں پر چاند کی دستکیں ہیں، نکہتوں کے عکس ہیں۔ بچپن میں ساتھ کھیلی ہوئی برکھارتیں ہیں۔ فصلِ بہار کے پہلے گلاب کی ٹھنڈکیں ہیں، اشجار کی سبز پوش ہوتی ہوئی برہنگیاں ہیں، گھر کے دروازے پر رکھی ہوئی نرم ہوا کی ننھی ہتھیلیاں ہیں، اڑانوں کی گرمی سے اپنے پروں کو جلا لیتی ہوئی تتلیاں ہیں، ہوائے شام کے نمناک ہوتے ہوئے لہجے ہیں، اور شاخِ گل کی صلیبوں پر بالیوں کی طرح لٹکتے چاند ہیں اتنی پر جمال امیجری اگر اور بھی کہیں دستیاب ہے تو پھر میرا مطالعہ محدود ہے''۔[1]

پروین شاکر کو زبان و بیان پر جو دسترس حاصل ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک طرف تو وہ وضاحتی اور بیانیہ انداز اختیار کرتی ہیں تو دوسری طرف ایک ہی شعر میں کسی بھی واقعے یا تجربے اور احساس کو بیان کر دینے پر قادر ہیں جس طرح کہ غزل میں شعر کا ایک مصرعہ پوری کہانی کو اس کے تمام نشیب و فراز کے ساتھ واضح کر دیتا ہے اور شعر کا دوسرا مصرعہ پہلے مصرعے کی توضیح اس طرح کرتا ہے کہ ڈرامائیت منظر کشی اور جذبات نگاری کے اکثر تقاضے پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کی ایسی خصوصیت ہے جو بڑے بڑے قادر الکلام شعراء میں پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پروین شاکر کا یہ شعر اس بیان کی عکاسی کرتا ہے۔

---

[1] مضمون پروین کی 'خوشبو' احمد ندیم قاسمی

نوٹ: یہ تحریر 'خوشبو' کی افتتاحی تقریب منعقدہ کراچی میں پڑھی گئی تھی۔

ے کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

ے ریل کی سیٹی میں کیسی ہجر کی تمہید تھی
اس کو رخصت کر کے گھر لوٹے تو اندازہ ہوا[1]

ریل کی سیٹی میں ہجر کی تمہید سنائی دینا اس شعر میں ایک ایسے معنیاتی نظام کی تشکیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے کہ ریل گاڑی کی سیٹی سے اسٹیشن کی بھیڑ بھاڑ لوگ اور جدائی کے مناظر اور پھر گھر لوٹنے کے بعد شعری کردار کو اداسی وتنہائی سے واسطہ پڑتا ہے اور ویرانی کا منظر درپیش ہوتا ہے۔

نظموں میں بھی ایک ڈرامائی صورت حال کا احساس ہوتا ہے نظم کا آخری مصرعہ حیران کر دینے والی کیفیت پر مشتمل ہوتا ہے۔ بے شمار نظمیں اسی صورتحال کی عکاسی کرتی ہیں۔ جس کی مثالیں ایک چھوٹی سی نظم ''ایک کوہستانی المیہ'' اور I'll Miss You میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

I'll Miss You

جانے سے پہلے
اس نے میرے آنچل سے ایک فقرہ باندھ دیا

I'll Miss You

سارا سفر
خوشبو میں بسا رہا

ایک کوہستانی المیہ

بادل اتنے پاس

---

[1] خوشبو، ص: ۲۲۳

ہاتھ بڑھا کر چھولیں
پانی اتنی دور
ہاتھ کٹا کر بھی
کچھ ہاتھ نہ آئے [1]

انسانی زندگی اور انسانی نفسیات کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو پروین شاکر کے قلم سے سے ان چھوار ہا ہو۔

پروین شاکر انسانی فطرت کا گہرا شعور رکھتی ہیں۔ فطرتِ انسانی کے گمنام گوشوں میں جھانک کر گوہر مقصود ڈھونڈ نکالتی ہیں انسانی فطرت کے ان پہلوؤں اور نفسیاتی کیفیات کی عکاسی اتنی باریک بینی نفاست اور خوبصورتی سے کرتی ہیں جو صرف انسانی محسوسات کا حصّہ ہوتی ہیں اور اشعار کا موضوع کم ہی بنتی ہیں مثلاً

ے تیری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
میرا تن مور بن کر ناچتا ہے

ے جگنوؤں کی شمعیں بھی راستے میں روشن ہیں
سانپ ہی نہیں ہوتے ذات کی گپھاؤں میں

ے ہاتھ میرے پھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند مجھ پر جب سے اس گھر کا دروازہ ہوا

اپنے پندار کے ٹوٹنے کا اعتراف بہت خوبصورت سے انداز میں کیا گیا ہے جس میں بے بسی، حرماں نصیبی اور جذبات کی مرقع نگاری کی گئی ہے۔

---

1. صد برگ، ص:۷۳، ایم۔ار۔ پبلی کیشنز دہلی

ایک لڑکی کی اندرونی کشمکش اور نفسیاتی کیفیت کی پیچیدگی کا اظہار اس طرح سے ایک شعر میں بیان کر دیتی ہیں کہ ساری کہانی اپنے آغاز اور انجام سمیت منظرِ عام پر آجاتی ہے۔

ے اس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح[1]

اور کبھی تو پروین نفسیاتی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے خود اپنی ذات کی ہی کولمبس بن جاتی ہیں اور ذات کے نہاں خانوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے دکھوں کو ہنسی کے پردے میں چھپانے کا ہنر بھی حاصل کر لیتی ہیں۔

ے تکلیف تو ہوئی، مگر اسے ناخنِ ملال
کھلنے لگی گرہ بھی کوئی اپنی ذات کی

ے نہ قرض ناخنِ گل، نام کولوں
ہوا ہوں، اپنی گرہیں آپ کھولوں

ے ہنسی کو اپنی سن کے ایک بار میں بھی چونک اٹھی
یہ مجھ میں دکھ چھپانے کا کمال کیسے آ گیا

پروین شاکر کی شاعری کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی روائتی شاعری میں استعمال ہونے والے موضوعات تشبیہہ و استعارات کو جدت کے پیراہن سے آراستہ کیا ہے جس طرح گل اور دستِ صبا کے استعارے عام طور پر اردو شاعری میں استعمال ہوتے رہے ہیں لیکن پروین کے یہاں یہی استعارے ایک نئی معنوی گہرائی کے ساتھ سامنے آتے ہیں جس میں انسانی نفسیات کی

---

1. انکار، ص: ۵۳، ایم۔آر۔ پبلی کیشنز نئی دہلی

کچھ گرہیں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

؎ اِک حجاب تہہ اقرار ہے مانع ورنہ
گل کو معلوم ہے، کیا دستِ صبا چاہتا ہے

یعنی گل، دست صبا کی خواہش سے واقف ہے اور خواہش کی تکمیل بھی کرنا چاہتا ہے مگر اقرار حجاب کے فطری تقاضوں سے مجبور ہے۔ ایک اور شعر میں گل کا استعارہ ملاحظہ ہو۔

؎ پذیرائی کو میری، شہرِ گل میں
صبا کے ہاتھ میں پتھر رہا ہے

ایک لفظ خانہ جنگی پروین کے یہاں بہت عمدگی سے شاعری کا حصّہ بنا ہے یہ لفظ نثر میں استعمال ہوتا آیا ہے البتہ شاعری میں شیکسپیئر نے سب سے پہلے اسے استعمال کیا ہے اور اب پروین نے بڑی عمدگی کے ساتھ اپنی اندرونی کشمکش کے اظہار کے لیے غزل کے اشعار میں اسے جگہ دی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ شیکسپیئر کو پڑھنے کے بعد ہی پروین نے اس لفظ سے استفادہ کیا ہو۔ شیکسپیئر کے ہاں "Civil War" کا لفظ اندرونی کشمکش کے اظہار کے لیے استعمال ہوا ہے۔

؎ اک عمر ہوئی ہے خود سے لڑتے لڑتے
اندر سے تمام تھک رہی ہوں

؎ دل اُسے چاہے جس عقل نہیں چاہتی
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے

؎ مدتوں بعد اُس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
منصب دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کردیا

پروین شاکر کا یہ شعر نسائی معصومیت کا اظہار ہے۔ محبوب کا ایک عرصے کے بعد گلہ کرنے کو منصب دلبری پہ بحال ہونے کا اعزاز ٹھہرایا ہے یہ ان کے سوچنے کا منفرد اور درون بین انداز ہے جو ان کے ہمعصروں میں کہیں کہیں موجود تو ہے مگر اس انداز سے نہیں ہے۔

ے تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

اس شعر میں فیصلوں کے ریشم کا الجھنا ایک نئی اور خوبصورت امیجری ہے جبکہ پہلے مصرع میں اپنی انا کی کشمکش کا اظہار کیا ہے۔

خوشبو کی طرح چاند کا استعارہ بھی ان کی شاعری میں بہت زیادہ استعمال ہوا ہے خاص طور پر ان کی پہلی کتاب ''خوشبو'' میں جس طرح ابن انشآء کے ہاں ''چاند نگر'' میں چاند کی علامات شیلے کے تصورِ مہتاب سے کافی حد تک مطابقت رکھتی ہیں اور پروین شاکر شیلے سے کافی متاثر رہی ہیں اور ابن انشاء کا بھی کچھ اثر ان کی شاعری پر نظر آتا ہے خاص طور پر چاند، بطور علامت و استعارہ استعمال ہوا ہے۔ ان کی ہمعصر شاعرات کے یہاں یہ استعارہ اتنی زیادہ تکرار کے ساتھ دکھائی نہیں دیتا۔ چاند کی علامت کے ذریعے حق پرستوں اور سورج کی علامت کے ذریعے طاغوتی قوتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

ے روشنی آنکھ نے لی اور سرِ مژگان خیال
چاند وہ چمکے کہ سورج سے بجھائے نہ گئے

ے چاند اس کے نگر میں کیا رکا ہے
تارے بھی تمام ادھر ہی ٹھہرے

ے دمک رہا ہے ایک چاند سا جبیں پہ اب تلک
گریز پا محبتوں کا کوئی پل ٹھہر گیا!

؎ زمین کے حلقے سے نکلا تو چاند پچھتایا
کشش بچھانے لگا ہے ہر اگلا سیارہ

؎ چاند میری کروٹوں کا گواہ
میرے بستر کی ہر شکن کی طرح

؎ آنکھوں کے طویل رتجگوں پر
چاند آیا بھی تو گہن سمیٹے

؎ رات جب پھول کے رخسار پہ دھیرے سے جھکی
چاند نے جھک کر کہا، اور ذرا آہستہ

؎ چراغ ماہ لیے تجھ کو ڈھونڈتی گھر گھر
تمام رات میں یاقوت چن رہتی تھی مگر

؎ چاند چہروں کے فروزاں تھے کہ ناموں کے گلاب
شاخِ مژگان پہ مہکتے رہے یادوں کے گلاب[1] (خود کلامی)

نظموں میں بھی خوبصورتی محبت بلندی اور روشنی کی علامت کے طور پر 'چاند' کا لفظ استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔ نظم 'اسم' میں 'چاند' خوبصورتی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پروین شاکر کا منفرد اور البیلا اندازِ بیان ملاحظہ ہو۔

بہت پیار سے
بعد مدت کے

---

[1] خوشبو، ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی

جب سے کسی شخص نے چاند کہہ کر بلایا ہے
تب سے
اندھیروں کی خوگر نگاہوں کو
ہر روشنی اچھی لگنے لگی ہے![1]

دوسری نظم میں محبت کی شدت کے اظہار کے لیے' چاند' کا لفظ استعمال کر کے معنی ومفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔

شروع راتوں کا چاند تھا
پھر بھی
سارا باغ روشنی سے بھرا ہوا تھا
جیسے ہمارے دل
محبت سے[2]

شجر کا استعارہ جدید شعراء کے یہاں کافی استعمال ہوا ہے پروین شاکر نے سماجی اور ذاتی دونوں حوالوں سے شجر کے استعارے کا ذکر کیا ہے شجر ان کے ہاں زرخیزی، سایہ، آشیانہ، ٹھکانہ، آرام وسکون اور تحفظ کے حوالے سے ہے جبکہ پتھر کا استعارہ بے ضمیری بے حسی، تکلیف مذمت کے طور پر برتا گیا ہے۔

ے واں ڈھیر تھا پتھروں کا تیار
یاں پھول کی ایک پنکھڑی تھی

---

[1] صد برگ، ص:۵۳، ایم ار پبلی کیشنز نئی دہلی

[2] انکار، ص:۱۷۹

ہوا کو تشبیہہ، استعارہ اور محاروہ میں استعمال کرنے کی کوشش قدیم غزل گو شعراء کے ہاں ملتی ہے جبکہ جدید اردو شاعری میں 'ہوا' کو بطور علامت استعمال کرنے کا رجحان عام پایا جاتا ہے۔ ہوا کے داخلی خواص کو علامتی اظہار کا وسیلہ بنانے کی کوشش بہت سے شعراء کے یہاں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ ہوا کی مختلف تجسیمی صورتیں بھی وضع کی گئی ہیں جو زندگی کی مختلف حقیقتوں کو منظر عام پر لاتی ہیں۔ جدید نظم کے اولین شاعر تصدق حسین خالد کے ہاں 'ہوا' ایک ایسی غم زدہ عورت کے روپ میں نظر آتی ہے جس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور جو ادھر سے اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہے۔ ن م راشدؔ کی نظم ''تسلسل کے صحرا میں'' ہوا وقت کی علامت بن کر ابھری ہے۔ راشد نے اس نظم میں 'ہوا' کا نامیاتی رشتہ انسانی نفسیات سے جوڑ دیا ہے اور اُسے ایک ایسا لمحہ قرار دیا ہے جو مسلسل بھاگ رہا ہے۔

میراجیؔ کی شاعری میں ہوا نہ صرف حرکت کی علامت ہے بلکہ اساطیری حیثیت رکھتی ہے۔ ہوا جمود اور سکون کو توڑ کر حرکت پیدا کرتی ہے۔ اور ایک صحت مند و خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے۔

پروین شاکرؔ کی شاعری میں 'ہوا' کہیں کہیں اپنے اصلی معنی و مفہوم کے ساتھ سامنے آئی ہے ایک نظم ہمارے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا میں کہتی ہیں گویا ہوائے دشت کی مانند تو آزاد تھا یا انکار میں شامل غزل کا ایک شعر:

ہوائے تازہ میں پھر جسم و جان بسانے کا
دریچہ کھولیں کہ ہے وقت اس کے آنے کا

یا اس طرح سے ہوا مہک اٹھی، رنگ چمن بدلنے لگا اور کہیں کہیں ہوا کی تجسیمی صورتیں پروین کے یہاں نظر آتی ہیں۔

؎ پرندے سہمے ہوئے ہیں، درخت خوف زدہ
یہ کس ارادے سے گھر سے نکل رہی ہے ہوا
؎ یہ باغباں ہیں کہ گلچیں، ندیم یا صیاد
کہ ان سے ہاتھ ملاتے جھجھک رہی ہے ہوا
؎ یہ کون باغ میں خنجر بدست پھرتا ہے
یہ کس کے خوف سے چہرہ بدل رہی ہے ہوا
؎ بریدہ جانی پہ بھی شہر سانس لیتا ہے
بہت سے لوگوں کے دل میں کھٹک رہی ہے ہوا[1]

اس شعر میں سب سے پہلے جو منظر ابھرتا ہے وہ ایک ایسے شہر کا منظر ہے جو کٹا پھٹا ہے، گلا اور سڑا ہوا ہے تباہی و بربادی جس کا مقدر ٹھہری ہے لیکن اس کے باوجود وہ سانس لے رہا ہے اس طرح شہر کو محسوساتی پیکر میں ڈھالا گیا ہے جو زندہ رہنے کی کوشش میں ہے۔ لیکن اس کے بعد طنزیہ اور شکایتی لہجہ در آتا ہے جو شر پسندوں اور استحصالی قوتوں کے لیے ہے کہ جو عناصر 'ہوا' کو ناپسند کر رہے ہیں کیونکہ ہوا ہی بریدہ جاں، شہر کے زندہ رہنے اور سانس لینے کا سبب بنی ہوئی ہے۔ اور یہ نام نہاد طاقتیں شہر کے در پہ آزاد ہیں اس لیے 'ہوا' ان کے دل میں کھٹک رہی ہے۔ جبکہ ان دو اشعار میں 'ہوا' خوشخبری پیغام رسانی کا ذریعہ تازگی و زرخیزی کا استعارہ ہے۔

؎ خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ رستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اس کا سراغ ہے

---

[1] 'کفِ آئینہ'، ص: ۵۶۔۵۷، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی

ے　　ہوا چلی تو نئی بارشیں بھی ساتھ آئیں
زمین کے چہرے پہ آیا نکھار کا موسم

ایک اور شعر میں 'ہوا' دستِ قاتل کی صورت میں سامنے آتی ہے جو اپنے خونی ہاتھوں سے لوگوں کے سر کاٹنے کا شوق رکھتی ہے۔

ے　　دستِ ہوا نے جیسے درانتی سنبھال لی
اب کے سروں کی فصل سے کھلیان پٹ گے

پہلے اردو شاعری مردوں کے جذبات واحساسات اور انہی کے دل کی حکائیتوں کے بیان تک محدود تھی۔ ہندی شاعری کی روایت کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہاں عشقیہ جزبات کا اظہار عورت کی زبان سے ہوتا آیا ہے مگر اس کے خالق زیادہ تر مرد ہی رہے ہیں۔لہٰذا عشقیہ شاعری صرف مردوں کی چیز بن کر رہ گئی تھی۔لیکن پروینؔ شاکر نے اردو شاعری میں ایک نئی روایت قائم کی انھوں نے نسائی بصیرت کے ساتھ نسوانی جزبات ومحسوسات کو اپنی شاعری میں سمو کر اسے ایک انوکھا رنگ وروپ عطا کیا جہاں عورت عاشق ہے اور مرد محبوب، اس طرح اردو شاعری نسوانی دھڑکنوں اور بسنتی جزبوں، حنائی لہجوں کی ترجمان بن گئی۔

پروین شاکر کی شاعری میں ہندی گیتوں کی فضا، بانکپن، اور ہندی لب و لہجے کی چاشنی کی گھلاوٹ بھی پائی جاتی ہے۔ یہ چیز پہلی مرتبہ اردو شاعری میں ان کے توسط سے آئی ہے۔ جو اُن کی ہمعصر مشاعرات کے یہاں دکھائی نہیں دیتی اس کی واضح مثال 'نظم' جبکہ دوسری 'شام میں توری گیاں چراؤں' اور 'اے جگ کے رنگریز' میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ نظم جذبات واحساسات لب و لہجے اور فضا کے اعتبار سے گیت کے قریب ہے جس میں شام اور رادھا کی آپسی چھیڑ چھاڑ سے عشق

ومحبت کا اظہار اسی تناظر سے کیا گیا ہے۔ پریم جل، شام، رادھا گوپیوں، رچنا، کنھیا، مرلی جیسے الفاظ جہاں ایک طرف ہندی زبان و بیان سے ان کی واقفیت کو ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف گیتوں کی ایسی فضا مزین ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جس میں شام اور رادھا کا قصہ اپنے تمام مبادیات ومتعلقات کے ساتھ ایک خوشگوار کیفیت کے احساس سے قاری پر واضح ہو جاتا ہے۔

رنگ ڈالی مری آتما تک
کیا منوہر کے من میں سمائی
میں نے سکھیوں کو کب کچھ بتایا
بیری پائل نے ہی جالگائی
گوپیوں سے بھی کھیلیں کنھیا
اور ہم سے بھی میٹھی لڑائی
کرشن گوپال رستہ ہی بھولے
رادھا پیاری تو سدھ بھول آئی

جبکہ دوسری مثال 'کفِ آئینہ' کی نظم میں ملتی ہے۔ جس میں منوہر کے سامنے اپنی جیون تھالی میں جلے ہوئے سپنوں کے تٹ، مانگ کی راکھ اور اپنی سمپورن پیاس کا ذکر کرتی ہیں اور آخر میں اپنی آتما کو منوہر کے چرنوں پہ دان کرنے کا عزم لیے ہوئے نظر آتی ہیں۔ گیت کے لیے روائتی طور پر زبان کے جس لوچ اور نرمی گھلاوٹ کی ضرورت ہوتی ہے وہ پروین شاکر کے یہاں پائی جاتی ہے۔ عشقیہ آہنگ کی حامل بعض غزلیں اور نظمیں گیت کے لہجے اور لفظیات کے قریب ہوگئی ہیں جو ایک خاص کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ پروین شاکر کی شاعری جدید دُور کی آواز ہے جو جدید دور کے تقاضوں سے

پوری طرح ہم آہنگ ہے۔اس میں شوخی بھی ہے اور سنجیدگی بھی محرومی بھی ہے اور محبت بھی۔سرکشی کے ساتھ خودسپردگی کا احساس بھی پایا جاتا ہے نئی نسل کے ذہنی رویوں کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور نسائی جذبوں کا اظہار بھی ہوتا ہے۔انھوں نے غزل کی ہیت کو توڑا ہے اور عورتوں کے لطیف جذبوں کے ساتھ ان کے نفسیاتی مسائل کی ترجمانی بھی کی ہے۔جدید شاعری کی شعوری اور میکانکی مشکل پسندی اور علامت پرستی کے درمیان پروین شاکر کا اچھوتا محسوساتی استعارہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔اگر چہ پروین شاکر کے یہاں بھی کہیں کہیں علامتیں استعمال ہوئی ہیں لیکن ان علامتوں میں ابہام نہیں ہے بلکہ ان علامتوں میں چھپے ہوئے مفاہیم کو سمجھنا بہت آسان ہے۔کیونکہ وہ ابلاغ کی قائل ہیں۔ حالانکہ ان کی دیگر ہمعصر شاعرات کے یہاں علامتیں اور استعارے اتنے سادہ اور اتنے واضح نہیں ہیں۔لیکن پروین نے علامتوں اور استعاروں کو ان کا صحیح مقام عطا کیا ہے۔ان کی علامتیں سادہ ہوتے ہوئے بھی پرمعنی اور کئی جہتیں لیے ہوئے ہیں۔پروین شاکر نے تھکی ماندی غزل کو جاذبیت کا ایسا حسن عطا کیا ہے کہ اس کے ناز و انداز شیرینی وحلاوت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پروین شاکر دیگر شاعرات سے کافی آگے بڑھ گئی ہیں۔

پروین شاکر کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے خواتین کے جذبات ومحسوسات کا اظہار کھلے انداز میں کیا ہے اور اپنے آپ کو مردوں کے مدِ مقابل رکھنے کے ساتھ ساتھ عورت اور مرد کے درمیان نبھاہ کے رشتے کو بھی ترجیح دی ہے۔ان کے ہاں شوہر پرستی کے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ مشرقی خواتین کے لیے شوہر مجازی خدا کی حیثیت رکھتا ہے۔شوہر کی محبت بھری نظر ہی مشرقی عورت کی زندگی کی بہت بڑی متاع ہوتی ہے جو اُسے جینے کا سلیقہ عطا کرتی ہے۔ دوسری طرف وہ مرد اور عورت کے رشتے میں برابری اور مساوات کی بھی قائل ہیں عشق ومحبت کے معاملات ہوں یا زندگی

کے دیگر مراحل میں حقوق وفرائض کی بات ہو اس حوالے سے ان کا رویہ یکساں ہے۔ پروین شاکر کے یہاں خود سپردگی اطاعت وفرمانبرداری کا انداز ملاحظہ کریں۔ نظم 'واٹرلو' سے ایک مثال:

وہ مغرور سی تیکھی لڑکی
عام سے آنکھیں، عام سے بالوں والی
اک اکھڑ پھر پردیسی کے آگے
دو زانو بیٹھی
اس کے بوٹ کے تسمے کھول رہی ہے (خوشبو)

پروین شاکر کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں ہی مختلف اور متضاد خصوصیات کا مجموعہ ہیں ایک طرف تو ان کے یہاں احتجاج، بے باکی اور بغاوت کے عناصر ملتے ہیں تو دوسری جانب خالص مشرقی اقداری نظام (Value System) کے حوالے سے شرم وحیا، وفاداری، سپردگی اور مصالحت کے جذبات بھی ملتے ہیں۔ پروین شاکر کے بارے میں بعض غلط نتائج بھی اخذ کیے جاتے ہیں۔ تانیثیت کا ذکر کرتے ہوئے عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ تانیثی شاعری کا مقصد ہی مرد اساس معاشرہ اور مردوں کی مخالفت کرتا ہے۔ کشور ناہید اور فہمیدہ ریاضؔ کے یہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں لیکن پروین شاکر کی شاعری اور شخصی زندگی میں مرد اساس سماج اور مردوں کے احترام کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ پروینؔ شاکر نے اپنے ایک انٹرویو میں خود بھی کہا ہے جب ان سے گلزار جاوید نے ایک سوال کیا کہ پہلے باپ، پھر شوہر، عورت کی شناخت کے یہ حوالے توہین نسواں کے زمرے میں نہیں آتے؟ اور عورت کی آزادی سے متعلق آپ کی کیا رائے ہیں؟ اس پر پروین شاکر نے کہا:

ج: یہ تو بہت خوبصورت رشتے ہیں......ان میں توہین کا پہلو کہاں سے آ گیا۔

اس وقت تین مسلمان ملکوں کی وزرائے اعظم خواتین ہیں۔امریکہ میں کبھی عورت اس عہدے تک نہیں پہنچ سکی جبکہ ہمارا مذاق اڑایا جاتا ہے کہ ہم آزادیٔ نسواں کے خلاف ہیں۔

آزادی ذہن کی ہوتی ہے...... اور اتنی ہو کہ آپ اُسے سنبھال سکیں۔ پھر یہ کہ اس کی ایک سمت ہو، بے سمت آزادی صرف انارکی کی طرف لے جاتی ہے۔[1]

پروین کے یہاں مرد کے چار روپ موضوعِ بحث رہے ہیں جو باپ، بیٹا، بھائی اور محبوب کی صورت میں ہیں یہ چاروں روپ بہت کھل کر ان کی شاعری میں سامنے آئے ہیں۔عورت کی پہچان کے حوالے سے مرد کے چاروں روپ ان کے نزدیک بہت قابلِ احترام اور معتبر ہیں۔محبت، تحفظ اور قوت کی علامت ہیں جن کے بغیر عورت کی زندگی بے سائباں ہے وہ محبت کے معاملے میں مکمل اطاعت کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ پروینؔ شاکر کی شاعری میں مرد کا تصور کبھی تو دوست اور رفیقِ سفر کی صورت میں ہے کہیں اُسے 'مہربان بادل' کہتی ہیں اور کہیں 'سایہ دار شجر' اور چھتنار کے نام سے یاد کرتی ہیں اور کہیں زینتِ مہر و ماہ کہہ کر پکارتی ہیں۔ جبکہ بے وفائی اور سنگدلی تو اس کی وہ ازلی خصوصیات ہیں جو اردو کی شعری روایت کا حصّہ بن چکی ہیں۔ پروینؔ شاکر کے یہاں بھی محبوب کا تصور ستمگر کی حیثیت سے موجود ہے۔

اردو کے روائتی شعراء کے یہاں محبوب کا جو تصور ہے وہ تمام خوبیوں کا مجسمہ ہے وہ حسن میں بے مثال ہے۔جبکہ پروین کے یہاں محبوب کی خوبصورتی کا جو تصور ہے وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار ہے وہ گھنے بالوں، چمکتی بھوری آنکھوں اور دلنشین باتوں والا کوئی شہریار ہے۔کہیں تو وارث شاہ کے دیس کا رہنے والا گھنے گھنگھریالے بالوں والا شہزادہ ہے جس کا قد اونچا ہے ماتھا روشن ہے کڑیل

---

[1] روزنامہ جنگ، ۱۹۹۳، گلزار جاوید

جواں ہے جس کے ترشے ہوئے لبوں سے مہکتے دلنشین میٹھے بول نکلتے ہیں۔ جو اپنی بہادری وشجاعت کے لحاظ سے لاثانی ہے۔ نظم 'اک صدا پکارے جاتی ہے' کا آخری حصّہ ملاحظہ ہے۔

یوں چلتا ہے جیسے
زمین فقط اس کے قدموں کے لیے بنی ہے
کم کم بولنے
اور زیادہ دیکھنے والا
میرے چاروں جانب
اپنے وجود کی ونجلی بجائے جاتا ہے
اس سے ہزاروں کوس کی دوری پر بیٹھی ہوں
اور پھر بھی
اِک صدا پکارے جاتی ہے
میرے نام کو سانجھ سویرے
اِک تان بلائے جاتی ہے
مجھے پل پل تخت ہزارے [1]

روائتی غزل گو شعراء کی طرح پروین شاکر نے عشق ومحبت کی روائتی داستانوں کی تلمیح استعمال کر کے ان قصوں کو اپنی مبادیات ومتعلقات کے ساتھ واضح کیا ہے۔ جس طرح شیریں فرہاد کے ساتھ کوہکن اور ''جوئے شیر'' کا تصور ہے۔ ہیر رانجھا کے ساتھ وارث شاہ کا دیس اور تخت ہزارے سے تعلق جاگ

---

[1] خودکلامی، ص: ۱۵۰، ماہ تمام مراد پبلی کیشنز، اسلام آباد

اٹھتا ہے جبکہ سوہنی مہیوال جیسی لوک داستان سے دریا اور کچے گھڑے کی کہانی مشہور ہے۔

؎ طوفاں ہے تو کیا غم مجھے آواز تو دیجیے
کیا آپ بھول گئے میرے کچے گھڑے

ماضی میں اردو شاعرات کی طویل فہرست میں بہت سی اچھا لکھنے والیاں بھی ہیں جو اپنی شاعری کے حوالے سے ایک معتبر نام رکھتی ہیں لیکن ان میں سے اکثر نے وہی کہا جو ان کا محبوب سننا چاہتا ہے لیکن وہ بات نہیں کہہ سکیں جو خاتون ہونے کی حیثیت سے وہ کہنا چاہتی تھی۔ نسوانی جذبات کا شائستگی کے ساتھ بے محابہ اظہار پروین کے یہاں دکھائی دیتا ہے ان کی آواز پرانی آوازوں سے منفرد بھی ہے اور خالص نسوانی بھی۔ اردو شاعری میں اگرچہ نسوانی لب و لہجے کو ادا جعفریؔ نے متعارف کرایا لیکن اپنے وقت کے تقاضوں اور بندشوں کے سبب ان کا انداز کچھ ڈھکا چھپا تھا۔ کشور ناہیدؔ نے اس مزید جہتیں عطا کیں اور عورت کے جذبات کے بیان میں اس حد تک آگے بڑھ گئیں جو شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی نسوانی لہجہ فہمیدہؔ ریاض کے یہاں جارحانہ رنگ اختیار کر گیا لیکن نسوانی جذبوں کے بے باکانہ اظہار میں پروینؔ شاکر ایرانی شاعرہ فروغ فرخؔ زاد کی ہم مکتب دکھائی دیتی ہیں۔ فارسی کی جدید شاعری میں نسوانی جذبات کو زبان دینے کی جسارت فروغ فرخؔ زاد نے کی جس پر انھیں ملامت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان کی شاعری کا تار و پو عشق حسن اور زندگی کے رنگوں سے سجا ہوا ہے۔ جس میں سچائی اور خلوص کے ساتھ سوز و گداز آرزوئیں اور خواب ہیں یہ آرزوئیں اور خواب نہ صرف ان کے اپنے خواب ہیں بلکہ یہ تمام نسوانی دنیا کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اپنی شاعری کے موضوعات کے بارے میں خود کہتی ہیں۔

''وہ فراموش شدہ موجودات جو عورت کے نام سے ہمارے ملک میں زندگی بسر

کررہی ہیں ان کے دفاع کے لیے اٹھی ہوں اِس کے علاوہ میرے پاس موضوعات
کے بے شمار وسیع میدان ہیں، گہرے درد ہیں، زندگی کے چکنا چور کردینے والے
ان گنت دکھوں کے مقابلے میں میرے پاس شاعری کا دریچہ ہے''۔[1]

فروغ کی شاعری بھی پروین شاکر کی طرح احساساتی شاعری ہے۔ پہلا مجموعہ اسیر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جب وہ صرف سترہ سال کی تھیں یہ مجموعہ بھی خوشبو کی طرح کچی عمر کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتا ہے۔ دوسرا دیوار ۱۹۵۶ء میں جبکہ تیسرا 'عصیان' ۱۹۵۸ء میں اور چوتھا 'تولد دیگر' ہے۔ 'تولد دیگر' کے وقت ان کی شاعری کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں بھی ارتقائی صورتحال کا احساس ہوتا ہے ان کا فن بھی پختگی کی طرف اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ یعنی آغاز تو رومانیت سے ہوا بعد ازاں دیگر مسائل حیات ان کی شاعری میں داخل ہوئے۔ لیکن موت کے ظالم ہاتھوں نے اُسے روک دیا۔ تولدِ دیگر کی فروغ فارسی ادب کے شائقین کے دلوں پر ہمیشہ نقش رہے گی۔

فروغ کی نظمیں ''شب وہوس میں''، 'ہرجائی'، 'گناہ'، 'اسیر'، 'بوسہ' اور پروین شاکر کی نظمیں ایکٹیسی (Extacy) 'وصال' 'بدن کے موسم بے اختیاری میں' 'سپردگی، شہد اور شبنم اور 'آج کی رات' ایک سے لمحوں کی تخلیق اور ایک ہی کیفیات کی حامل ہیں جن کی مثالیں اردو اور فارسی شاعری میں پہلے کہیں نظر نہیں آتی ہیں۔ پروین کے یہاں جذبے اور روح کے ساتھ ساتھ جسم کی بھی اہمیت ہے وہ تمام جذبوں کا سچا اظہار چاہتی ہیں۔ فروغ نے بھی نسوانی جذبات کو چھپانے کے بدلے لفظوں کی زبان عطا کی وہ اس بات پر زنجیدہ ہیں کہ اگر مرد اپنے جذبات کا اظہار کرے تو اُسے تحسین وتعریف سے نوازا جائے مگر جب عورت اس رویے کا اظہار کرے تو معتوب ٹھہرائی جائے پروین شاکر کے

---

[1] فارسی ادب کے چند گوشے مصنف پروفیسر نور مسعود، ص: ۱۹

یہاں بھی کچھ اسی قسم کے احساسات کا اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے فروغ کے لیے خود کلامی میں ایک نظم بھی لکھی ہے جس میں مرداجارہ داری والے معاشرے پر طنز کے تیر برسائے ہیں اور عورت کی بے چارگی و مظلومیت واستحصال کو نمایاں کیا گیا ہے۔

مصاحب شاہ سے کہو کہ
فقیہہ اعظم بھی آج تصدیق کر گئے ہیں
کہ فصل، پھر سے گناہ گاروں کی پک گئی ہے
حضور کی جنبشِ نظر کے
تما جلاد منتظر ہیں
کہ کون سی حد جناب جاری کریں
تو تعمیل بند ہوگی
کہاں پر سر اور کہاں دستار اتارنا احسن العمل ہے
کہاں پہ ہاتھوں کہاں زبانوں کو قطع کیجیے
کہاں پر آسائشوں کی، بھوکوں کو مار دیجیے
کہاں پر نو سالہ بچیاں، چہل سالہ مردوں کے ساتھ
سنگین میں پرونے کا حکم ہوگا

پروین شاکر کی شاعری کی ایک اور خصوصیت اردو محاورات اور انگریزی الفاظ و محاورات کا استعمال ہے۔ پروین شاکر نے انگریزی الفاظ کو اس طرح اپنی شاعری میں فٹ کیا ہے کہ وہ اُسی کا حصّہ معلوم ہوتے ہیں اور ان سے شاعری میں بھاری پن کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اگر چہ اکبرالہ آبادی

کے زمانے سے ہی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں انگریزی لفظوں کا استعمال ہوتا رہا ہے لیکن سنجیدہ مضامین کے یے انگریزی لفظوں کا استعمال کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن پروین شاکر نے بہت خوش اسلوبی سے اسے نبھایا ہے اس طرح روز زرہ گفتگو کی طرح شاعری کو دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے انگریزی الفاظ بے تکلفی کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔

ہیں فون پہ کس کے ساتھ باتیں
اور ذہن کہاں بھٹک رہا ہے

انگریزی الفاظ غزل اور نظم دونوں میں ہی استعمال ہوئے ہیں۔

یاد تو ہوں گی وہ باتیں تجھے اب بھی
شیلف میں رکھی ہوئی بند کتابوں کی طرح

ایک وہ دور تھا جب طارق بن زیاد نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اسپین کو فتح کیا تھا لیکن بعد میں مسلمانوں کی غفلت اور ناقص حکمت عملی کی بناء پر اسپین ان کے ہاتھ سے نکل گیا اسی واقعے کے تناظر میں پروین نے اسپین کی تلمیح استعمال کی ہے۔

اپنے اسپین کی خبر رکھنا
کشتیاں تم اگر جلاؤ کبھی

نیرو کی تلمیح سے بربادی اور تباہی کے منظر کو اجاگر کیا گیا ہے۔

پہلے یہ منظر پڑھا تھا صرف اب دیکھا بھی
بانسری بجتی رہی، جلتے رہے نیرو کے گھر

پروین شاکر شاعری کے فنی تقاضوں سے پوری طرح آگاہ ہیں اور انھیں ملحوظ رکھ کر شاعری کے حسن کو

دو بالا کرتی ہیں۔ آنکھ میں تل ہونا بے وفائی کی علامت ہے۔ یہ محاورہ ان کے ہاں استعمال ہوا ہے۔
اسی طرح سے رعایت لفظی کے استعمال سے بھی شعر کی دلکشی اور حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔

؎ کھلے گی اس نظر پر چشم تر آہستہ آہستہ
کیا جاتا ہے پانی میں سفر آہستہ آہستہ

اسی طرح سے ایک نظم ''فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ'' میں بھی رعایت لفظی کی مثال معنی کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔

دلآزاری بھی اِک فن ہے
اور کچھ لوگ تو
سارس زندگی اسی کی روٹی کھاتے ہیں
چاہے ان کا برج کوئی ہو
عقرب ہی لگتے ہیں[1]

اس کے علاوہ کچھ اشعار میں سہل ممتنع کا استعمال بھی شعر کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ سہل ممتنع کے حامل اشعار:

؎ ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے
اُس کا ہی قصور سارا کب تھا

کئی ایسے مضامین بھی ہیں جو پہلے اردو شاعری میں نہیں آئے ہیں اور جو ہر لحاظ سے منفرد اور مکمل ہیں سچائی اور حقیقت پر مبنی ہیں۔

---

[1] خود کلامی، ص:۱۰۸

؎ میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے
؎ لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا

بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں پروینؔ شاکر نے اپنی ذاتی زندگی کے کچھ پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے اور اس انداز میں کہ جس طرح کوئی اور نہیں کرتا ہے بے شک ان کی حقیقت پسندی ان کا اعتراف لاجواب ہے اور قابلِ تعریف بھی۔

؎ اپنی رسوائی، تیرے نام کا چرچہ دیکھوں
اِک ذرا شعر کہوں اور میں کیا کیا دیکھوں
؎ کیسے کہوں کہ اس نے چھوڑ دیا ہے مجھ کو
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

جبکہ ایک نظم میں اس طرح اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ مجھے بہت مدت کے بعد کسی نے چاند کہہ کر پکارا ہے میں جانتی ہوں کہ میں عمر کے اس ملگجے حصے میں ہوں کہ جب بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگیں لیکن مجھے پیار سے چاند کہہ کر بلانے والے دل چاہتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے تیری باتوں پر ایمان لے آؤں۔ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا احساس یا شوہر سے علیحدگی کے بعد اس بات کا اعتراف کرنا کہ یہ بات اگر چہ سچ بھی ہے مگر پھر بھی رسوائی کا باعث ہے۔

بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں نے ہمارے تمدن بلکہ پورے سماجی ڈھانچے کو تبدیلیوں سے ہمکنار کیا ہے زندگی کے ہر میدان میں جہاں جدت نظر آتی ہے وہاں شاعری کے پرانے رویوں

میں کچھ نئی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جس طرح پہلے وفا شعاری اور اطاعت گزاری کی صفت عورت کے لیے مخصوص تھی اب یہی صفات عورت مرد میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اردو شاعرات میں یہ رجحان بہت عام ہے کہ حسن و عشق کے معاملات کے بیان میں اپنی ذات کو اہمیت دی جائے پہلے جو توقعات مرد عورت سے وابستہ کرتا تھا اب عورت وہی کچھ مرد سے چاہتی ہے یہ رجحان نسائی شاعری کے بہت اہم رجحان کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ غیر مشروط وفاداری کی کئی شکلیں پروین شاکر کی شاعری میں ملتی ہیں جبکہ شاہدہ حسن اور کشور ناہید نے اس معاملے میں اپنی خودداری اور شناخت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

؎ جذبۂ عشق کی فراغدلی
تو جھکا تھا تو جھک گئی میں بھی
شاہدہ حسن

؎ وہ مرے پاؤں چھونے کو جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اُسے دیتی امیر ایسی تھی
پروین شاکر

؎ مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے
وہ میرے سب حوالے جانتا ہے
پروین شاکر

؎ میں بد ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
اس کو چاہوں تو خود اپنی خبر چاہوں
کشور ناہید

وقت کی تیز رفتاری اور جدت کی بناء پر بہت سی چیزیں ہم سے چھن رہی ہیں ہم اپنے ماضی اور اپنی اقدار و روایات سے آہستہ آہستہ کٹتے چلے جا رہے ہیں ہر نئی نسل نئے طور طریقوں اور نئی تہذیب کو کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے پرانی اقدار سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ پروینؔ کے یہاں اقدار اور رشتوں کے کمزور ہونے کی بناء پر ایک زیاں کا احساس بہت زیادہ ہے۔ وہ رشتوں کے احترام کے ساتھ ان کی مضبوطی اور پاکیزگی پر یقین رکھتی ہیں وہ جدیدیت کے ساتھ روایات کے حسن کو بھی قدر و قیمت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور روایات کی پاسداری و تحفظ کی خواہاں ہیں اور بہت منفرد سے انداز میں اس کا ذکر کرتی ہیں۔

ے وہ بھیڑ ہے کہ شہر میں چلنا محال ہے
انگلی پکڑنا باپ کی بچہ نہ بھول جائے
(کشور ناہید)

ے تین رتوں تک ماں جس کا رشتہ دیکھے
وہ بچہ چوتھے موسم میں کھو جائے
(پروین شاکر)

ے اس نسل کا ذہن کٹ رہا ہے
اگلوں نے کٹائے تھے فقط سر
(پروین شاکر)

پروینؔ نئی اور پرانی نسل کا موازنہ کرتی ہیں کہ ہمارے اباواجداد نے اپنی شناخت اپنے اقدار و روایات کی حفاظت کے لیے سروں کے نذرانے پیش کیے نئی نسل اپنی پہچان کی بقا کے احساس سے

عاری ہوتی جارہی ہے۔ دیگر مغربی اقوام کی اندھادھند تقلید میں اپنا تشخص کھوتی جارہی ہے۔اس کا احساس پروین شاکر کی شاعری میں بہت زیادہ ہے۔

تنہائی کا احساس ہمارے جدید دور کے انسان کا المیہ ہے باوجود اس کے کہ زندگی پہلے کی نسبت زیادہ تیز رفتار اور ہنگامہ خیز ہے پھر بھی آج کا انسان اپنی سوچوں اور خیالات کو دوسروں سے متصادم پاتا ہے اور کئی دیگر ایسے عوامل ہیں جن کی بناء پر آج کا انسان اپنی ذات میں تنہائی کے گنبد کا اسیر ہوکر رہ گیا ادب اس جدید دور کی پارہ پارہ کر دینے والی حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتا۔آزادی کے بعد شاعری میں یہ رجحان زیادہ واضح طور پر سامنے آیا ہے۔ جہاں تک پروین شاکر کی شاعری کا تعلق ہے۔ان کے ہاں بھی یہ احساس زیادہ نمایاں ہے وہ اپنے منفرد افکار وخیالات کی بناء پر اپنے آپ کو آج کے معاشرے کے رویوں اور سوچوں سے ہم آہنگ نہیں پاتی ہیں جس کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے جس طرح کہ ایک نظم ''مس فٹ'' بھی ہے اس کے علاوہ احساس تنہائی کے پس پردہ کچھ بنیادی عوامل بھی ہیں جن میں سے ایک یہ کہ شوہر علیحدگی کے بعد انھیں اپنے بیٹے کے ساتھ تنہا زندگی گزانی پڑی۔ بیرون ممالک پڑھنے اور پڑھانے کی خاطر یا پھر ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد میں تن تنہا رہنا پڑا ان کی شاعری میں غزلوں اور نظموں دونوں میں یہ احساس بہت عمدگی کے ساتھ اجاگر ہوا ہے۔کبھی تو چاند کو اپنی تنہائی کا گواہ بناتی ہیں۔انھیں ''چاند'' اپنے جیسا مقدر رکھنے والا دکھائی دیتا ہے کہ زمین پر مجھ جیسا تنہا کوئی نہیں مگر آسمان پر ''چاند'' تو ہے جو میری طرح سے تنہائی کا عذاب سہہ رہا ہے۔شاعرہ اپنی جدوجہد کو چاند کے سفر سے اور اپنی تنہائی کو چاند کی تنہائی کے مماثل قرار دیتی ہیں کیونکہ چاند کی طرح اپنی روشنی سے دنیا کو منور کرنا اور خود سفر میں رہنا ہی شاعرہ کا مقدر ٹھہرا ہے۔

اور کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ تنہائی کے کرب ووحشت سے ڈر کر خوابوں کی شیریں دنیا میں پناہ

لیتی ہیں لیکن آنکھ کھلنے پر تنہائی کے بے کراں صحرا بگولے اور خاک اڑاتے ہوئے ان کی نگاہوں کے سامنے کروٹیں لیتے ہیں شاعرہ اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتی ہیں۔ وہ دشتِ تنہائی سے ''رم آہو'' کی طرح بھاگ جانا چاہتی ہیں مگر بے سود اس کوشش میں وہ اپنے آپ کے لیے بھی اجنبی بن جاتی ہیں۔ تنہائی کے اسی شدید احساس کو واضح کرنے کے لیے پروینؔ شاکر نے نئی اصطلاحیں متعارف کروائی ہیں جس طرح کہ تنہائی کو ''ہشت پا یہ تنہائی'' کہا ہے یا دوسری اصطلاح تنہائی کے زہر سے نیلی پڑتی چٹانوں کے جسم ہیں پروینؔ شاکر کے یہاں بے شمار اشعار اسی احساس کی غمازی کرتے ہیں۔ پروین کے علاوہ ان کی دیگر ہمعصر شاعرات کے یہاں بھی اس موضوع پر بہت خوبصورت انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ یہ موضوع مرد شعراء کے یہاں بھی بیان ہوا ہے مگر خواتین کے یہاں اس کے محسوس کرنے کا انداز بالکل جداگانہ ہے کیونکہ عورت کے جذبات و محسوسات کی دنیا الگ ہے اس میں انفرادیت کی جھلک ہے۔ کیونکہ ان کا طرزِ احساس خالص نسوانی ہے اور لطافت و نزاکت ہے۔ فہمیدہ ریاض کی نظم ''اے والی رب کون و مکان'' سورہ یٰسین' آشا پربھارت کی نظم ''تنہائی'' ایک لامتناہی دنیا کا احساس جگاتی ہیں۔ جہاں وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے عرفان و آگہی کی نئی منزلوں کو چھونے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ ملاحظہ کریں اس موضوع پر مختلف شاعرات کے احساسات:

یہ ہنستی تنہائی، جسے شہر نجات ذات کہیں ؎
کس درد نے تم کو دکھلائی، کس زخم سے کس کے ہات ملی

ادا جعفری

ے شور بہت ہے بند دریچہ رہنے دو
مجھ کو میرے گھر میں تنہا رہنے دو

عشرت آفرین

ے میرے اطراف کی تنہائی میں
نیم بستہ فضائیں سانس لیتی ہیں
ے میرے سینے میں وہ آتش فروزاں ہے
جو ہر زندہ حقیقت کا مقدر ہے

نظم ’’آتشِ سیال‘‘ ساجدہ زیدی

جبکہ پروین شاکر کی ذات تنہائی کے بے کراں صحرا میں قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے۔

ے خود اپنے سے ملنے کا تو یارانہ تھا مجھ میں
میں بھیڑ میں گم ہوگئی تنہائی کے ڈر سے
ے نیند آجائے تو کیا محفلیں برپا دیکھوں
آنکھ کھل جائے تو تنہائی کا صحرا دیکھوں
ے میری وحشت رمِ آہو سے کہیں بڑھ کر تھی
جب مری ذات میں تنہائی کا صحرا اترا
ے اس شخص کی تنہائی کا اندازہ لگاؤ
اپنی ہی رفاقت سے جو محروم ہے لوگو

یہ سچ ہے کہ زندگی میں خوشی کے لمحات عارضی ہوتے ہیں ایک دم سے پر لگا کر اڑ جاتے ہیں جبکہ غم

واندوہ کا دورانیہ طویل ہو جاتا ہے غم کے بادل جب زندگی پر چھا جاتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وقت کی گردش ایک نقطے پر آ کر تھم سی گئی ہو۔ کیونکہ غم کی کیفیات ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں جو بھلائے نہیں بھولتیں غم انسانی وجود سے جڑی ہوئی ایک ایسی سچائی ہے جس سے انسان چاہتے ہوئے بھی دامن نہیں چھڑا سکتا انسان کا غم کے ساتھ ازل سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کشاکش حیات میں غم مختلف صورتوں میں انسان کا ساتھی بن کر رہا ہے کبھی ''غم عشق'' کی صورت میں اور کبھی ''غم روزگار'' کی شکل میں۔ اردو ادب خاص طور پر شاعری کا یہ ایک دیرینہ موضوع رہا ہے۔ شبلی نے کہا تھا کہ ہمارے سب سے زیادہ مسرت بخش اور طرب ناک نغمے وہی ہوتے ہیں جو اپنے دامن میں حسرت او رکرب کی سوغات لیے ہوتے ہیں۔ یہی بات ہمیں پروین شاکر شاعری میں نظر آتی ہے۔ زندگی کے حسن اور خوش رنگی کو چاہنے کے باوجود ان کے ہاں غم کی محفل بھی آراستہ و پیراستہ دیکھی جا سکتی ہے ان کے ہاں غم کی فراوانی ہے یہ غم ان کی ذات کا بھی ہے ملک وقوم اور انسانیت کا بھی حساس اور درد مند دل ہونے کے ناطے غموں سے رشتہ جوڑنا انھیں بہت بھاتا ہے۔ ان کی شاعری میں کئی ایسی ''رنج بھری شامیں'' ہیں جب وہ اپنے دکھتے ہوئے دل پر پھول کی مانند کسی کے حرفِ تسلی کی منتظر رہتی ہیں۔ لیکن ایک بے پایاں انتظار ان کا مقدر بنتا ہے۔ ملاحظہ کریں چند اشعار جن میں حجلۂ غم کچھ ایسے سجا ہوا ہے یقین ہی نہیں آتا کہ یہ خوشبو والی شاعرہ کے دل کا درد ہے۔ وہ خود اعتراف کرتی ہیں کہ قوتِ غم ہی انھیں سہارا دیے ہوئے ہے ورنہ تو ان کا بکھر کر سمٹنا مشکل تھا۔

ملے گی آنسوؤں سے تن کو ٹھنڈک ؎
بڑی لو ہے ذرا آنچل بھگو لوں

ے سب داغ بارشوں کی ہوا میں بجھتے رہے
بس دل کا ایک زخم پرانا عجیب تھا
ے بدلے جاتے ہیں یہاں روز طبیب
اور زخموں کی کہانی ہے وہی

ان کی ذاتی زندگی کا غم ازدواجی زندگی میں ناکامی کا پیش خیمہ ہے جس کی وجہ سے غم کی فضا اور غم کا احساس ان کی شاعری میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے جسے انھوں نے ہزاروں رنگ عطا کیے ہیں۔

ے آلودہ سخن بھی نہ ہونے دیا اُسے
ایسا بھی دکھ ملا جو کسی سے نہیں کہا
تیری خوش نامی کا آتا ہے بہت دل کو خیال
گریہ کرتے ہوئے آواز اگر کھینچتے ہیں
ے حجلۂ غم یونہی آراستہ ہے
دل کی پوشاک سہانی ہے وہی
ے کس طرح مری روح ہری کر گیا آخر
وہ زہر جسے جسم میں کھلتے نہیں دیکھا
ے مرا نوحہ کناں کوئی نہیں ہے
سو اپنے سوگ میں خود بال کھولوں
ے شہرِ غم دیکھ تری تاب دم خشک نہ ہو
راس آتا ہے اُسے دیدہ تر میں رہنا

زیست کے کڑے سفر میں جب باوجود کوشش کے وہ حسب توقع منزلِ مراد نہیں پاسکتیں تو تقدیر کے ستاروں اور بروج کی گردش کو الزام دیتی ہیں ناموافق فضاؤں کے باوجود ساحل مراد پر پہنچے کی آرزو میں ٹوٹی ہوئی کشتی پر بھروسہ کرنے کے بدلے اپنے نازک ہاتھوں کو پتوار بنا لیتی ہیں۔

؎ میں نے ہاتھوں کو ہی پتوار بنایا اور وہ
ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میرے کس کام کی تھی

تقدیر کی ستم ظریفیاں ستاروں اور ہاتھ کی لکیروں کو موردِ الزام ٹھہرانے کا باعث بنتی ہیں۔

؎ یوں حوصلہ دل نے ہارا کب تھا
سرطان مرا ستارہ کب تھا

؎ زنجیر ہے جزیرہ ہے یا شاخِ بے ثمر
اب کون سی لکیر سلامت ہے ہاتھ کی

''کفِ آئینہ'' کی ایک نظم میں یہی احساسات کارفرما ہیں۔

؎ میں کیسے کروں یہ درکشادہ
اس پر تو وہ قفل پڑچکا ہے
جس کے لیے سارے اسم بیکار
یہ میرے ستارے کی طرح ہے
تاریک اداس، غیر آباد[1]

---

[1] کفِ آئینہ،ص:۵۱، نیاز جہانگیر پرنٹرز، اردو بازار لاہور

دشمن ہے اور ساتھ رہے جان کی طرح

مجھ میں اتر گیا ہے وہ سرطان کی طرح

پروین شاکر کی شاعری کی ایک اور انفرادیت یہ ہے کہ ان کے ہاں ماضی کی روایت سے رشتہ بدستور ہے۔ ان کے ہاں روائتی قصے کہانیوں الف لیلوی قدیم داستانوں کی فضا پائی جاتی ہے۔ طلسماتی کہانیوں کے کردار اور طلسماتی فضا ''خوشبو سے کفِ آئینہ'' تک چھائی ملتی ہے۔ مغری ادب کی وسیع مطالعے اور مشاہدے کی بناء پر مغربی لوک کہانیوں کو بھی انھوں نے اپنے تخلیقی تجربوں کا حصّہ بنایا ہے جس طرح کہ ان کی نظم ''سنڈریلا'' ہے۔ دوسرے باب میں اس کا ذکر کیا گیا ہے ''بلوریں جام''، ''دہکتی سرخ مے'' دلوں کے وائلن پر والز کرتے دو بدن، رتھ، شیشے کی جوتی، شاہی محل وغیرہ مغربی لوک کہانیوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں پر سرار بستیاں ہیں جہاں اپنی ہی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے۔ جنگلوں میں جادو کے زیر اثر سوئے ہوئے محل ہیں۔ ان کے کردار بہار کی نرماہٹوں کے پالے ہوئے شہزادے شہزادیاں ہیں، غلام گردشیں ہیں۔ ان محلوں تک پہنچنے کے پراسرار راستے ہیں۔ پھولوں سے سجی راہداریاں ہیں۔ ویران باغ اور حوض ہیں ہوا سے باتیں کرتے اسپ تازی ہیں جن کے نسائی راکب ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود دیومالائی کہانیوں کے کرداروں کی ایک ایسی شہزادی ہیں جو جنگل میں واقع ایک پراسرار محل میں جادو کے اثر سے سوئی ہوئی ہے اور منتظر ہے کہ کوئی شہزادآئے اور اس کے جسم سے ساری سوئیاں نکال کر اس جادوئی فضا سے باہر نکال دے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے شہزادے کے ہاتھ اس وقت تھک جاتے ہیں جب صرف ایک سوئی باقی رہ جاتی ہے یا تعویذ والے ہاتھ مگر مچھ کے قبضے میں ہوتے ہیں وہ خود ایسی باہمت ہیں کہ جنگل کو از خود کاٹ لینے کا عزم کیے ہوئے ہیں مگر شہزادے کی منتظر ہیں کہ وہ ان کا نیند کا در آ کر

کھولنے کی جرأت تو کرے۔

ان کی شاعری میں جنگل کا استعارہ بہت زیادہ استعمال ہوا ہے جوان کو''منزلِ مراد'' تک رسائی حاصل کرنے میں ایک رکاوٹ کے طور پر حائل ہوتا ہے۔جنگل انسان کے اندر کا خوف بھی ہے جس نے آج کے دور کے انسان کے اندر بسرا کرلیا ہے۔موجودہ دور کا انسان چاہے جنگل سے خوف زدہ ہوکر کتنا ہی کیوں نہ بھاگے جنگل بے خبری میں اس کے اندر اتر آیا ہے۔

؎ خود بھی جنگل کو مجھے کاٹنا آجائے گا
پر وہ شہزادہ مری نیند کا در تو کھولے

؎ نکالی بھی گئیں تھیں سوئیاں کیا
کوئی تصدیق کرتا قصہ خواں سے

؎ بستیوں کی گونج پراسرار سی ہونے لگی
جیسے سناٹا پکارے شہر ناآباد کا

؎ اِک آسیب کے مکان میں ہوں
اور ردِ بلا نہیں ملتا۔۔۔۔

؎ پتھرایا ہے یوں دل کا کوئی اسم پڑھا جائے
اِک شہر نکلتا نہیں جادو کے اثر سے

پروین شاکر کی شاعری میں قدیم داستانوں کی نیم خفتہ شہزادی ہو یا مغربی لوک کہانیوں کی''سنڈریلا'' دونوں صورتوں میں کہانی کا اختتام اس طرح سے ہوتا ہے کہ اِس شعری کردار کے خواب تشنہ ہی رہتے ہیں۔اس کے پس منظر میں ان کی ذاتی زندگی کے سبب کچھ نفسیاتی عوامل کارفرما ہیں۔جس کی

وجہ سے انھیں ہر طرف سراب ہی سراب دکھائی دیتے ہیں۔

؎ عمر بھر کے لیے اب تو سوئی کی سوئی ہی معصوم شہزادیاں رہ گئیں
نیند چنتے ہوئے ہوتھ تھک گے وہ بھی جب آنکھ کی سوئیاں رہ گئیں

؎ شہر گل میں ہواؤں نے چاروں طرف اس قدر ریشمی جال پھیلا دے
تھرتھراتے پروں میں شکستہ اڑانیں سمیٹے ہوئے تتلیاں رہ گئیں

خوابوں کی شکست وریخت کا تجربہ ان کی بہت سی نظموں کا موضوع بنا ہے۔ یہ کیسا خلا ہے ''خواب اور مشورہ'' اور ''مجھے جان لینا چاہیے تھا'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔خوابوں کے بکھرنے کا المیہ اور بھی کئی نظموں میں دکھائی دیتا ہے جن میں نظم ''بائیسویں صلیب'' کا استعارہ مشکل یا غم کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔نظم ''مجھے جان لینا چاہیے تھا'' سے ایک بند:

تو وہ جا چکا تھا
اب میں ٹوٹے ہوئے پتوں میں
اپنے آنسو جمع کر رہی ہوں
مجھے جان لینا چاہیے تھا
کہ اس کا اور میرا ساتھ
موسم بہار تک ہے!

اس نظم کے شعری کردار کا خواب بہار سے شروع ہوتا ہے اور خزاں پر پہنچ کر بکھر جاتا ہے۔

پروین شاکر کی شاعری کی ایک اور خصوصیت مذہب اور مذہبی قدروں سے ان کی گہری وابستگی ہے چونکہ وہ ایک مذہبی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ان کے دادا اور چچا بہت بڑے عالم مانے

جاتے تھے۔ بچپن سے ہی انھیں مرثیے کی روایت سے آشنائی ہو چکی تھی ان کی نظموں میں یہی مذہبی رنگ نمایاں ہے۔ ''خوشبو'' کے علاوہ دیگر مجموعوں میں مذہبی موضوعات پر مشتمل نظموں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ'' میں پروین شاکر کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے کہتے ہیں:

> ''پروین شاکر کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں مذہب ہر وقت موجود رہتا تھا مگر اس نے اپنی اس فکر کو جو لباس عطا کیا ہے جو رنگ بھرا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ پڑھنے والا یہ محسوس ہی نہیں کرتا کہ وہ اپنے عقیدے کا اظہار کر رہی ہیں۔ لوگ اسے شعری استعارہ ہی سمجھتے ہیں اور شاعری کا بھرپور لطف لیتے ہیں''۔[1]

کربلا کا استعارہ نظموں کے ساتھ ان کی غزلوں میں بھی بہت استعمال ہوا ہے جو اپنے اندر معنی کی کئی جہتیں لیے ہوئے ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار:

ے پھر سے خیمے جلے ہیں اور سر شام
بین ہے اپنے اپنے وارث کا

ے اسیرِ کربلا جب یاد آئیں
کہاں لگتی ہے پھر زنجیر بھاری

بعض نظمیں تو ایسی ہیں جن میں کسی مذہبی عقیدے کو مدِ نظر رکھ کر رومانی خیال اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ساری نظم رومانی ہونے کے باوجود مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ''لیلۃ الشّک'' ایک استعاراتی نظم اس کی عمدہ مثال ہے۔ جبکہ دوسری نظم میں ''مدینۃ العلم'' کی تلمیح استعمال کر کے

---

[1] آج کل، ۱۹۸۵، مضمون ناظم جعفری، ص: ۱۲

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کے نزول کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اسلام سے پہلے عربوں کی جہالت کا ذکر کیا گیا ہے۔

''کفِ آئینہ'' میں امام حسینؓ کی شان میں خصوصی عقیدت کے اظہار کے لیے 'سلام' کا نذرانہ پیش کیا گیا ہے۔ کئی نظموں کے عنوانات کسی قرآنی آیت سے لیے گئے ہیں جس طرح ''فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ '' باقی نظم نگاری کے باب میں موضوع بحث بن چکے ہیں۔ نمونے کے طور پر سلام سے چند اشعار:

سلام

گرچہ لکھی تھی شہادت امام کی
لیکن مرے حسین نے حجت تمام کی

زینب کی بے ردائی نے سر میرا ڈھک دیا
آغازِ صبح نو ہوئی وہ شام، شام کی

دریا پہ تشنہ لب ہیں پہ صحرا میں شام کام
دنیا عجب ہے ان کے سفر اور قیام کی[1]

پروین شاکر کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی جدت طرازی ہے۔ اس میں زبان و بیان، تشبیہ و استعارات و محاورات کے علاوہ ان کے محسوس کرنے اور پیش کرنے کا انداز جدت سے ہم آہنگ ہے۔ خود کہتی ہیں۔

تصویر جب نئی ہے نیا کینوس بھی ہے
پھر طشتری میں رنگ پرانے نہ گھولیے

---

[1] کفِ آئینہ، ص: ۱۱۶، مراد پبلی کیشنز، اسلام آباد

پروینؔ شاکر کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تانیثی ادب میں ابھرنے والی احتجاج اور مزاحمت کی آوازوں میں ان کی آواز بالکل منفرد ہے یہاں مختصر طور پر خواتین کے احتجاجی رویوں کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ واضح کیا جاسکے کہ پروینؔ شاکر کی شاعری دیگر شاعرات کی نسبت لب و لہجے کے اعتبار سے کس حد تک انفرادیت کی حامل ہے۔ ان میں سب سے پہلے فہمیدہ ریاضؔ ہیں جنھیں فیضؔ کی طرح اپنے باغیانہ اور مزاحمتی لب و لہجے کی بناء پر جلاوطنی کے کرب سے گزرنا پڑا۔ فہمیدہؔ ریاض بہت تیز و تند لہجے میں عورت کی حق تلفی اور صنفی امتیاز روا رکھنے جانے کے خلاف احتجاج کرتی ہیں کبھی تو اُن کی ناراضگی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ خدا سے بھی اسی لہجے میں شکوہ کناں ہوتی ہیں۔

وہ اِک زنِ ناپاک ہے
بہتے لہو کی قید میں
گردش میں ماہ وسال کی
دہکی ہوس کی آگ میں
اپنی طلب کی چاہ میں
زائیدہ ابلیس تھی
چل دی اسی کی راہ میں
اس کے بدن کی شرم پر
تقدیس کا سایہ نہیں
لیکن خدائے بحر و بر!

فرمان تیرے سب روا
ہاں اسی زنِ ناپاک ہے
لب پر نہیں کوئی دعا
سر میں کوئی سجدہ نہیں[1]

جبکہ سلطانہ مہر مرد اساس معاشرے میں عورت کی کم مائیگی کا شدید احساس رکھتی ہیں وہ معاشرے میں عورت کی قابل رحم حالت دیکھ کر بہت آزردہ ہیں معاشرے کے ذی عزت افراد کی نظروں میں عورت کا کیا مقام ہے وہ بخوبی جانتی ہیں۔اس کی صحیح عکاسی سلطانہ مہر کی اس نظم سے ہوتی ہے۔

؎ زاہد کے لیے زہد کا تاوان ہے عورت
ملا کے لیے عیش کا سامان ہے عورت
فن کار یہ سمجھا ہے کہ گلدان ہے عورت
صوفی کا یہ کہنا ہے کہ شیطان ہے عورت[2]

جبکہ بلقیس فاطمہ عورت ذات کے دکھ درد کو بہت شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ان کا احتجاجی رویہ اور زبان و بیان کے لحاظ سے عورت کے اندرونی کرب کا عکاسی کرتا ہے۔ایک نظم ان کے بالیدہ فکری شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔''هُنَّ لِبَاسٌ لَکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ'' سے ایک بند:

اور وہ مجھ کو اتنا ہی دے جتنا وہ ٹھیک سمجھے

---

[1] اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے،ص:۳۴۷ ترتیب ڈاکٹر ارتضیٰ کریم،اردو اکادمی دہلی ۲۰۰۴

[2] ایضاً،ص:۳۴۶

میری حد، رات دن وہ بتائے مجھے
اور اپنے لیے کوئی حد ہی نہ رکھے
اسے سمیع بصیر علیم!
تیرا فرماں "اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ" ہے اپنی جگہ
اور میں ہوگی بے ردا
بے لباسی میری کس کے ہاتھوں ہوئی
میرا چہرہ خراشوں سے کیوں بھر گیا[1]

عزرا عباس کے یہاں احتجاج کی لے کافی تیز ہے وہ مرد اساس معاشرے کے خلاف کچھ کر دکھانے کے لیے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کھلنے کی منتظر ہیں تا کہ وہ اُس ظلم و جبر کا خاتمہ کر دیں جو عورت کے ساتھ صدیوں سے روا رکھا جاتا ہے۔"میری زنجیر کھول دی جائے" میں انہی خیالات کا اظہار ملتا ہے۔عزرا پروین کے یہاں احتجاجی لب ولہجہ شائستگی اور ادب کی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔

میں اس کتے میں مرد بھی چاہتی تھی
میں اُس مرد میں اِک باپ بھی چاہتی تھی
میں اُس باپ میں اِک بچہ بھی چاہتی تھی
میں اُس بچے میں ایک خدا بھی چاہتی تھی
مگر تم تو صرف اور صرف کتے تھے [2]

---

[1] اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے، ص:۲۴۱، ترتیب ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

[2] ایضاً، ص:۳۴۸

مندرجہ بالا خواتین کے احتجاجی رویوں کے سامنے جب ہم پروین شاکر کی شاعری میں مزاحمتی رویوں کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پروین شاکر کے یہاں ایک سوز ہے ایک کرب ہے دھیمی دھیمی آگ ہے جو وجود کو حرارت سے پگھلا رہی ہے۔ بظاہر ایک سمندر کی مانند پرسکون لیکن اندر کئی طوفان سمیٹے ہوئے شعر کی داخلی سطحیں بہت کچھ کہتی ہیں۔

ایک دفنائی ہوئی آواز، ایک معقول نکاح Lady of the house اور کئی دیگر نظمیں اس کی واضح مثالیں ہیں۔

مجھ پر کیا ترس کھانا
میرا کوئی آقا ہو
نام میں بھلا کیا ہے
اس کی دی ہوئی چھت کا
بوجھ مجھ کو ڈھونا تھا
اور عمر بھر میرا
یونہی صرف ہونا تھا[۱]

غزلوں میں دبا دبا سا احتجاجی رویہ ملاحظہ کریں

؎ رفاقتوں کا مری اُس کا دھیان کتنا تھا
زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا

؎ دکھ پہنچتا ہے بہت دل کو رویے سے ترے
اور مداوا ترے الفاظ کر نہیں سکتے

---

۱ ''ماہِ تمام''، صد برگ، ص:۲۴۶

؎ اندھیرے میں تھے جب تلک زمانہ سازگار تھا

چراغ کیا جلا دیا ہوا ہی اور ہوگئی

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پروینؔ شاکر کی شاعری خاص طور پر کچھ نظمیں پروین شاکر نے پاکستان کے دوہرے معیار والے معاشرے کے گہرے مشاہدے وتجربے کے بعد تحریر کی ہیں۔

یوں تو عورت کے ساتھ جبر واستحصال اگر چہ ہر دور میں اور ہر معاشرے میں مختلف صورتوں میں روا ہوتا آیا ہے اور اب بھی ہورہا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہاں پر بھی اگرچے حالات ویسے نہیں رہے ہیں پاکستانی خواتین زندگی کے ہر میدان میں مایۂ ناز کارنامے سرانجام دے رہی ہیں۔ مگر آج کے اس جدید دور میں بھی کئی دور دراز کے علاقوں اور کئی قبیلوں میں مردوں کی تنگ ذہنیت کے سبب عورت کے ساتھ صنفی امتیاز روارکھا جاتا ہے۔ وہ معاشرہ ذہنی افلاس اور پسماندگی کی انتہاؤں پر ہے جہاں عورت کی انا، خودداری اور عزتِ نفس کو پروان چڑھنے سے پہلے ہی کچل دیا جاتا ہے تاکہ کل کو وہ مرد کی جھوٹی انا، منافقت، خباثت اور دوغلی پالیسی جیسے حربوں کے سامنے سر نہ اٹھا سکے جس طرح کہ کچھ قبائلی علاقے ایسے ہیں خاص طور پر پٹھان قوم میں عورت خواہ کتنی ہی چھوٹی عمر ہی میں بیوہ کیوں نہ ہو جائے اُسے عقدِ ثانی کی اجازت نہیں دی جاتی۔ قبیلے کے نام نہاد ذی عزت شخصیات اسے اپنی تذلیل سمجھتے ہیں جبکہ مرد کئی بیویاں ایک ساتھ رکھنے پر قادر ہیں۔ اُن سے اُس کی کوئی بازپُرس نہیں ہوتی۔ سندھ پنجاب اور بلوچستان کے کئی علاقوں میں ''وڈیرے'' اور ''سردار'' اپنی بہن بیٹیوں کا رشتہ خاندان سے باہر اس لیے نہیں دیتے کیونکہ انھیں خدشہ رہتا ہے کہ اس طرح ان کی جائیداد خاندان سے باہر منتقل ہو جائے گی۔ خاندان میں ''بر'' نہ ملنے کی صورت میں کئی طرح کے اوچھے ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں مثلاً خاندان میں ہی کسی چھوٹے بچے کے ساتھ رشتہ طے کر دیا

جاتا ہے یا کوئی خاندان میں ذہنی مریض ہے اُس سے بیٹی بیاہ دی جاتی ہے لیکن یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ خاندانی جائیداد ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ غریب پٹھان لڑکیوں کو بوڑھے امیر آدمی اپنے سے نصف عمر کی لڑکیوں کو روپیوں کے عوض خرید کر اپنی عیاشانہ طبیعت کو تسکین بہم پہنچاتے ہیں۔

مذہب اور خاندانی عزت کے نام پر لڑکیاں چلتی پھرتی لاشیں بن کر رہ جاتی ہیں۔ میرے خیال سے جس معاشرے کی یہ صورتحال ہو وہاں پروین کی شاعری جہاد کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ پاکستانی معاشرے کے ترقی پسند ذہن کی نمائندگی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

محاکمہ

پی ایچ ڈی پروگرام کے تحت شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے مجھے اپنے مقالے کے لئے ''پروین شاکر کی شاعری'' کا موضوع دیا گیا تھا۔ میں نے پروین شاکر کی شخصیت اور شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اپنے نگراں اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اساتذہ کے مشورے سے تحقیق کے اصولوں کے مطابق اپنے مقالے کو درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے ۔ میں نے مذکورہ بالا موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھتے ہوئے پروین شاکر کی شاعری کے بارے میں جو خاص نتائج اخذ کئے ہیں اُن کی مختلف ابواب میں نشاندہی کی ہے جن کی تفصیل اس طرح سے ہے۔

باب اول پروین شاکر کی شخصیت کے جائزے سے متعلق ہے اس باب میں، میں نے پروین شاکر کی شخصیت کا مجموعی طور پر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ انسان کی شخصیت بہت سے رنگوں سے مل کر مرتب ہوتی ہے جس میں اُس کی عادات واطوار، مزاج، اردگرد کے لوگوں کے ساتھ رویہ اور اُس کی زندگی کے اہم حالات و واقعات شامل ہوتے ہیں سب مل کر اس ظاہر شخصیت کو سامنے لاتے ہیں جبکہ کسی فنکار کی شخصیت کے حقیقی خدوخال کی عکاسی اُس کی سوچ فکر اور اُس کے فن کے ذریعے ہوتی ہے اُس کی ذات کے داخلی عکس تک رسائی کیلئے فنکار کی سوچ وفکر کے ساتھ اُس کے فن سے بھی واقفیت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے اس باب میں میں نے پروین شاکر کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ پروین شاکر سادات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جہاں شعری وادبی ذوق کئی نسلوں سے چلا آ رہا تھا۔ آنکھ

کھولتے ہی ان کی شناسائی انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیوں کے توسط سے ردھم لے جذبے اور احساس سے ہوگئی۔اس لئے زبان کی وہ تہذیب جو شعوری کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ پروین شاکرؔ کو وراثت میں حاصل ہوگئی۔

ان کے بچپن کا دور اُن کے مختلف تعلیمی مراحل اور جن اساتذہ کرام سے انہوں نے اکتساب فیض حاصل کیا اُن میں مسز زاہدہ تقی اور مسز عرفانہ عزیز خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ یہ سب معلومات باب اول کی زینت بنی ہیں ۔ پروین شاکر کا ایک ابھرتی ہوئی شاعرہ کی حیثیت سے منظر عام پر آنا اس کے بعد اُن کی شادی شدہ زندگی کا احوال اور پھر ازدواجی زندگی کا خاتمہ اور اس کے اثرات جو ان کی شخصیت پر مرتسم ہوئے ان کا بھی تفصیلی ذکر کیا گیا ہے اُن کی زندگی کے اہم حالات و واقعات بیرون ممالک سفر اور وہاں پروین شاکر کی علمی و ادبی سرگرمیاں موضوع بحث بنی ہیں ۔ شعری دنیا میں وہ احمد ندیم قاسمی کے جریدے ''فنون کے ذریعے متعارف ہوئیں اور پھر شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگیں۔اُن کے چاروں مجموعے جو اُن کی حیات میں چھپے یہ سب تفصیلات اس باب میں موجود ہیں۔ پروین شاکر کے حالات زندگی کے تفصیلی مطالعے کے بعد جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ خوش شکل حساس اور نرم طبیعت کی مالک تھیں ۔اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں، دانشورانہ فکر و شعور سے بہرہ ور تھیں اُن کی خوبصورتی اُن کی ظاہری شکل وصورت تک محدود نہیں تھی بلکہ اُن کی شخصیت میں ایک شائستگی، وقار، دبدبہ اور رکھ رکھاؤ تھا جس کی وجہ سے لوگ خود بخود اُن کی طرف متوجہ ہوتے رہتے تھے وہ کم گو، بے نیاز اور منفرد سی شخصیت کی مالک تھیں۔کسٹم میں بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنے معاصر شعراء کا احترام کرتی تھیں اور دوستوں کیساتھ بہت ہمدرد اور شفیق تھیں۔ پروین شاکرؔ کے خطوط پڑھ کر اُن کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ وہ دردمندانہ دل

رکھتی تھیں۔ دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتی تھیں اُن کے کئی خطوط سے ظرافت وشگفتگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ البتہ ان کی طبیعت کی شوخی وشرارت وقت وحالات کی ناسازگاری کے سبب سنجیدگی اور اداسی میں بدل گئی تھی ایک ادھورے پن کا احساس، اداسی وکرب کی کیفیات اُن کی شخصیت میں شامل ہوگئی تھیں وہ اپنے ذاتی دکھ کو چھپانے میں ہمیشہ کامیاب رہیں اپنے بیٹے مراد (گیتو) سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ۱۹۹۴ء میں پروین شاکرؔ اسلام آباد میں کار کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوئیں اُس وقت سید مراد علی کی عمر پندرہ سال تھی۔ گیتو آجکل کنیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ سافٹ ویئر انجینئر ہیں۔

میرے اس مقالے کا دوسرا باب پروین شاکرؔ کی نظم نگاری سے متعلق ہے۔ اس کا پہلا حصہ ''اردو میں نظم نگاری کا منظر نامہ'' کے عنوان سے ہے۔ اِس میں اردو نظم نگاری کے آغاز وارتقاء کے مختلف مراحل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قدیم اور جدید نظم گو شعراء کا ذکر بھی خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اردو نظم نگاری کی روایت کے سلسلے میں نظیر اکبر آبادی کا نام نامی جدید شاعری کی تحریک کے پیش رووٴں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کی روایت سے ہٹ کر حسن وعشق اور گل وبلبل کے بجائے دنیا کی حقیقت اور بے ثباتی کو موضوع بنایا ''بنجارہ نامہ''، اور ''آدمی نامہ'' جیسی نظمیں لکھیں۔

نظیر اکبر آبادیؔ کے چوالیس سال بعد ایجوکیشن ڈائریکٹر کرنل ہالرائڈ کے ایماء پر محمد حسین آزادؔ نے انجمن پنجاب تشکیل دی جس کے ذریعے نظم کو فروغ حاصل ہوا۔ نظم کی ترقی وترویج کے مراحل نظیر اکبر آبادیؔ، حالیؔ، آزادؔ اوران کے رفقاء کے ذریعے طے ہوتے رہے۔ حالیؔ نے قوم کی اخلاقی حالت سنوارنے کے لئے نظم کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔ حالیؔ نے برکھا رت، نشاط اُمید، اورحب

الوطن جیسی نظمیں لکھیں جو انجمن کے جلسوں میں پڑھی گئیں۔اس کے علاوہ حالؔی نے ''چُپ کی داد، مناجات بیوہ'' اور شکوہ ہندوغیرہ جیسی نظمیں لکھیں۔

اس کے بعد بیسویں صدی کے شروع میں شبلی نے اصلاحی شاعری کے بدلے سیاسی نظمیں لکھیں اُن کی نظم ''طرابلس دہقان'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اسماعیل میرٹھی جونظم نگاری کے میدان کے چوتھے ستون مانے جاتے ہیں انہوں نے بچوں کے لئے لکھا۔انہوں نے بلینک ورس میں اردو نظموں کے ترجمے کئے۔

اسماعیل میرٹھی کے بعد اکبرالہ آبادی کا نام بھی بہت اہم ہے۔انہوں نے اپنی نظموں میں اُس دور کی برائیوں کے خلاف طنز و مزاح کا انداز اپنایا۔اکبرالہ آبادی کے عہد میں اردو کی نظمیہ شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے جن میں زیادہ تر شعراء، رومانی تحریک سے وابستہ تھے۔ انہوں نے آزادؔ اور حالؔی کی حب الوطنی کی روایت کو آگے بڑھایا اور سیاسی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ان میں ظفرعلی خان اور پنڈت برج نرائن چکبستؔ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جدید اردو نظم کا آغاز اقبالؔ سے ہوتا ہے، انہوں نے نظم کے موضوعات کو وسعت عطا کی اور نظم میں عمل اور خودی کا فلسفہ پیش کیا۔ جوش اور حفیظ اقبال کے اصلاحی رنگ میں رنگ گئے۔حفیظ کا ''شاہنامہ اسلام'' بہترین کارنامہ ہے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی شروعات ہوئی۔اس تحریک سے وابستہ شعراء، نے سیاسی و معاشرتی ناانصافیوں کیخلاف صدائے احتجاج بلند کی انگریزوں اور سرمایہ داروں کے خلاف لکھا۔ان میں علی سردار جعفری، فیض احمد فیضؔ، احمد ندیؔم قاسمی، ساحر لدھیانویؔ جذبؔی، حبیبؔ جالبی اور اسرار الحق مجاؔز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ترقی پسندوں کے مساوی ایک حلقہ ارباب ذوق کے نام سے

معرض وجود میں آیا جنہوں نے ترقی پسندوں کی کھل کر مخالفت کی انہوں نے اپنے نجی تجربات کو نظم میں قلمبند کیا۔ انہوں نے خیال کی نسبت فن کی طرف توجہ دی۔ اسی دوران ہیئتی تجربے بھی ہوئے جس سے نظم معریٰ اور آزاد نظم کو فروغ ملا۔

تقسیم ہند کے کچھ عرصہ تک ترقی پسندوں کے جذبات سرگرم رہے لیکن ۱۹۵۸ء تک آتے آتے نئے رجحانات جدیدیت کے نام سے معرض وجود میں آئے یہ دور اُردو ادب میں پچیس سال کے عرصے پر محیط رہا۔ اِس دور کے شعراء نے ذات سے کائنات تک کا سفر کیا۔ جدید دور کے انسان کے ذاتی تجربات اور علامات کو نظموں میں استعمال کیا گیا۔ ساتویں دہائی میں جدیدیت کا رجحان بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد اس میں مزید توسیع ہوئی جبکہ آٹھویں دہائی بعد جدیدیت کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ جو داخلیت و خارجیت اور ابہام کے ساتھ صراحت کا امتزاج ہے۔ احساسات اور خوابوں کی شکست وریخت کے ساتھ زندگی کے مثبت پہلوؤں کی ترجمان بھی ہے۔

مابعد جدیدیت کے نظریہ و افکار جدید دور کے انسان کے حالات و مسائل کی پیداوار ہیں۔ جن میں انتہا پسندی، بے روزگاری، اقدار کی بے مائیگی ہجرت و بے وطنی کے احساس و کرب کی نمائندگی کرتی ہے۔

اس باب کا دوسرا حصہ پروین شاکر کی نظمیہ شاعری سے متعلق ہے۔ پچھلی تین چار دہائیوں سے اردو نظم کے باب میں موضوعات کے اعتبار سے کچھ خواتین شاعرات نے تانیثی شاعری کے حوالے سے اپنی الگ شناخت قائم کی اُن میں بہت سے نام ہیں جن میں فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید لیکن ان سب میں پروین شاکر امتیازی شان رکھتی ہیں۔ اُن کا شعری سفر ''خوشبو'' سے شروع ہو کر کف آئینہ تک اختتام کو جا پہنچتا ہے۔ ''خوشبو سے کف آئینہ تک کا سفر'' رومانیت سے حقیقت پسندی

کی جانب مائل نظر آ تا ہے ۔ اگر چہ حسن وعشق جیسے موضوعات پانچوں مجموعوں میں شامل ہیں لیکن ''خوشبو'' میں محبت کے پہلے پہل کے جذبوں کی عکاسی کی گئی ہے جبکہ ''صد برگ'' خود کلامی اور انکار تک کا سفر پختگی کی منازل طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔

میں عشق کائنات میں زنجیر ہو سکوں
مجھ کو حصار ذات کے شر سے رہائی دے

نسوانی دنیا کے احساسات و جذبات کے ساتھ ان کو درپیش مسائل کا احاطہ بھی کرتی ہیں ۔ وہ اپنی باریک بین نگاہوں سے انسانیت کو درپیش مسائل کو بھی موضوع بناتی ہیں ۔ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی حقیقتیں انکی شاعری میں ایک منفرد انداز سے اظہار پاتی ہیں ۔ نہ صرف نسوانی جذبات کی ترجمانی پروین شاکر کے یہاں نظر آتی ہے بلکہ ایک حساس اور باشعور انسان کے جذبات واحساسات بھی اُن کی نظموں میں دکھائی دیتے ہیں ۔ اُن کا طرز اظہار عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہے اور روایات کی توسیع بھی انہوں نے روایت کے حسن میں کئی لحاظ سے اضافے کئے ہیں اور اسے کئی طرح کی جہتیں عطا کی ہیں ان کی نظموں کے موضوعات زیادہ متنوع رنگا رنگ اور وسیع ہیں ان کی نظموں میں تازگی ندرت اور حقیقت ہے ۔ ان کی شاعری میں ایک ارتقائی صورتحال جلوہ گر نظر آتی ہے ۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے ہی اُن کے خیالات میں تبدیلی آتی ہے ۔ لفظیات میں بھی اُسی اعتبار سے تبدیلی کے عمل سے گذرتے ہیں جس طرح کہ ''خوشبو'' کی شاعرہ کا نمایاں ترین وصف نسائی جذبات کا وفور اور بے ساختگی سے نسائی طرز اظہار ہے ۔ اُس میں دھنک ، بارش ، پھول ، گیت ، چڑیا ، سمندر ، مہندی ، چوڑیاں ، بندیا وغیرہ جیسے الفاظ زیادہ شامل ہوتے ہیں ۔ جبکہ '' صد برگ'' میں ایک ٹھہراؤ کا احساس ہوتا ہے اس میں عشق کی بے قراری نہیں بلکہ پختگی ہے ۔ آس پاس

پھیلی ہوئی اذیتوں کا احساس ہے۔اس لئے لفظیات میں بھی بھیڑیا، سانپ، بھنور، زہر جیسے الفاظ شامل ہوئے ہیں۔''انکار'' خودشناسی کی طرف سفر ہے۔آخری مجموعوں میں رخصت، تشنگی، زحمتِ سفر، دست اجل جیسے الفاظ اور علامتیں کافی استعمال ہوئی ہیں۔جوزندگی سے نا اُمیدی کوظاہر کرتی ہیں۔ اُن کی شاعری جمالیاتی لطافتوں کا مرقع ہے۔قدم قدم پر خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے۔ چاہے موضوع ہو یا اسلوب وخیال ہر اعتبار سے خوبصورتی دامن دل کوگرفت میں لیتی ہے۔ پروین شاکر اپنی نظموں میں پیکر اور تمثیل سے کام لینے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔الفاظ وتراکیب کے استعمال میں جمالیاتی حسن کا احساس کارفرما نظر آتا ہے۔

عکس خوشبو۔آتش جاں،عنکبوتی تارِ ہستی، ردائے عفت، دشت اسیر، دامن شب، پیراہن آبی، موج طرب، سپیدی خط، ساحل بری اچھوتی اور معنویت کی حامل تراکیب ہیں جن کے ذریعے رنگ وبو کے پیکر ابھرتے ہیں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ جوایک پروین شاکر کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی originality ہے جذبوں کا سچا اظہار ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔

نظم ''دھیان'' نمونے کے طور پر

ہرے لان میں
سرخ پھولوں کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی
میں تجھے سوچتی ہوں
مری انگلیاں
سبز پتوں کو چھوتی ہوئی
تیرے ہمراہ گزرے ہوئے موسموں کی مہک چن رہی ہیں

وہ دل کش مہک

جو مرے ہونٹ پہ آ کے ہلکی گلابی ہنسی بن گئی ہے۔

ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کا لب ولہجہ ہے جو خوبصورت مدھم، اور تازگی سے بھر پور ہے جو اپنا تاثر دیر تک قائم رکھتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں اپنے وطن اور اپنی مٹی کی بو باس رچی بسی ہوئی ملتی ہے۔ وطن کے شب و روز اور آتے جاتے موسموں کو ان کی شاعری میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کی شاعری میں وطن سے بے پایاں محبت کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک شاعرہ نے جب احتجاجی اور مزاحمتی نظمیں لکھیں تو اُس عہد کے فوجی حکمرانوں نے بغاوت کے الزام میں اُسے جلاوطن کردیا تو اُس نے ہمسایہ ملک میں پناہ لی اور وطن سے متعلق کچھ اس قسم کے جذبات کا اظہار کیا جو پروین شاکر کو بہت ناگوار گزرے۔ پروین شاکر نے ایک پوری نظم ''ایک شاعرہ کیلئے'' نامی عنوان سے قلمبند کی، پروین شاکر وطن سے محبت وعقیدت کے اظہار کیلئے وطن کو ''دھرتی ماں'' سے تشبیہ دیتی ہیں۔

مثالیں

تہمت لگائے ماں پہ جو دشمن سے داد لے

ایسے سخن فروش کو مر جانا چاہیئے

نظم ''ایک شاعرہ کیلئے'' کا آخری بند

تیرے گھر کے سارے دیوں کو کس نے جلائے رکھا تھا

تیرے اِک اِک شعر کو کس نے سرمہ چشم بنایا تھا

آج وطن پر وقت پڑا تو

تجھ کو اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا
ماں کی خدمت پھولوں اور تحفوں سے کب ہو سکتی ہے
اُسے تو تیرے لمس کی حدت ہے درکار

نسائی جذبوں کے ساتھ انسانی معاشرے کی تفہیم پروین کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے جس طرح کہ ہجرت'' جدید شاعری کا ایک بہت اہم موضوع رہا ہے پروین شاکر نے اپنی نظمیہ اور غزلیہ شاعری میں اسے برتا ہے۔ پچھلی کئی دہائیوں سے اقتصادی بدحالی کے شکار خاص طور سے ایشیائی مما لک کے لوگ، یورپی اور خلیجی مما لک میں روزگار کی تلاش میں ہجرت کر رہے ہیں یہ رجحان ہر نئے دن کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے اپنے وطن کو خیر باد کہنے کے پیچھے کیا عوامل ہیں اور وہ لوگ وطن کی یادوں کو سینے سے لگائے کس کرب سے گذرتے ہوں گے یا وطن میں اُن کے پیارے اُن کی جاں گسل یادوں کے سہارے کس طرح بھٹکے رہتے ہیں۔ پروین اس درد کو بہت شدت سے محسوس کرتی ہیں۔

سجے سجائے گھر کی تنہا چڑیا!
تیری تارہ سی آنکھوں کی ویرانی میں
پچھّم جا بسنے والے شہزادوں کی ماں کا دُکھ ہے
تجھ کو دیکھ کے اپنی ماں کو دیکھ رہی ہوں
سوچ رہی ہوں
ساری مائیں ایک مقدر کیوں لاتی ہیں
گودیں پھولوں والی!

آنگن پھر بھی خالی ہے[1]

اس نظم میں ایک ماں کے جذبات کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے جو اپنے پیاروں کی جدائی سے نڈھال ہے اگر چہ دنیا انٹرنیٹ کی وجہ سے گلوبل ولیج بن چکی ہے مگر آج سے بیس پچیس سال پہلے ایسی صورتحال نہیں تھی بلکہ اب بھی سب لوگوں کو یہ سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ اسی طرح کی ایک اور نظم ''جزیہ'' میں انہی احساسات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ شادی کے بعد ایک لڑکی کو اپنا میکہ اور بعض اوقات اپنا وطن چھوڑنا پڑتا ہے۔ اُس کے والدین اور قریبی عزیز زندگی بھر اُسے یاد کرتے ہوئے اپنے آنسوؤں کے نذرانے کی شکل میں ایک ایسا سودا تارتے رہتے ہیں جس کا اصل بھی ان پر قرض نہیں ہوتا۔ پروین شاکر ان احساسات کی ترجمانی اس طرح کرتی ہیں۔

گڑیا سی یہ لڑکی
جس کی اُجلی ہنسی سے
میرا آنگن دمک رہا ہے
کل جب سات سمندر پار چلی جائیگی
اور ساحلی شہر کے سرخ چھتوں والے گھر کے اندر
پورے چاند کی روشنی بن کر بکھرے گی
ہم سب اُس کو یاد کریں گے
اور اپنے اشکوں کے سچے موتیوں سے
ساری عمر ایک ایسا سودا تارتے جائیں گے

---

[1] خوشبو ص۲۹

جس کا اصل بھی ہم پر قرض نہیں تھا[1]

پروین شاکرؔ نے جدید اُردو شاعری کے لئے امکانات کے نئے در کھول دیے ہیں۔ انہوں نے اُردو شاعری کو عورت کا ایک نیا کردار دیا ہے جس کی ابتداء کشور ناہید نے کی تھی وہ کردار ورکنگ لیڈی کا ہے۔ اس طرح پروین شاکرؔ نے گھر سے باہر نکل کر کام کرنے والی عورت کے مسائل کو موضوع بنایا ہے اُن کی شاعری نسوانیت کی ترجمان ہے جو طوفانوں کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے کے ہنر سے واقف ہے۔ پروین شاکر کی شاعری ادب کے میدان میں نسائی جذبوں کے اظہار کی بندش کے ختم ہونے کے بعد بارش کی پہلی بوند کی حیثیت رکھتی ہے اگر چہ کئی اور شاعرات بھی ہیں جن کی سوچ و فکر کا دائرہ یہی تھا جیسے کہ فہمیدہ ریاض ہیں لیکن عوامی حلقوں میں ایسی مقبولیت صرف اور صرف پروین شاکر کے حصے میں آئی۔ کیونکہ جو مٹھاس اور موسیقیت پروین شاکر کی شاعری میں پائی جاتی ہے وہ دوسروں کے یہاں ناپید ہے۔

تیسرا باب پروین شاکر کی غزلیہ شاعری سے متعلق ہے

پروین شاکرؔ کی غزلیں لب و لہجے کی بے باکی کے اعتبار سے کافی مشہور ہیں۔ اردو کی روایتی شاعری میں ولیؔ دکنی سے یہ ہوتا آیا ہے کہ عاشق ہمیشہ مرد ہی رہا ہے اور عورت معشوق لیکن پروین کی یہ انفرادیت ہے کہ اس کے یہاں عورت عاشق بن گئی ہے اور مرد معشوق ہے۔ ایک عورت عاشقوں جیسے شعر کہہ رہی ہے غزل کے روایتی انداز کے برخلاف۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے۔ جو چیز اپنی دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اُن کی غیر معمولی جرأت اظہار ہے جس کی بدولت وہ نازک سے نازک نسائی جذبات و محسوسات کو فنکارانہ چابکدستی اور خوش سلیقگی سے بیان کرتی ہیں۔ اُردو شاعری

---

1. جزیہ ''صد برگ'' ص ۹۸

میں بے شک پروین شاکر ایک نئی آواز اور منفرد انداز کی مالک ہیں جس کی بناء پر اُردو غزل ایک نئی روایت اور ایک نئے اندازِ سخن سے آشنا ہوئی ہے اُن کی غزلیہ شاعری ہر قدم پر قاری کو نئے طرزِ احساس سے متعارف کراتی ہے۔ پروین شاکر نے اُردو شاعری کے محل کا ایک ایسا دریچہ وا کر دیا ہے جہاں عورت کے جذبات و احساسات کی ایک دنیا سجی ہوئی ملتی ہے۔ جہاں عورت اپنے دکھوں سکھوں، خوابوں، آرزوؤں، تمناؤں کے ساتھ جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ بچپن سے جوانی اور اس کے بعد از دواجی زندگی کے نشیب وفراز ہیں خوشیاں، غم، عشق ومحبت، ہجر وفراق کی کیفیات پروین شاکر کی غزلیہ شاعری کے حصار میں مقید ہیں۔ اُن کی شاعری فطرت کے موسموں اور رنگوں سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی شاعری میں پھول، خوشبو رنگ، ہوا، تتلی، بارش، رات اور جگنو، چاند جیسے استعارے استعمال ہوئے ہیں۔ خیالات کی رنگارنگی ملاحظہ کریں۔

؎ ابھی تیرے لبوں پر ذکر فصل گُل نہیں آیا
مگر اِک پھول کھلتے اپنے اندر دیکھ سکتی ہوں

؎ کنارا ڈھونڈنے کی چاہ تک مجھ میں نہیں ہوگی
میں اپنے اردگرد اک ایسا سمندر دیکھ سکتی ہوں

؎ سب ضدیں اُس کی پوری کروں۔ ہر بات سنو
ایک بچے کی طرح سے اُسے ہنستا دیکھوں

؎ کھلی آنکھوں سے سپنے قرض لے کر
تری تنہائیوں میں رنگ گھولوں

پروین شاکر کی غزلیہ شاعری میں تنہائی مایوسی کے جذبات بھی ہیں۔حسرت بھی ہے اور عہد و پیماں اور ہجر و وصال کی دھوپ چھاؤں بھی۔اُن کی غزلیں قلبی واردات واحساسات کا فطری اظہار ہیں۔حکمرانوں کی چیرہ دستیاں محبوب کی بے نیازیاں اور سامراجی طاقتوں کیخلاف احتجاج بھی پایا جاتا ہے۔جبر، ناانصافی، ظلم اور جمہوری اقدار کی پامالی کیخلاف آواز اٹھاتی ہیں۔لفظ''سردار''ان کی شاعری میں ظلم و جبر کیخلاف ردعمل کی علامت ہے۔اُن کی غزلیہ شاعری اُن کی مزاج ہی کی طرح سبک رو نرم و کومل ہے، اُن کا لہجہ شیریں اور اظہار کا پیرائیہ خوبصورت ہے۔مزاحمتی شاعری میں اُن کا پیرائیہ اظہار نازک ہے۔اُن کے یہاں جدید انسان کی نفسیات ملتی ہے۔

ریا، جھوٹ، منافقت جو آج کے جدید دور کے انسان کی فطرت کا حصہ بن چکی ہے۔پروین شاکر کے ہاں اس کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ے

ے ہر بار صداقت کی صلیبوں پر چڑھے ہیں
ہر عہد میں منصور کی آواز ہیں ہم لوگ

ے مجھے مطلوب ہے اہل وطن سے خوں بہا اپنا
بتاؤ منصفی کی عہد حاضر میں ادا کیا ہے

جو صبح سرمدو منصور تھے انہیں سرِ شام
حضور شاہ سراپا سپاس پاس بھی دیکھا

ے برہنہ شاخوں کا جنگل گڑا تھا آنکھوں میں
وہ رات تھی کہ کہیں چاند کا گزر ہی نہ تھا

؎ میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

؎ عمر کا بھروسہ کیا، پل کا سات ہو جائے
ایک بار اکیلے میں اُس سے بات ہو جائے

پروین شاکر کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ عورت ہوکر بھی معاشرے کے ایک فرد اور ایک انسان کی طرح سوچتی ہیں اور انسانیت کا درد اُن کی شاعری میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کے موضوعات زیادہ متنوع، توانا اور وسیع ہیں جو زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو کہ پروین شاکر کی شاعری کا موضوع نہ بنا ہو۔ وہ اپنی شاعری میں ذات کے حصار میں مقید بھی ہیں اور ذات سے ماورا بھی۔ عصری تقاضے اور سیاسی وسماجی تغیرات اُن کے گہرے مشاہدے کی بنا پر شعری پیکر میں ڈھلتے دکھائی دیتے ہیں۔

تھا جھوٹ امیر و تخت آرا
سچائی صلیب پر گڑی تھی

یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو کبھی آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا

قاتل کو کوئی قتل کے آداب بتائے
دستار کے ہوتے ہوئے سر کاٹ رہا ہے

؎ باہر سے نئی سفیدیاں ہیں
اندر سے مکان ڈھ رہے ہیں

۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان ایک نئے ملک کی صورت میں پاکستان سے الگ ہوا تو پروین شاکر نے اِس کا بہت اثر لیا۔ اُن کی شاعری میں اِس سانحے کا بہت ذکر ہوا ہے بلکہ پروین شاکر نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقابلے کے لئے بھی اسی موضوع کو چنا اگرچہ وہ لٹریچر کی طالبہ تھیں مگر انہیں بین الاقوامی سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ جس کی بناء پر سیاسی موضوعات یہاں تک کہ عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں اُن کی شاعری کا موضوع بنی ہیں۔ اس طرح اُن کی شاعری جدید حسیت اور جدید دور کے ذہنی رویوں کی عکاس کرتی ہے۔

سانحہ دونیم ہونے کا پرانا تو نہیں
اور دلوں میں ابھی تاریخ کا کچھ ڈر تو ہے

پروین شاکر کے موضوعات اسلوب اور زبان و بیان کے بارے میں خالدہ حسین کا کہنا ہے کہ:

''زبان و بیان میں امکانات کی تلاش اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ کبھی ہندی لب و لہجہ میں گوکل کی متھرا جا پہنچے، کبھی بسنتی چنری اوڑھ امیر خسرو کی چوکھٹ پکڑ لی ورنہ میرؔ و غالبؔ، فیضؔ و فرازؔ کی مجلسوں میں کنول آسن جمایا مگر جہاں بھی گئے اپنے ذہن سے سوچا، اپنی بات کی اسی کا نتیجہ ہے کہ اُردو شاعری میں نسائی حسیت ایک مستقل صورت اختیار کر رہی ہے اور اظہار و بیان دونوں اعتبار سے اگلا قدم ہے اور بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ جب دورِ حاضر کی شعری تاریخ مرتب ہونے لگے تو کانچ

کی گڑیا اپنی پوری دلآویزی اور خاراشگافی کے ساتھ اپنے مقام پر کھڑی ہو"۔ [1]

پروین شاکر کی غزلیہ شاعری ہر لحاظ سے ایک خاص معیار کی حامل ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی فطری وفنی خوبیوں اور زبان و بیان کی انفرادیت کو بناء پر کئی شاعرات نے پروین شاکر کا رنگ سخن اپنانے کی کوشش کی ہے لیکن نازک نسوانی احساسات کو پروین شاکر نے جس انوکھے انداز سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ کسی اور کے بس کا کام نہیں۔ اس کے باوجود پروین شاکر کو تانیثت کے دائرے میں محدود نہیں رکھا جاسکتا ہے کیونکہ اُن کے یہاں نہ صرف معاشرے کی سچی اور حقیقی تصویریں دکھائی دیتی ہیں بلکہ جدید دور کے انسان کی زندگی کے تمام مسائل اور المیے اور پوری انسانیت کا درد جھلکتا نظر آتا ہے۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ مرد اساس معاشرے کیخلاف عورت کے حق میں آواز بلند کرنا پروین شاکر کا طرۂ امتیاز ٹھہرا ہے جس کی وجہ سے اُن کی شاعری پہ تانیثت کا لیبل لگ چکا ہے۔ اگر اُن کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ جدید دور کے روشن خیال ذہن کی نمائندہ ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ آخری دور کے کلام میں موت کی آہٹیں اور دستکیں اُن کے ہاں صاف محسوس کی جاسکتی ہیں۔

❁❁❁

---

[1] "کانچ کی گڑیا"، خوشبو کی ہمسفر ص ۱۳۶ مراد پبلی کیشنز اسلام آباد

کتابیات

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر وسن اشاعت
۱۔	ادا جعفری	سازِ سخن	اردو بازار لاہور
۲۔	ارتضیٰ کریم	اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے	نرائن پرنٹرز شاہدرہ دہلی ۲۰۰۴
۳۔	پروینؔ شاکر	ماہ تمام	مراد پبلی کیشنز اسلام آباد ۱۹۹۴
۴۔	پروینؔ شاکر	کفِ آئینہ	مراد پبلی کیشنز اسلام آباد
۵۔	پروینؔ شاکر	گیتا نجلی البم	مراد پبلی کیشنز اسلام آباد
۶۔	پروینؔ شاکر	گوشۂ چشم	لفظ لوگ پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۰
۷۔	پروفیسر قمر رئیس	معاصر اردو غزل	اردو اکادمی دہلی
۸۔	پروفیسر گوپی چند نارنگ	سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۰
۹۔	ثروت خان	میراؔ شخصیت اور فن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۹
۱۰۔	جاوید وارثی	پروین شاکر کے خطوط نظیر صدیقی کے نام	نشاطِ ادب مشہور پریس کراچی ۱۹۹۶
۱۱۔	حامدی کاشمیری	جدید اردو نظم اور یورپی اثرات	ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی اشاعتِ دوم ۲۰۱۰
۱۲۔	حامدی کاشمیری	جدید شعری منظر نامہ	ادارہ ادب شالمیار سرینگر ۱۹۹۰
۱۳۔	رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو	دیب پبلی کیشنز سری نگر
۱۴۔	ڈاکٹر زور	سلطان محمد قلی قطب شاہ	
۱۵۔	ڈاکٹر عتیق اللہ	فیض کا شعری مرتبہ	

۱۶۔	ڈاکٹر عتیق اللہ	بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب	ماڈرن پبلشنگ ہاوس گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲۰۰۲
۱۷۔	ڈاکٹر عنوان چشتی	اردو شاعری میں ہیت کے تجربے	کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی جولائی ۱۹۷۵ء
۱۸۔	سلطانہ بخش	خوشبو کی ہمسفر	لفظ لوگ پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۶
۱۹۔	سلطانہ بخش	خوشبو پھول تحریر کرتی ہے	لفظ لوگ پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۶
۲۰۔	سبھاش ایماء	تحریر و تقریر	
۲۱۔	شمیم حنفی	انتخابِ فیض	
۲۲۔	شاہد ماہلی	فیض احمد فیض عکس اور جہتیں	چمن بکڈ پو دہلی
۲۳۔	عطاء الحق قاسمی	معاصر	زہد بشیر پرنٹرز ریٹگین روڑ لاہور
۲۴۔	فہمیدہ ریاض	بدن دریدہ	ملک نورانی مکتبہ دانیال کراچی
۲۵۔	فرمان فتح پوری	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی
۲۶۔	کامل قریشی	اردو غزل	اردو اکادمی نئی دہلی ۱۹۹۸
۲۷۔	قمر رئیس	ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر	ایجوکیشنل ہاوس دہلی ۱۹۷۲
۲۸۔	مسعود انور	فارسی ادب کے چند گوشے	
۲۹۔	محمد ذاکر	آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب	
۳۰۔	محمد عصیم	اردو ادب کی تاریخ	ایجوکیشنل ہاوس دہلی ۱۹۹۳
۳۱۔	منظر اعظمی	اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ	اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۴ء
۳۲۔	نجمہ رحمانی	آزادی کے بعد اردو شاعرات	بھارت آفسٹ پریس
۳۳۔	نجمہ رحمانی	جدید غزل کی علامتیں	ایم۔آر پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۰۰۵
۳۴۔	وہاب اشرفی	کاشف الحقائق	قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان دہلی

اخبار و رسائل

نمبر	رسائل	شائع کردہ وسنِ اشاعت
۱۔	آج کل	پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاوس نئی دہلی ستمبر ۱۹۹۴ء
۲۔	آج کل	پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاوس نئی دہلی ۱۹۸۵ء
۳۔	آج کل	پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاوس نئی دہلی ۱۹۹۵ء
۴۔	آج کل	پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاوس نئی دہلی مارچ ۲۰۱۰
۵۔	آواز	شمارہ سوم مدیر ملکہ جعفری بہار ۱۹۹۹ء
۶۔	بازیافت	شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۱
۷۔	بیادِ پروین شاکر	زیر اہتمام پروین شاکر ٹرسٹ جنوری ۲۰۰۰ء
۸۔	تعمیر	شعبہ مطبوعات محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ حکومت جموں وکشمیر
۹۔	جمناتٹ	جدید نظم نمبر سہ ماہی مجلّہ، ہریانہ اردا کادمی ہراینہ ۲۰۰۴ء
۱۰۔	خوشبو کے سفر کا اگلا پڑاؤ	پروین شاکر ٹرسٹ اسلام آباد فروری ۲۰۱۰
۱۱۔	ذہن جدید	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۱۹۹۴
۱۲۔	ذہن جدید نظم نمبر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۱۹۹۴
۱۳۔	روزنامہ جنگ	۲۸ دسمبر ۱۹۹۳ء
۱۴۔	سخن ستاروں کا کارواں	پروین شاکر ٹرسٹ ۲۰۰۷ء
۱۵۔	سوغات	جدید نظم نمبر
۱۶۔	شیرازہ	جموں کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سرینگر ۱۹۹۵ء
۱۷۔	فنون	احمد ندیم قاسمی، شمارہ ۱۲، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۹ء لاہور
۱۸۔	نخلستان	راجستھان، اردو اکادمی جے پور ۲۰۰۱ء
۱۹۔	نخلستان	علی سردار جعفری نمبر راجستھان اردو اکادمی جے پور ۲۰۰۰